خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں تانیثی تصورات: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

سکینہ صدیق

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۳ء

خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں تانیثی تصورات: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ نگار

سکینہ صدیق

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۳ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان : **خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں تانیثی تصورات: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**

پیش کار : سکینہ صدیق

رجسٹریشن نمبر : 767/P/U/F18

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اردو زبان و ادب)

ڈاکٹر رخشندہ مراد: ------------------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: --------------------

(ڈین فیکلٹی آف لینگویجز)

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی: --------------------

(ریکٹر)

تاریخ------------

اقرارنامہ

میں، سکینہ صدیق حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کی پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو) اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔

سکینہ صدیق

مقالہ نگار

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۳ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
Abstract	VIII
اظہار تشکر	IX
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
I۔ موضوع کا تعارف	۱
Ii۔ بیان مسئلہ	۲
Iii۔ مقاصد تحقیق	۲
Iv۔ تحقیقی سوالات	۳
V۔ نظری دائرہ کار	۳
Vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۴
vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۴
Viii۔ تحدید	۵
Ix۔ پس منظری مطالعہ	۵
X۔ تحقیق کی اہمیت	۸
ب۔ تصور عورت	۸
ج۔ نسوانیت	۹
د۔ نسائیت	۱۱
ر۔ تانیثیت	۲۷
ا۔ روشن خیال تانیثیت	۲۹

٢۔ انتہا پسندانہ تانیثیت ۳۰
٣۔ انارکسٹ تانیثیت ۳۰
۴۔ مارکسی تانیثیت ۳۱
۵۔ سوشلسٹ تانیثیت ۳۱
٦۔ سیام فام تانیثیت ۳۱
٧۔ لیسبین تانیثیت ۳۱
٨۔ تحلیل نفسی تانیثیت ۳۲
٩۔ جدید تانیثیت ۳۲
١٠۔ مابعد جدیدیت اور تانیثیت ۳۲
١١۔ ماحولیاتی تانیثیت ۳۳
١٢۔ نسوانیت، نسائیت اور تانیثیت میں فرق ۳۵
ز۔ تانیثیت کی اقسام ۳۵
ا۔ تانیثیت کا عالمی تناظر ۳٦
٢۔ تانیثیت کا مشرقی تناظر ۳۹
٣۔ تانیثیت کا ادبی تناظر ۵۰
حوالہ جات ٦۰
باب دوم: خواتین کی آپ بیتیوں میں تانیثی شعور: تشخص کی تلاش و اثبات کے تناظر ٦۳
الف۔ شعور ذات ٦٦
ا۔ عورت باحیثیت فرد ٦٦
٢۔ مردانہ سماج اور استحصالی رویے ۹٧
٣۔ عورت اور مزاحمتی رویے ۱۴۲
حوالہ جات ۱٦۵

باب سوم: خواتین کی آپ بیتیوں میں تانیثی شعور: عائلی حیثیات کے تناظر ۱۷۳

الف۔ روایتی عائلی تصورات ۱۷۳

۱۔ غیرت و عصمت ۱۷۳

۲۔ حیا ۱۸۳

۳۔ ماں، بیوی، بیٹی ۱۸۵

۴۔ والدین ۱۹۸

ب۔ جدید عائلی تصورات ۲۰۰

۱۔ بیوی، ماں، بیٹی بحیثیت دوست ۲۰۰

۲۔ والدین بحیثیت دوست ۲۰۷

۳۔ حیا کا معیار ۲۱۰

ج۔ نئی اخلاقیات ۲۱۱

حوالہ جات ۲۲۴

باب چہارم: خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں تانیثی شعور: سماجی کردار و امکانات کے تناظر میں ۲۲۷

الف۔ چادر اور چار دیواری کے روایتی تصورات ۲۲۷

ب۔ معاش کے جدید تصورات ۲۳۴

ج۔ جدید شہری منظر نامہ ۲۴۲

د۔ ملازمت کے حقوق و پیشگی کا جدید تصور ۲۳۵

حوالہ جات ۲۶۰

باب پنجم: ماحصل ۲۶۲

الف۔ مجموعی جائزہ ۲۶۲

ب۔ تحقیقی نتائج ۲۷۰

ج۔ سفارشات ۲۷۳

کتابیات ۲۷۵

ABSTRACT

Title: Feminist Concepts represented in women's Urdu auto biographies.

The patriarchal society emerged four thousand years ago. But it is estimated that under this system 50% of women are tortured. This violence has destroyed their personality. On the other hand without them life cannot be maintained and flourished. Early marriage,lack of health facilities and domestic disputes have suppressed them.They have been confined to the four walls.They are given a secondary status in the society.They are subjected to violence in the name of custom and religion.Modren and ancient family status is also to related family thought and life style.The women who got the opportunity to marry by their own choice were satisfied with their lifein a fulfilling way,but on whom the elders imposed the decision of their choice their life considering it as burden and not being able to enjoy it the compromised had hollowed her out.Shame,revelation and integrity rules are made by men so that women remain mentally enslaved to them.These rules forcewomen to live humiliating life.Why women's work and creation are not brought to the fore if their books are published in the market,why their father's ,brother's,or husband's name is written,the reason for these tradations will be known.When she goes out side the home for a job to meet her family needs, she faces great difficulties and obstacles including sexual harassment. one has to facethe exceptations of high work in low remuneration.The government also give rights to women as second class citizen.Due to increasein the educational trend of women in the society,there are difficulties in getting jobs.They need to support of family and state to achive development.Feminism rose voice against these gender issues.Lot of people inspire feminist thought all over the world.

Literature is also the reflection of society.Autobiographraphies is not the story of one person it is also reflect the future of any society.The most common purpose in brief autobiographies is to depict an important challenge or event in author,s life,their story helps readers understand the lives of others who come from different backgrounds.The authors are trying to display a message of change through the characters,words,and actions.Women have expressed their identities in their autobiographies.They have resisted against the conspiracies of the patriarchal society.In this research urdu

autobiographies written by women writer will be studied under three basic concepts of feminism.These concepts are selfconsiousness,family and social status.After resisting and evaluating those reasons a conscious indivual,s definition will be presented which will definitely increase the importance of urdu literature in this field.

The Historical and Analytical methodologies of research are applied to accomplish this research work. In order to cover the topic comprehensively and the books referring to the religious, cultural, social, historical and literal aspects of the topic have been consulted. The impact of the initiation and development of the feminist movement is also examined with reference to the autobiographies of the women, in which the concept of feminism is evaluated on the basis of their texts. Along with the critical analysis of the relevant books on the subject, the assistance is also taken from the articles obtained from the internet, library and other supporting sources.This research work is a reflection of the society in which modern problems of women are not only highlighted from their cultural aspects but also the attention is drawn towards their solutions.

اظہار تشکر

آپ بیتی ایک دل چسپ صنف ہے۔پرانی نسل کے تجربات آنے والوں کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں جس کو جاننے کا بہترین ذریعہ آپ بیتی ہے۔بڑے لیڈر اور راہ نما بھی اپنے ہمراہ عظیم شخصیات کی خودنوشت رکھتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا مطالعہ بھی کرتے تھے تاکہ ان کی زندگی کی کامیابی کے راز کو پا سکیں۔خود نوشت کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہو گیا تھا جس میں مرد اور خواتین آپ بیتی نگار شامل تھے۔کسی کو سمجھ نہ آنے والی عورت نے آپ بیتی کی شکل میں اپنی ذات کا راز فشاں کر دیا۔یہیں سے ہی ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ وہ کیا ہے ؟اور اسے کیسا بنا کر پیش کیا گیا ہے؟ ہمارا اسلامی معاشرہ ہو کر بھی آئے دن زنا بالجبر اور بچوں کے جنسی تشدد کا شکار کیوں ہیں؟ڈھول پیٹ کر مزاحمت کرنے والی مغربی تہذیب سے برآمد شدہ تانیثی تحریک کی ضرورت ہمیں کیوں پڑ گئی؟اس نا ختم ہونے والی اور گرما گرم بحث کا موضوع کسی حتمی منزل کا تعین کر پائے گا؟اردو ادب پر بیسویں صدی کی اس تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟عورت اپنی عائلی زندگی اور سماجی فرائض کی انجام دہی میں اپنا کیا کردار سر انجام دے رہی ہے۔اس دلچسپ موضوع نے عورت کی زندگی کی بہت سی پرتوں سے پردہ اٹھایا۔اس مقالے میں شامل آپ بیتیوں میں شہر بانو کی ”بیتی کہانی“، بیگم شائستہ اکرام اللہ کی ”پردے سے پارلیمنٹ تک“، قرۃ العین حیدر کی ”کارِجہاں دراز“، عصمت چغتائی کی ”کاغذی ہے پیرہن“ ،ادا جعفری کی ”جو رہی سو بے خبری رہی“، حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی ”ہم سفر“، صالحہ عابد حسین کی ”سلسلہ روز و شب“، ساجدہ زیدی کی ”نوائے زندگی“، سعیدہ بانو احمد کی ”ڈگر سے ہٹ کر“، صغرا مہدی کی ”حکایت ہستی“، کشور ناہید کی ”بری عورت کی کتھا“ اور ”بری عورت کی دوسری کتھا“ عذرا عباس کی ”میرا بچپن“، عطیہ داؤد کی ”آئینے کے سامنے“، نفیس بانو شمع کی ”جنت سے نکالی ہوئی حوا“، حمیدہ سالم کی ”شورش دوراں“، افضل توصیف کی ”دیکھی تیری دنیا“، ش، فرخ کی ”جینے کا جرم“، انیس ہارون کی ”کب مہکے گی فصل گل“ اور، زہرا داؤدی کی ”گرداب کی شناوری“ شامل ہے۔ اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلا باب تانیثیت کے تعارف اور بنیادی مباحث پر مشتمل ہے جس میں تانیثیت، نسائیت اور نسوانیت میں فرق بیان کیا گیا ہے۔دوسرا باب خواتین کی آپ بیتیوں میں عورت کے تشخص کے حوالے سے شعور ذات ،استحصالی اور مزاحمتی رویوں کے بارے میں ہے تیسرا باب عورت کی عائلی حیثیات میں قدیم اور جدید طرز زندگی کے مباحث پر مشتمل ہے چوتھا باب عورت کے سماجی کردار پر مبنی ہے جس میں جدید شہری منظر نامے کے

تحت معاش کے تصورات اور اس دوران پیش آنے والے مسائل کو آپ بیتی کے تناظر میں پرکھا گیا ہے پانچواں باب مجموعی جائزے پر مشتمل ہے۔

رب کائنات کا صد شکر ہے کہ میرا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ پایہء تکمیل تک پہنچا۔اس طویل اور صبر آزما کام میں میرے اساتذہ نے میری حوصلہ افزائی کی۔اس مقالے کا موضوع ڈاکٹر شفیق انجم نے دیا تھا جن کی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔انسانوں کی کارگزاریوں پر مشتمل یہ موضوع انتہائی دلچسپ تھا۔میری نگران ڈاکٹر رخشندہ مراد کے لہجے کی نرمی اور لمحہ بہ لمحہ ہدایات نے اس پرخار راستے کو میرے لیے ہموار بنایا۔اپنے شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر عنبرین شاکر اللہ جان ،ڈاکٹر فوزیہ اسلم ،ڈاکٹر عابد سیال ،ڈاکٹر روش ندیم ،ڈاکٹر اطہر قسیم اور دوسرے اساتذہ نے اپنے علم کے دروازے میرے لیے کھول دیئے۔میں ہری پور کے زاہد کاظمی صاحب کی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے بنیادی ماخذات کی رسائی کے لیے اپنی ذاتی لائبریری کے دروازے کھول دیئے اور کچھ کتب بذریعہ ڈاک بھی ارسال کیں۔اس کے علاوہ تحقیقی مواد کی فراہمی میں فیاض احمد ساجد نے پنجاب یونی ورسٹی کی مین لائبریری (لاہور) سے اور خالد فیاض صاحب نے ذاتی کتب خانے سے کتابوں کی عکسی نقول ارسال کیں، آج کے اس مصروف ترین دور میں کسی کے لیے تگ ودو کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔اس مقالے کی تکمیل میں میرے والدین کی دعائیں،گھر والوں کی شفقت،ماں جیسی شفیق آنٹی سکینہ خلیل ،میرا بھائی میرا دوست (احمد رمضان)،دوستوں اور اساتذہ کرم کی رہنمائی میرے لیے ڈھال بن گئی۔

اس سارے عمل میں میری پیاری دوست ڈاکٹر شازیہ کیانی ،ڈاکٹر میمونہ ریاض ،ڈاکٹر تحسین بی بی ،ڈاکٹر کوثر پروین اور رفعت ساجد کی معاونت حاصل رہی۔عمر سیال،احمد مرزا،رحمن سرور باجوہ،عارف حسین اور ہم جماعت دوستوں کا تعاون بھی میسر رہا۔میرے ۵۰۲ کے پرنسپل سر نعمت علی اور (فیملی فرینڈ) سٹاف ممبر نے میری حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ چھٹی کے معاملے میں معاونت بھی کرتے رہے۔

سکینہ صدیق

اسکالر پی ایچ۔ڈی (اُردو)

باب اوّل:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع تحقیق کا تعارف:

خواتین ہمارے معاشرے کا اہم کردار ہیں، جو مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو نئی نسلوں میں منتقل کرنے کی امین ہیں۔ عورت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہر روپ میں بہت مقدس اور قدرت کا قیمتی تحفہ ہے۔اس کے بغیر کائنات کی ہر شے پھیکی اور ماند پڑ جاتی ہے۔اسلام نے مرد و عورت کو مساوی حقوق دیے مگر اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے معاشرتی ناہمواریوں نے جنم لیا۔عورت کو ناقص العقل کا درجہ دے کر زر خرید غلاموں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا یوں گھر کو جنت بنانے والی عورت تشدد اور عدم تحفظ کا شکار ہوئی۔اور تو اور اپنے حقوق سے آگہی اور مطالبے پر کبھی اسے تیزاب ڈال کر جلا دیا گیا تو کبھی خودکشی کا نام دے کر قتل کر دیا گیا۔ایسے حالات میں عورت باغیانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی۔جب کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر دور میں عورت نے مرد کے شانہ بشانہ کام کیا وہ کسی بھی میدان میں مرد سے پیچھے نہ رہیں۔عورت کی محنت پر کچھ مرد کاہل اور آرام پرست ہوگئے۔انہوں نے اپنی کمزوریاں چھپانے کے لیے عورتوں پر جبر اور تشدد کرنا شروع کر دیا۔ایسی صورت میں نہ صرف ماں بلکہ بچے بھی ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے اندر تربیت کی کمی عمر کے کسی حصے میں بھی پوری نہیں ہو پاتی۔ادیب، شاعر اپنے معاشرے کا عمیق مشاہدہ کرتا ہے اور اسی مشاہدات کی بناء پر اپنی تحریروں کی تخلیق کے لیے اپنی پسند کے پیمانے مقرر کرتا ہے۔انھی پیمانوں میں شعری، افسانوی اور غیر افسانوی نثر شامل ہے۔ان تخلیقی تصانیف میں مصنف اخلاقی، اصلاحی، مزاحمتی اور باغیانہ روپ اپناتا ہے، اور اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرتی جبر اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں بہت سی منفی اور مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں جن میں اردو ادب پر مغربی تحریکوں کے اثرات بھی رونما ہوئے ان ہی تحریکوں میں نسائیت کی تحریک بھی شامل ہے۔جس کے اثرات اردو ادب پر بھی رونما ہوئے۔جن میں ناول، ڈرامہ، افسانہ، خاکے، آپ بیتی، خطوط وغیرہ شامل ہیں۔آپ بیتی میں مصنف اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات بیان کرتا ہے اسی لیے آپ بیتی کو جگ بیتی بھی کہا جاتا ہے۔آپ بیتی نگاروں میں مرد و خواتین دونوں شامل ہیں۔خواتین آپ بیتی نگاروں میں قرۃ

العین حیدر، عصمت چغتائی، ادا جعفری، حمیدہ اختر حسین رائے پوری، نثار عزیز بٹ اور کشور ناہید شامل ہیں۔اس تحقیقی مقالے میں خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں نسوانی، نسائی اور تانیثی تحریک کا مطالعہ، شعور ذات، خود آگہی، اور عائلی حیثیات اور سماجی کردار کے تحت کیا جائے گا۔

ii۔بیان مسئلہ:

پاکستان میں تانیثی شعور کی تحریک ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے۔اس تحریک کا بنیادی مقصد عورتوں کے حقوق کی بازیافت ہے۔آج کی عورت اپنی تعلیم ،ملازمت ،وراثت اور شناخت کی جنگ لڑ رہی ہے۔مصنف کا خمیر بھی اسی مٹی سے بنا ہے۔وہ اپنی دوسری تصانیف کی طرح آپ بیتوں میں بھی نہ صرف خود کو بلکہ اپنے معاشرے کے حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے۔اس کی تصانیف میں صنف نازک اور اس کے مسائل کو صدیوں سے موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ان تخلیق کاروں نے اپنی تصانیف میں عورتوں کا استحصال کرنے والوں کو للکارنے کے ساتھ ساتھ ان کے حقوق اور فلاح و بہبود کے لیے بھی کوششیں کیں۔خواتین ادیبوں میں عورتوں کے مسائل کی آگہی اور شعور دوسروں کی نسبت جلد بیدار ہوا اس وجہ ان کا خود اس تعفن شدہ معاشرے کا حصہ ہونا اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے دوران پیش آنے والی مشکلات ہیں جو سب عورتوں کے ساتھ تقریباً ایک جیسی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عورت ہی عورت کے دکھ درد اور مسائل کو زیادہ بہتر انداز سے سمجھ سکتی ہے۔

iii۔مقاصد تحقیق:

۱۔ نسوانی شعور، نسائی شعور اور تانیثی شعور میں فرق کا جائزہ لینا۔

۲۔ خواتین کی اردو آپ بیتیوں پر تانیثیت کی عالمگیر تحریک کے اثرات کا جائزہ لینا۔

۳۔ خواتین کی اردو آپ بیتیوں پر روایتی اور جدید سماجی تناظر میں تانیثی شعور کی مختلف صورتوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنا۔

iv۔تحقیقی سوالات:

۱۔ نسوانی شعور، نسائی شعور اور تانیثی شعور کی ادب میں معنویت اور تفہیم کی متعدد صورتیں کیا ہیں؟

۲۔ خواتین کی اردو آپ بیتیوں پر اثر انداز ہونے والے مقامی اور عالمی تانیثی تحریک کے حوالے سے خود آگہی، عائلی حیثیات اور سماجی کردار کے تناظرات کیا ہیں؟

۳۔ خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں تانیثی تحریک کے اختصاصی زاویوں کی نوعیت اور انداز کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

زیر نظر تحقیقی مقالے میں خواتین کی آپ بیتیوں میں تانیثیت کے نمائندہ تصورات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا جائے گا۔ مجوزہ تحقیق کی نوعیت کیفیتی ہو گی۔ اس تحقیقی کام کو تانیثیت کے عالمی تناظرات کے ساتھ ساتھ تانیثیت کے مشرقی اور ادبی تناظرات کی روشنی میں ترتیب دیئے گئے لائحہ عمل کے تحت مکمل کیا گیا۔ اس حوالے سے مغربی مفکرین سیمون دی بووا(Simone de Beauvoir) کیٹ میلٹ (Kate Millett) نینسی کاٹ(Nancy Cott) بیٹی فرائڈن(Betty Friedan)اور ورجینا وولف(Virginia Woolf)وغیرہ کے تانیثی نظریات کا عمیق مطالعہ کیا گیا جبکہ اردو ادب میں خواتین کے حقوق کا شعور رکھنے والی مصنفین مثلاً فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، فاطمہ حسن، حنا جیلانی، عاصمہ جہانگیر وغیرہ کے تانیثی نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیقی فریم ورک ترتیب دیا گیا جس میں تانیثیت کے نمائندہ تصورات کو پیشِ نظر رکھا گیا جو کہ درج ذیل تھے۔

i۔ شعورِ ذات / تشخص کی تلاش و اثبات

ii۔ عائلی حیثیات

iii۔ سماجی کردار و امکانات

ا۔ "شعورِ ذات تشخص کی تلاش و اثبات"، تانیثی تحریک کی نمائندہ فکر اور رویہ ہے۔ مجوزہ تحقیق میں خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں شعورِ ذات اور خود آگہی کے عناصر تلاش کیے گے کہ سماج کو اُن کے وجود کا احساس ہے یا نہیں۔

۲۔ "عائلی حیثیات" کے تناظر میں خواتین کی آپ بیتیوں میں عورت بحیثیت بیوی، ماں، بیٹی، دوست، والدین اور حیا کے معیارات و تعبیرات کی پیش کش کا جائزہ لیا گیا۔

۳۔ "سماجی کردار و امکانات" کے تناظر میں خواتین کی آپ بیتیوں میں عورت کے سماجی وجود، خود مختاری، مذہبی جنون اور استحصالی رویوں کی پیش کش کا تنقیدی جائزہ لیا گیا اور عصرِ حاضر کے تناظر میں بدلتے منظر نامے کا مطالعہ کیا گیا۔

اس تحقیقی مقالے میں مندرجہ ذیل تحقیقی اور تنقیدی کتب کا مطالعہ کیا گیا:

ا۔ فاطمہ حسن، فمینزم اور ہم	۲۔ فریڈرک اینگلز، خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست
۳۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں	۴۔ قاضی عابد (مرتبہ)، اردو ادب اور تانیثیت
۵۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت	۶۔ یاسر جواد مترجم، عورت از سائمن دی بووا
۷۔ طاہرہ ایس خان، عزت کے نام پر	۸۔ ارسطو، مثالی ریاست

۹۔ آمنہ تحسین، سماج اور صنفی تصورات (ادب کے آئینے)	۔یاسر جواد مترجم، پردے کے پیچھے از جبر الدین بروکس
۱۱۔ ارجمند آرا، تانیثی مطالعات	

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

اس تحقیقی مقالے کے لیے تاریخی اور دستاویزی طریقہ تحقیق زیادہ مددگار رہے گا تاہم ضرورت کے پیش نظر کسی بھی تحقیقی طریقے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں تانیثی تحریک کے آغاز وار تقا اور اثرات کا جائزہ ادبی خواتین کی آپ بیتیوں کے حوالے سے لیا جائے گا جس میں تانیثی تصورات کو ان کے متون کی بنیاد پر پرکھا جائے گا۔ موضوع کے متعلق معاصر تنقیدی اور تحقیقی کتب کے ساتھ ساتھ مضامین سے بھی مدد لی جائے گی۔ جو کہ انٹرنیٹ، لائبریری اور دیگر معاون ذرائع سے حاصل کیے گئے ہیں۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

خواتین کی اردو آپ بیتیوں: نمائندہ تانیثی تصورات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کے عنوان پر کوئی تحقیقی مقالہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا البتہ دوسرے موضوعات پر چند مقالات لکھے جاچکے ہیں جو اس مقالے کی تحقیق کے دوران مددگار ثابت ہوئے۔

۱۔ ڈاکٹر اطہر قسیم کا مقالہ اردو آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی جائزہ، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے ۲۰۰۷ء میں لکھا گیا اس مقالے کا چوتھا باب خواتین کی آپ بیتیوں کے مجموعی جائزے پر مشتمل ہے جو ان آپ بیتیوں کے موضوعات اور نوعیت کا پتہ لگانے میں مددگار رہے۔

۲۔ ممتاز پروین کا مقالہ اردو ادب کی خواتین آپ بیتی نگار، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور سے ۲۰۰۷ء میں ایم۔ فل کی سند کے حصول کے لیے لکھا گیا۔ یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جس میں پہلا باب آپ بیتی کے مفہوم آغاز اور ارتقاء پر باقی کے ہر باب میں ایک آپ بیتی کا جائزہ لیا گیا ہے ان آپ بیتیوں میں بیتی کہانی، کاغذی ہے پیرہن، گئے دنوں کا سراغ لے کر، بری عورت کی کتھا، جو رہی سو بے خبری رہی، بچھڑے لمحے، اور ہم سفر ہیں۔ ان آپ بیتیوں کے موضوعات کے لحاظ سے آپ بیتی نگار نے جائزہ لیا ہے۔

۳۔ حافظہ شہلا اقبال کا مقالہ اردو میں خواتین کی ادبی خودنوشتیں ۲۰۱۷ء میں بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی ملتان کی طرف سے پی ایچ ڈی کی سطح کا لکھا گیا۔ اس مقالے کے پانچ ابواب ہیں جن میں پہلا باب خواتین کو درپیش مسائل پر مشتمل ہے مختلف تہذیبوں میں خواتین کی حالت کو بیان کیا گیا جس میں زیادہ تر موہنجوڈارو اور اسلام کے تناظر میں بحث کی

گئی ہے۔ دوسرے باب میں خواتین خود نوشت ۱۹۴۷ء تا۱۹۹۹ء تک کی خواتین کی آٹھ خود نوشت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جن میں سوانحی ناول "کارجہاں دراز"، یادداشت "میرا بچپن "اور روزنامچہ " نوٹ بک"، سفر نامہ " زمانہ تحصیل"ہیں اسی باب میں پاکستانی اور ہندوستانی ادباء کی خود نوشت کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں کچھ سوالات کے تحت آپ بیتی کے معیار کو جانچ گیا ہے۔ ا۔ خاتون آپ بیتی نگار کا خاندانی پس منظر کیا؟ ۲۔ خاتون آپ بیتی نگار نے صرف اپنے کردار کو پیش نظر رکھا ہے یا دیگر کرداروں کو بھی اہمیت دی ہے ؟ خاتون آپ بیتی نگار نے سچ کے عنصر کو کس حد تک پیش نظر رکھا اور اس کی کیا قیمت ادا کی۔ کس قدر مبالغے سے کام لیا اور کس بات کو بیان کیا کس واقعے کو سرسری اہمیت دے کر آگے بڑھ گئی۔ آپ بیتی تحریر کرنے کا مقصد کیا تھا اور آپ بیتی کو لکھتے ہوئے کیا تکنیک اختیار کی گئی۔ تیسرے باب چودہ خود نوشت پر مشتمل ہے جن میں اختری بیگم، نثار عزیز بٹ، ثاقبہ رحیم الدین ،شوکت کیفی، نور سجاد ظہیر، عطیہ داؤد، عمرانہ مقصود، بانو قدسیہ، فرخندہ بخاری، شین فرخ، رضیہ بٹ، حمیرا خلیق، انیس ہارون اور محمودہ بشیر کی تصانیف شامل ہیں۔ پانچواں باب خواتین اور مرد آپ بیتی نگاروں میں فرق پر مشتمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب مردوں کی کوئی خود نوشت شامل نہیں کی گئی تو فرق کیسے کیا گیا۔

۴۔ شبانہ سلیم کا مقالہ "اردو میں خواتین کی خود نوشت سوانح عمریاں (تجزیاتی مطالعہ) کے نام ہے اس میں پانچ ابواب ہیں۔ پہلے باب میں آپ بیتی تعارف و تفہیم کے بعد خود نوشت اور سوانح عمریوں کے موضوع پر بحث کی ہے۔ دوسرے باب میں ۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء تک کی خواتین آپ بیتی نگاروں کا تذکرہ ہے جن میں سلطان جہاں بیگم کی "تزک سلطانی" وزیر سلطان کی "نیرنگی بخت" اور کملا کمہاری کی "ایک ایکٹریس کی آپ بیتی شامل ہیں۔ تیسرا باب ۱۹۴۷ء کے بعد کی خواتین آپ بیتی نگاروں پر مشتمل ہے جن میں انیس قدوائی آزادی کی چھاؤں، صالحہ عابد حسین کی سلسلہ روزوشب، ادا جعفری کی جو رہی سو بے خبری رہی، سعیدہ بانو احمد کی ڈگر سے ہٹ کر، نفیس بانو شمع کی جنت سے نکالی ہوئی حوا، حمیدہ سالم کی شورش دوراں، شائستہ اکرام اللہ کی پردے سے پارلیمنٹ تک، حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی ہم سفر، نایاب، وہ کون اور کشور ناہید کی بری عورت کی کتھا، امرتا پریتم کی رسیدی ٹکٹ، عابدہ سلطان کی انقلابی شہزادی کا فکری جائزہ لیا گیا ہے چوتھا باب ان خواتین آپ بیتی نگاروں کے اسلوب اور مقام پر بحث کرتا ہے۔ آخری باب نتائج پر مشتمل ہے جس میں شبانہ سلیم یہ بات واضح کرتی ہیں کہ آزادی سے پہلے عورتوں پر اظہار رائے کی پابندیاں تھیں کیوں کہ معاشرہ اکبر اور اقبال کے نظریات پر عمل پیرا تھا آزادی کے بعد ان کو حقیقی شعور ذات نصیب ہوا۔

۵۔ قرۃ العین کا مقالہ "خواتین کی آپ بیتیوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" علی گڑھ یونی ورسٹی انڈیا سے لکھا گیا۔ ان کے پہلے باب میں خودنوشت کے فن کے موضوع کو زیر بحث بنایا گیا ہے جس میں خودنوشت کی تعریف، ارتقااور دائرہ کار پر بحث کی گئی ہے دوسرا باب خواتین کی نسائی حسیت اور تانیثی تحریک کے موضوع پر سیر حاصل بحث پر مشتمل ہے تیسرے باب میں خواتین کی آپ بیتیوں کے نمایاں اور مابہ امتیازی عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے چوتھے باب میں خواتین اور مرد آپ بیتی نگاروں کا موازنہ کیا گیا ہے جن میں خواتین کی آپ بیتیوں میں کاغذی ہے پیر ہن، جو رہی سو بے خبری رہی، جنت سے نکالی ہوئی حوا اور آزادی کی چھاؤں ہیں جب کہ مرد آپ بیتی نگاروں میں کالا پانی، گرد راہ، یادوں کی بارات، اور اس آباد خرابے میں ہے، پانچواں باب خواتین کی یادداشتوں، روز ناموں اور سفر ناموں میں سوانحی عناصر پر مشتمل ہے۔

۶۔ ڈاکٹر شاداب سید کا مقالہ اردو میں خواتین کی خودنوشت اور سماجی سروکار کے نام سے ہے اس مقالے میں ابواب بندی نہیں کی گئی بلکہ جزیات کی مدد سے پہلے خواتین کی خودنوشتیں دوسرا جز میں یادداشتیں تیسرے جز میں سفر نامے اور پانچواں جز میں رپوتاژ شامل کی گئی ہیں۔ زیادہ بنیادی ماخذات کی وجہ سے محقق حتمی نتائج بھی شامل نہیں کر پایا۔

viii۔ تحدید:

خواتین تخلیق کاروں نے ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی ہے جس میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر شامل ہے۔ تاہم اس تحقیقی مقالے کو ادبی، صحافی اور تانیثی تحریک سے تعلق رکھنے والی خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں نسوانی، نسائی اور تانیثی شعور کے حوالے سے ہی پرکھا جائے گا۔ ان آپ بیتیوں میں خواتین کی ترقی میں آڑے آنے والے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی عناصر کا مطالعہ نمائندہ تانیثی تصورات کے تحت کیا گیا۔ خواتین آپ بیتی نگاروں کی دیگر نثری اور غیر نثری تصانیف اس مقالے کی تحقیق میں شامل نہیں کی گی۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

بیسویں صدی میں تانیثی تحریک ایک اہم سماجی تحریک ہے اس تحریک کا آغاز حقوق نسواں کی تحریک کے تحت اٹھنے والے مطالبات سے ہوا۔ فیمینزم کی اصطلاح بعد میں سامنے آئی۔ تاہم تانیثی نظریات اس سے پہلے بھی موجود تھے۔ تانیثی ادبی مطالبات عورت کی ادب میں غیر متعصبانہ انسانی پیش کش کو بنیاد بناتے ہیں۔ عورت کے روایتی اچھی اور بری میں مقید تصورات کی نفی کا تقاضا کرتے ہیں۔ تانیثیت کے حوالے سے متعدد ادیبوں کی تحاریر مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتی رہی ہیں:

ورجیناوولف کی کتاب A Room for one's own مطبوعہ ۱۹۲۹ء اور سیمون دی بووا کی کتاب The Second Sex مطبوعہ ۱۹۴۹ء نے عورتوں میں شعور کی بیداری اور مردانہ غلبے سے نجات کا احساس پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد کیٹ میلٹ کی کتاب Sexual Politics مطبوعہ ۱۹۴۹ء اور ایلن شووالٹر کی کتاب A Literature of their Own تانیثیت کی تفہیم اور اس کے فروغ میں اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ پاکستان میں بھی عورت کی کردار نگاری کے ساتھ ساتھ تانیثی نظریے کی تفہیم اور اس کی وضاحت کا فرض ادا کرنے میں خواتین پیش پیش ہیں۔ وعدہ کتاب گھر نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں جن کا مقصد تانیثی نظریے کی وضاحت اور تفہیم ہے۔ شرکت گاہ نے خواتین کے بارے میں تحقیقی کام کیے اور ببلیو گرافی مرتب کی۔ پاکستان میں خواتین میں ان کے حقوق کا شعور پیدا کرنے میں فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، فاطمہ حسن، حنا جیلانی، عاصمہ جہانگیر، شائستہ سعید، صبیحہ حفیظ اور صغرا مہدی کے نام اہم ہیں۔ اس مطالعے میں ان کاوشوں کو مدنظر رکھا گیا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

خواتین آپ بیتی نگاروں نے آپ بیتیاں لکھ کر اپنے اندر کے قفس کو توڑا ہے جس میں وہ صدیوں سے مقید تھیں یہ آپ بیتیاں صرف سماجی وجود اور خود مختاری کو ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ سماجی، مذہبی، اور تانیثی استحصال کا نوحہ بھی ہیں۔ عورت کی آپ بیتی ایک کی ہی نہیں بلکہ تمام عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ معاشرتی خوف صرف ان پڑھ خواتین میں ہی نہیں بلکہ پڑھی لکھی خواتین میں بھی نمودار ہوتا ہے اس خوف سے چھٹکارا پانے کے لیے خواتین نے طویل سفر کیا ہے اس سفر میں جابجا تانیثی شعور کے ارتقاء کے حوالے ملتے ہیں۔

ب۔ تصور عورت:

کسی بھی سماج کی تشکیل فریقین کے اجتماعی عمل کے تحت ہی ممکن ہے اور یہ فریقین مرد اور عورت ہی ہیں۔ انسانی تمدن کے مختلف ادوار میں ان کے فرائض، باہمی عمل اور تناسب میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں جو انسانی ارتقاء کا حصہ تھیں۔ ان کی اہمیت سے کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ خالق کائنات کی معتبر تخلیق انسان ہے جس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا اس اعزاز میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ دونوں اس کائنات کی تسخیر و تعمیر میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ انسانی نسل کا وجود برقرار رہنا بھی ان دونوں کرداروں کے بغیر نامکمل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ رب کائنات نے دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا بنایا تاکہ یہ مددگار ثابت ہوں اور

معاشرے کی ترقی میں اہم اور مثبت کردار ادا کریں خاندانی نظام کی تشکیل انھی کی مرہون منت ہے اور خاندان کسی بھی معاشرے کی اکائی ہے۔ خاندانی نظام میں بگاڑ معاشرتی نظام کو تباہ برباد کرتا ہے۔ مرد وزن دونوں معاشرے کی فلاح وبہبود میں برابر کے حصے دار ہیں۔ عورت نے انسان کے تہذیبی اور تمدنی عہد کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا، اگرچہ اس کو گھر کی خادمہ کا درجہ ہی کیوں نہ دیا گیا اس نے کپڑے بنائے، جھونپڑیاں تیار کیں چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی رہی اور کاشت کاری بھی کرتی رہی۔ صد افسوس انسانی تاریخ کا پہلا قتل (ہابیل نے اپنے بھائی قابیل)ہی عورت کی وجہ سے ہوا۔ دوسری طرف آدم اور حوا کو دونوں جنت میں رکھا گیا اور قبیح گناہ سرزدہ ہونے کی بناء پر دونوں کو قصور وار قرار دیتے ہوئے زمین پر بھیج دیا گیا۔ کچھ تعصب پسند اقوام نے ان دونوں کے درمیان جنسی اور صنفی فرق کے تحت ایک کو برتر اور دوسرے کو حقیر قرار دیا اور تمام فسادات کی جڑ عورت کو قرار دیا۔ شمس الرحمن فاروقی کے مطابق جنس کا تصور صنف کے تصور سے مختلف ہے اور صنفی اختلافات کی بناء پر کسی کو کم تر یا بہتر قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی عورت کو صنف نازک کا لبادہ اوڑھا کر کم عقل یا کمزور کہنا کوئی دانش مندی ہے۔ عورت کا جسمانی اور معاشرتی ڈھانچہ کیا ہے؟ اس کو کیوں کم تر سمجھا گیا؟ آیا وہ واقعی کم تر اور نقص العقل ہے یا بنا دیگئی ہے؟ عورت کی نسوانی، نسائی اور تانیثی جہات کونسی ہیں؟ مشرقی اور اسلامی معاشروں میں تحریک نسواں اور تانیثیت کی ضرورت ہے تو کیوں؟ یہی سوال تحقیق طلب ہیں۔

ج۔ نسوانیت:

نسوانیت کا تعلق عورت کی جسمانی ساخت سے ہے۔ جس کو عورت پن / زنانہ پن بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا تعلق جنس یعنی سیکس سے ہے اس لیے مرد و عورت کی جسمانی ساخت کے ساتھ ساتھ کروموسومز بھی مختلف ہیں جن سے ڈی۔ این۔ اے کی پہچان ہوتی ہے ان دونوں کے ڈھانچے کو تخلیقی نقطہ نظر سے خالق کائنات نے تشکیل دیا۔ ان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیتے ہوئے دونوں کو برابر قرار دیا البتہ ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کی تقسیم مختلف کر دی۔ جس کی تصدیق قرآن نے سورہ نساء میں کی: "اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا، اور اس جان دار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔"(۱)

سیمون دی بووا نے بھی اپنے مقالے "دی سیکنڈ سیکس" میں اس بات کو سچ ثابت کیا۔: "نر اور مادہ ایک ہی نوع کے دو افراد کی صورت ہیں جنہیں وظیفہ تولید نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔"(۲)

مرد اور عورت دونوں نسوانی خصوصیات کے حامل ہوسکتے ہیں۔"

نسوانیت کا لفظ لاطینی زبان کے لفظFemellaسے ماخوذ ہے۔یہFeminaکا کم تر درجہ ہے۔اس کا مطلب عورت ہے۔ان کا تعلق مرد سے نہیں بلکہ ۱۴ویں صدی میں اس کے ہجے انگریزی زبان کے لفظMaleکے مطابق کیے گئے۔"[۳]

عورت کو ہمیشہ جنسی شہوت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا۔اس کی ذات کا مقصد جنسی تعلقات بننے اور بچے پیدا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔سیمون دی بووا نے عورت کے بارے میں لوگوں کے نظریات کی کھوج لگاتے ہوئے کہتی ہیں کہ کچھ لوگوں کے مطابق عورت صرف ایک بچہ دانی ہے۔اس لیے سیمون دی بووا نے اپنے مقالے کے پہلے باب حیاتیات میں جنسی عمل کی تفصیل اوراس کی پیچیدگیاں بیان کی ہیں۔اس کے مطابق ایک مادہ کو ماں بننے کے عمل کے دوران جن تکلیف دہ اعمال سے گزرنا پڑتا ہے مرد اس تجربے سے نہیں گزر سکتا۔ان مراحل میں:

۱۔ حیض

۲۔ حمل

۳۔ بیض ریزی

انھی وجوہات کی وجہ سے مختلف انواع میں مادہ،مونث ایک قربانی کا بکرا ہے جس کی ساری زندگی جنسی چکر میں گزرتی ہے۔شباب سے لے کر حیض کی بندش تک عورت اپنے اندر ہونے والے جنسی کھیل میں ایک تماشا بنی رہتی ہے ذاتی طور پر اس تماشے سے کوئی تعلق نہیں۔حمل کے دوران وہ کئی کئی دن بھوکی رہتی ہے،اس کا جی متلاتا ہے لہذا یہ ایک نڈھال کر دینے والا عمل ہے۔اس سے ملتے جلتے تجربات کا اظہار پروفیسر ٹورل موئی نے اپنی تھیوری میں کیا ہے ان کے خیال میں حمل کی تکالیف کا تجربہ ہر عورت کا مختلف ہے ورنہ خواتین کو حیض اور حمل کی تکلیف کا اندازہ ہو جاتا تو انہوں نے زمین کا چہرہ بدل دینا تھا۔

> "Unfortunately, the experience of child birth or period pain is neither common to all women nor particularly apt to inspire a deep desire for political liberation:if it did,women would long since have change the face of the earth."[۴]

> "بدقسمتی سے بچے کی پیدائش اور ماہواری کا تجربہ نہ تو تمام خواتین کے لیے ایک جیسا ہے اور نہ ہی سیاسی آزادی کی گہری خواہش کو متاثر کرنے کے لیے موزوں ہے:اگر ایسا ہوتا تو خواتین طویل عرصے سے زمین کا چہرہ بدل چکی ہوتیں۔"

حالیہ رپورٹ کے مطابق ہر سال ۶۸ لاکھ سے زائد خواتین اور نوزائید بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔اپنے مضمون فیمنسٹ، عورت اور نسائیت کا نظریہ انگریزی زبان اور فلسفے کی پروفیسر ٹورل موئی Toril Moi نے ۱۹۹۷ء میں دیا۔اس نے فیمنزم کو سیاسی اصطلاح کے طور پر اخذ کیا جبکہ ایلین شوالٹر کے نزدیک فیمنزم کا مطلب ذات اور تشخص کی تلاش کہا ہے جو اس کا ۱۸۲۰ء کے بعد کا دور ہے۔ٹورل موئی کے مطابق عورت پن کا تعلق جسم / حیاتیات سے ہے۔عورتوں کے جسم کا بیان بھی لذت حاصل کرنے کا ایک آلہ کار بنا ہوا ہے تاریخ میں عورت کی مجسمہ نگاری مصوری اور شاعری کے ذریعے کی گئی اور عورت ان فنون کا خاص موضوع بنی رہی۔تاریخی ارتقاء سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کائنات ہو یا معاشرہ یا مرد سے رشتہ ہر تناظر میں صدیوں سے عورت کو معاشرے نے اس کے بدن کے حوالے سے ہی دیکھا اور اس کے کردار کا تعین کیا گیا۔فرانس میں شادی سے پہلے کنوارے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ایک رسم اور ٹیسٹ ہوتا تھا جو بی بی سی کے مطابق ابھی تک جاری ہے وہاں پر کچھ مسلمان خاندان شادی سے پہلے کنوارے پن کا ثبوت طلب کرتے ہیں جن پر پابندی عائد ہونے کے باوجود عمل ہو رہا ہے۔ادب کی کسی صنف میں اس کے اعضاء کا اظہار تسکین کا باعث بنتا ہے تو کہیں انھی اعضاء کا ذکر کسی تکلیف دہ عمل کے تحت ہو تو گناہ کبیرہ بن جاتا ہے جیسے عصمت چغتائی اور منٹو کے افسانوں میں عورت کے اعضاء کا ذکر معاشرتی ناہمواری اور بیمار ذہنیت کی علامت کے طور پر آیا ہے جس کو لکھنے کی وجہ سے ان قلم کاروں پر فحاشی کے مقدمات چلائے گئے۔روسلیڈ Rosaild اور کاورڈ Coward نے اپنے ناولوں میں عورت کی مجسمہ نگاری فحش انداز میں کی، تاکہ ان کے ناول زیادہ سے زیادہ وجہ فروخت ہوں اور ہوتے بھی تھے۔لہذا عورت کے جسمانی خدوخال کو نسوانیات کا نام دیا جاتا ہے جس کی نقل بہت سی زوال پذیر تہذیبوں کے بیمار ذہن مردوں نے کی۔جس میں دبستان لکھنو مشہور ہے۔

د۔نسائیت:

نسائیت سے مراد عورت کے خیالات، جذبات اور احساسات ہیں۔جن کو ہمیشہ دبا دیا گیا۔جذبات کا تعلق دل اور زبان سے ہے اس کو ان دونوں سے عاری سمجھا ہی نہیں گیا بلکہ بنا دیا گیا۔عورت اپنی ذات کو بیان قاصر سمجھی جاتی تھی اور خاموش کروا دی جاتی تھی اس کے احساسات کو ہمیشہ دوسروں نے بیان کیا۔اس کی اپنی کوئی ذات نہیں بلکہ وہ مرد کے شعور ذات سے مستعار لی گئی ہے۔اس کی ناقص / بوسیدہ حیثیت کو ناصر عباس نیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"عورت کے تجربے، تجزیے ذات یا روح سے نہیں ابھرا، بلکہ وہ مرد کا شعور ذات ہے۔ ایسا نہیں کہ عورت تجزیہ ذات کی صلاحیت یا روح سے محروم تھی۔ بس عورت کو یہ موقع ہی نہیں دیا گیا۔"(۵)

نسائیت کے بارے میں ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

"نسائیت ایک باطنی احساس کا نام ہے جو خالص عورت کے نقطہ ٔ نظر اور طرز فکر کی دین ہے۔ اس حسیت کا تعلق عورت کے اپنے وجود سے جڑے جذبات اور احساسات سے ہوتا ہے۔ ان مخصوص احساسات، جذبات کا اظہار بھی ایک عورت ہی بہتر طور پر کر سکتی ہے۔"(۶)

اسی بناء پر نسائیت سے مراد عورت کے جسم، خیالات اور جذبات کو ثقافتی رنگ میں بیان کرنا ہے۔ ٹورل موئی نے نسائیت کو ثقافتی پس منظر میں دیکھتے ہوئے اس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کیے:

"A set of culturally defined characteristic or a cultural construct many sounds irritationgly vague to many." (۷)

نسائیت ثقافتی طور پر متعین ایسی خصوصیات کا مجموعہ ہے جن کی آوازیں ثقافتی تشکیل میں لوگوں کے لیے مبہم ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر قرۃ العین اپنے تحقیقی مقالے "خواتین کی آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" میں نسائیت کے بارے میں لکھتی ہیں: "نسائیت نہ تو تحریک ہے نہ رجحان، نہ کوئی عقیدہ بلکہ یہ خواتین کی حسیت اس کی سوچ اور محسوس کئے گئے جذبات کا بیان ہے کہ وہ کس جذبے کے ساتھ معاشرے کو دیکھتی ہیں۔"(۸)

نسائیت کا تعلق صنف سے ہے جس میں غیر مساوی رویے پائے جاتے ہیں جن پر عمل بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے جنس اور صنف کا نظریہ ماہر بشریات مارگریٹ میڈ نے تقریباً ۱۹۳۰ء کو دیا۔ اسی صنفی تضاد کی بناء پر عورت کو کم تر دکھانے کے لیے ہمیشہ اس کے جذبات دبا دیئے جاتے ہیں اور اس کا شمار کمتر چیزوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس لیے کائنات میں بھی جاندار اور بے جاندار اشیاء اور چیزوں کی تقسیم میں بھی تعصبانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ چھوٹی چیزوں کو مونث اور بڑی چیزوں کو مذکر کہا گیا۔ فرانس میں بھی تذکیر و تانیث کی تقسیم طاقت کے لحاظ سے کی گئی زیادہ طاقت ور جاندار مذکر اور کم تر جاندار مونث کہلائے جیسے انسانوں اور جانوروں کو نر جبکہ عورتوں اور بے جاندار چیزیں مونث کہلائیں۔ اس لیے عورتوں سے سلوک اور توقعات بھی جانوروں کی طرح کی گئیں۔ اسی طرح جرمن زبان میں بھی کم درجہ مردوں، عورتوں، بچوں اور اشیاء کو ایک ساتھ شمار ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کو اہمیت

بھی دوسرے درجے کے شہریوں کے طور پر دی گئی۔عورت کی حقیقی شکل میں سامنے نہ آنے کی وجہ سے وہ ہمیں طوائف، مذہبی دیوی یا پھر چڑیل،ڈائن اور جادوگرنی نظر آتی ہے۔اور تو اور اسے ہمیشہ منفی صفات سے نوازا گیا اسی وجہ سے اسے ہمیشہ بزدل اور جذباتی ہونے کا طعنہ دیا جاتا رہا جب کہ مرد کو بہادر، دلیر اور مضبوط اعصاب کا مالک سمجھا گیا۔مرد نے اپنی برتری کو محسوس کرتے ہوئے عورت کو کم تر درجہ دیا، جس سے وہ نفسیاتی طور پر احساس کم تری کا شکار ہوئی اور اپنے وجود سے نفرت کرنے لگی۔اس کو کمتر ثابت کرنے کے لیے سال ہا سال کی سماجی، مذہبی اور معاشرتی تاریخ رقم کی گئی۔دنیا کی ہر زبان، ملک اور قوم میں اس کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا۔انگریزی زبان میں عورت کو وومن کہا جاتا ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اصل لفظ (womb man) وومب من یعنی رحم والا مرد ہے جو بعد میں بدل کر woman ہو گیا۔اس سے یہ قیاس کیا جاتا رہا کہ عورت مرد کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کو ہر زبان میں ایک نام دیا گیا جیسے فارسی میں زن، ہندی میں ناری / استری جبکہ عربی زبان میں نساء یا امراۃ کہتے ہیں۔زبان پر بھی مردوں کی اجارہ داری واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے، اگر ہم لفظ عورت کا مطلب ہندوستانی معاشرے کے پس منظر میں دیکھیں تو شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔جس کا منہ بولتا ثبوت تمام فرہنگ اور لغات ہیں۔"اردو زبان کی سب سے زیادہ مستند لغت فرہنگ آصفیہ میں: عورت (ع) اسم مونث: عورت کو آدمی کے جسم کا وہ حصہ کہا ہے جس کا کھولنا موجب شرم ہے۔اندام نہانی۔شرم گاہ۔چنانچہ ستر عورت گاہ کا ڈھکنا مراد ہوا کرتی ہے۔(۲۔ا۔مجاز) زن، استری، تریا نار۔ناری۔لگائی۔مہرارو (۳۔ا۔عوام) جورو، بیوی اور زوجہ کا نام دیا گیا۔"[۹]

مولوی نورالحسن نیر نے اپنی لغت "نوراللغات" میں عورت کی یوں تصویر کشی کی ہے:

"عورت وہ چیز جس کو دیکھنے دکھانے سے شرم آئے۔ناف سے ٹخنہ تک جسم انسانی کا حصہ۔زوجہ، بیوی۔آدمی کے جسم کا وہ حصہ جس کا کھولنا موجب شرم ہے جیسے ستر عورت یعنی شرم کے مقام کا چھپانا۔ضرب المثال کے مطابق عورت کی ذات بے وفا ہوتی ہے۔عورت سے وفا نہیں ہوتی۔عورت کی عقل گدی کے پیچھے۔عورت بے وقوف ہوتی ہے۔عورت کی ناک نہ ہوتی تو گو کھاتی۔عورت ناقص العقل ہے۔"[۱۰]

"فیروزاللغات" میں "عورت اور گھوڑا ران تلے جیسی شرمناک باتوں سے عورت کو بیان کیا گیا ہے"[۱۱] باقی کی بھی لغات میں ان جیسے یا ان سے ملتے جلتے الفاظ میں عورت کا اختراع کیا گیا ہے علی عباس جلال پوری نے اپنی کتاب "جنسی مطالعے" میں عورت کے لیے لفظ شرم گاہ استعمال کیا۔ان باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے عورت کو عورت کم اور گالی زیادہ سمجھا جاتا تھا اور ہے عورت کی ادھوری شناخت پیدائشی نہیں بلکہ سماجی اور ثقافتی قدروں میں

ڈھلتی گئی جس کے پیچھے پدر سری سوچ اور طاقت کار فرما تھیں۔اس لیے سیمون دی بووانے اپنی کتاب میں نسائیت کو ایک پراسرار حقیقت کہا ہے۔اردوشاعری نے بھی عورت کے خیالات،احساسات اور جذبات کواردو غزل اور ریختی کی صنف میں بیان کیا گیا ہے۔لکھنوی شاعری کی مشہور صنف ریختی تھی جس کو عورتوں کی زبان کہا جاتا ہے۔لکھنوی شاعری کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک نسائیت بھی تھی جس کی وجہ سے دبستان لکھنو بدنام ہوا۔ان کے مطابق عورتوں کے مخصوص محاورات، مصطلحات اور نسوانی احساسات اور جذبات کو شعر میں شامل کرنا نسائیت کہلاتا تھا۔ریختی میں نسائیت کا عنصر بنیادی اہمیت کا حامل تھا چنانچہ ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:"نسائیت اور فحش گوئی سے مل کر ریختی کی بنیاد پڑی۔"(۱۲)

ریختی میں عورت کے ملبوسات کے ساتھ ساتھ اس کے اعضا جسمانی کا بھی کھل کر ذکر کیا گیا ہے۔یوں ریختی میں عورت کی دریافت کے ساتھ ہی مردوں کی سائیکی کو بھی عیاں کیا گیا۔جو اس کھیل کو چلا رہے تھے۔لکھنوی تہذیب میں مردوں کی رنگین مزاجی سے کون واقف نہیں۔؟ جنہوں نے عورت کی چال ڈھال کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا تھا۔عبدالحلیم شرر کی کتاب "گذشتہ لکھنو" میں نصیر الدین کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ عورتوں میں رہنے کی وجہ سے زنانہ مزاجی کا شکار تھے۔وہ عورتوں کی طرح باتیں کرتے اور ان کی طرح لباس زیب تن کرتے۔مذہبی شان میں آئمہ بیبیوں کی طرح وضع حمل کا ڈھوگ رچاتے۔چہرے اور حرکات سے حمل کی تکالیف کو وضع کرتے اور فرضی بچے جنتے تھے۔یہی حالت نوابوں اور دوسرے اعلی اقدار کے مردوں کی تھی۔اسی لیے عورتوں کے حسن کا زیادہ سے زیادہ بیان انشاء اللہ انشاء اور جرات کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں ڈیرے دار طوائفوں کی موجودگی میں عورت، عورت کا جسم اور اس کے لباس کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔طوائف تو مردوں کے حواس پر دہلی میں بھی چھائی ہوئی تھی مگر ان کو باقاعدہ طور پر لائسنس لکھنو میں دیئے جاتے تھے۔کسی بھی عورت کو طوائف کے لیبل کے بغیر قبول نہیں کیا جاتا تھا یعنی عورت کی معنویت ہی ختم کر دی گئی۔ڈاکٹر روش ندیم اپنی کتاب "منٹو کی عورتیں" میں ریختی کی صنف میں بیان کی جانے والی عورت کے بارے میں لکھتے ہیں:"ریختی جیسی صنف کی ایجاد اور اس کے ذریعے سے جس شہوت زدہ عورت کا روپ پیش کیا گیا وہ بھی لکھنوی مرد کا اپنا نفسیاتی اظہار تھا۔"(۱۳)

ماہر نفسیات کے مطابق ہر مرد کے اندر نسائیت اور عورت کے اندر مردانہ پن ہوتا ہے اسے یونگ نے Anima کہا ہے۔حد سے زیادہ عیش پرستی کی وجہ سے وہ جنسی رغبت کا شکار ہوتے ہیں۔جس Fetishism کہا جاتا ہے۔ڈاکٹر عامر سہیل کے مطابق:

> “A person is sexually attracted to non- living objects.There are almost as many different types of fetishes as there are objects although womens undergarment and shoes are very popular. ”(۱۴)

ایک فرد بے جان چیزوں کی طرف جنسی طور پر مائل ہوتا ہے۔ جنسی رغبت کی اتنی ہی اقسام ہیں جتنی چیزوں کی، جن میں عورتوں کے انڈر گارمنٹس اور جوتے زیادہ مشہور ہیں۔

زیادہ تر عورتوں میں رہنے کی وجہ سے ان کے مزاج اور رہن سہن میں نسوانیت سما چکی تھی۔جو کہ زوال پذیر تہذیبی لکھنو کی نمائندگی کرتی ہے۔اسی بے حیائی اور فحش گوئی کی وجہ سے ریختی کو اردو صنف سے متروک قرار دیا۔اس بات میں کوئی شک نہیں عورت کا وجود اور صلاحیتیں مردوں کی تشکیل کردہ ہیں ورنہ تاریخ میں کسی ایک عورت کی توذہانت، بہادری اور فتح کے چرچے ہوتے؟ تاریخ میں تو فاتح پیغمبر، اولیا، صوفی سب مرد ہی نظر آتے ہیں۔ورجیناوولف کی کتاب ”A Room of One,s Own“ نسائی پس منظر کے تحت لکھی گئی ہے جس میں شیکسپر کی بہن کا کردار ایک ایسی باصلاحیت خاتون کا کردار ہے جس میں معاشرہ اس کی پوشیدہ قابلیت کو ابھرنے نہیں دیتا۔دوسری طرف دیکھا جائے تونسائیت کا گہرا تعلق پدرسری نظام کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔جس سے مراد مرد کی خاندان پر حکمرانی ہے۔خاندان کا تصور بہت قدیم ہے شاید مذہب اور ریاست سے بھی زیادہ۔اس خاندانی نظام میں دیوتاؤں اور پیغمبروں کا خاندان بھی شامل ہے۔اسی خاندان کے تصور میں پہلے مادر سری نظام تھا بعد میں پدرسری میں بدل گیا۔مشہور امریکی مورخ لوئیس ہنری مارگن نے خاندان کو ایک زندہ اور متحرک چیز کہا ہے۔اس کے مطابق یہ کبھی بھی ایک حال پر نہیں رہتا۔جس طرح سماج نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتا ہے اس طرح خاندان بھی نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کرتا ہے۔کیا ہمارا معاشرہ دوبارہ مادر سری نظام کی طرف سفر کرے گا؟ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔مادر سری نظام کب رائج ہوا تھا اس کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔پہلے زراعت اور کھیتی باڑی عورت کے ساتھ منسوب تھی۔مورگن، فریڈرک اینگلز اور مارکس کے مطابق عورت نے نہ صرف زراعت کو ایجاد کیا بلکہ اس شعبے کو ترقی بھی دی۔عورت کے کردار کو بھی زمین جیسا کہا جاتا ہے کیونکہ دونوں کا تعلق تخلیق سے ہے۔ان ہی خصوصیات کی بناء پر عورت کو فطرت کے قریب ترین قرار دیا گیا۔کھیتی باڑی کی رسم میں حاملہ عورت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔اس وقت یہ تصور کیا جاتا تھا کہ حاملہ عورت اور زراعت کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔حاملہ عورتوں کی ملنے والی مورتیاں اسی عقیدے کی عکاس ہیں۔ابتدائی دور میں انسان ان مورتیوں کی پوجا کرتا تھا اور یہی مورتیاں رسوم سحر میں استعمال ہوتی تھیں۔ہڑپہ سے ملنے والی تین

ہزار سال پرانی مہریں اسی صورت حال کی غماز ہیں۔سبط حسن اپنی کتاب ”ماضی کے مزار“ میں ہڑپہ سے ملنے والی دو مورتیوں میں سے ایک کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:”

> اس میں ایک پودا زمین سے اگ رہاہے۔ایک برہنہ عورت پودے کے پاس کھڑی ہے اور دوسری گھٹنوں کے بل بیٹھی ہے۔اس کے دونوں ہاتھ پودے کی شاخ کو چھو رہے ہیں۔اس کے پیچھے ایک بیل کھڑا عورتوں کو غور سے دیکھ رہاہے۔“(۱۵)

یہ مورتیاں فن مصوری کا حسین امتزاج ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور میں پائی جانے والی عورت کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں جو اس وقت رائج مدرسری نظام کی نشان دہی کرتی ہیں۔اولین یورپی باشندوں نے ہزار ہا نسوانی مورتیاں چھوڑی ہیں جن میں مردانہ مورتیاں پانچ فی صد سے بھی کم ہیں۔یہ سب کچھ تب تک تھا جب ہل ایجاد نہیں ہوا تھا۔ہل کی ایجاد کے بعد زرعی پیداوار کا نظام مردوں نے آہستہ آہستہ اپنے قبضے میں کر لیا۔اس کے پاس دولت اور اختیار آتا گیا۔اس نے جانوروں کا شکار کرنا شروع کیا۔دولت آنے پر جانور اور غلام خریدے جانے لگے جن میں لونڈیاں بھی شامل تھی۔اس کے بعد عورت بھی بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت ہونے لگی۔اس کو زمین اور جانوروں کی طرح مرد نے اپنے قبضے میں لے لیا۔اس کو بچے پیدا کرنے والی محبوبہ،پیار کرنے والی دیوی اور مشفق ماں کا درجہ دیا۔قبائلی لڑائیاں شروع ہونے کی صورت میں مردوں کو یاتو مار دیا جاتا یا قیدی بنالیا جاتا جب کہ عورت کی کیفیت اس سے یکسر مختلف تھی وہ فاتح کے قبضے میں جا کر دشمنوں کے بچے پیدا کرتی اور ان کے خاندان میں اضافہ کرتی۔اس سے یہ احساس پیدا ہوا کہ مرد عورت سے بہتر ہے وہ کم از کم دشمنوں میں اضافہ تو نہیں کرتا۔اس کے ساتھ ہی مادر سری نظام سے پدر سری نظام میں بدل گیا۔اس کا مطلب ہے باپ کی حکومت۔یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جو Patria. Pat سے ماخوذ ہے جس سے مراد ایک نسل کا سربراہ ہے۔تاریخی طور پر پدر سری کی اصطلاح خاندان اور مذہبی تنظیموں کی صدارت میں ڈھالی ہوئی ہے۔اس کو زر،زن اور زمین پر غلبہ حاصل ہے،جو مردوں کی ذاتی ،نجی اور سرکاری سطح پر غلبہ حاصل کرنے کی خاموش حکمت عملی کو ظاہر ہے۔جس کا دائرہ کار خاندان کے علاوہ گروہ،قبیلہ اور ریاست تک تحت پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ ثقافتی ،معاشی اور معاشرتی نظام کے ڈھانچے میں مرد اور عورت کے درمیان پایا جانے والا تعلق اور اس کے فرق کو بیان کرتا ہے،جو مردوں کو طاقت ور اور بااختیار بناتا ہے۔یہی حکمت عملی ان کی معاشی،ثقافتی اور معاشرتی حالت کو مزید مضبوط کرتی اور ترقی کی طرف گامزن کرتی ہے دوسری طرف عورتیں کو ان کے جائزہ اختیار سے بے دخل کرتی ہے جس سے عورت کی محکومیت ظاہر ہوتی ہے۔یہ اختیار ایک باپ سے اس کے بچوں میں منتقل ہوتا ہے یہ سب کچھ شوہر کو خوشگوار اور پرامن زندگی

گزارنے میں مدد دیتا ہے۔اس سارے عمل میں عورت کی حیثیت ایک معمولی اور غلام ملازم کی سی رہ جاتی ہے جو بچے پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی اور ذہنی نشوونما بھی کرتی ہے اور اپنی تربیت کے ذریعہ معاشرتی اقدار کو استوار کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ دوسری طرف عورت کو اس کی خدمت کا صلہ کم عقل ،احمق اور بے وقوف ہونے جیسے القابات کی صورت میں ملتا ہے یوں وہ اپنی حیثیت کھونے کے ساتھ ذلیل وخوار بھی ہوتی ہے۔یہ نظام جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کے تحت کار فرما ہے۔جس میں اپنے سے کم تر بچوں،جوانوں اور عورتوں کو اپنا ماتحت بنایا جاتا ہے۔اس نظام کا آغاز آج سے تقریبا چار ہزار سال پہلے مسوپوٹیمیا میں ہوا اور بتدریج ساری دنیا میں پھیل گیا۔پدرسری نظام ایک ایسی سیاسی چال کے ذریعے جھوٹ اور فریب پر مبنی یہ ایک نظریاتی نظام تشکیل دیتا ہے جس میں عورت کو مختلف طریقوں سے کم تر بنایا جاتا ہے۔یہی نظام نسائیت کی خصوصیات متعین کرتا ہے۔جس کے تحت کمزوری ،بزدلانہ پن،عاجزانہ انداز اور لہجے کی مٹھاس کا تعلق عورت سے ہے جبکہ مرد ہمیشہ بہادر، سخت جان،طاقت ور اور اصول پسند بنایا جاتا اسی نظریے کے تحت وہ ہمیشہ فاتح اور عورت شکست خور ہوتی ہے۔اس کا گھر کے پورے نظام پر کنٹرول ہوتا ہے ہر بات کا فیصلہ وہ خود کرتا ہے۔اس کی شادی کہاں اور کس سے ہوگئی ؟اس کے کتنے بچے ہوں گے ؟گھر میں کون آئے گا۔؟بیوی کیا کام کرے گی اور کیا نہیں کرے گی۔؟وغیرہ۔یوں دو انسانوں کے درمیان حکم اور محکوم کا رشتہ پیدا ہوتا ہے۔اسی نظام کو مستحکم بنانے میں ثقافتی،سیاسی اور مذہبی رہنما معاون ثابت ہوتے ہیں۔یہ نظام مردانگی کی بالادستی کو طے شدہ طرز عمل اور سوچنے کے انداز پر لاگو ہوتا ہے۔جس کے تحت مردوں کی حاکمیت اور عورتوں کی محکومیت کو جائز اور قانونی حیثیت دی گئی ہے۔عورتوں کی ماتحتی کی جال سازی میں خاندان کے بزرگ ،فوجی افسر مذہبی رہنما اور ریاست کے سیاسی طبقے کے علاوہ اعلی اداروں کی اندرونی اور طے شدہ حکمت عملی شامل ہوتی ہے۔بزرگوں کی رائج اصطلاحات کو استعمال کرنے سے نوجوانوں کو بغیر کسی سازشی شمولیت کے وراثتی طور پر مرد اور سربراہ ہونے کا بڑا عہدہ ملتا ہے۔اسی نظام کے تحت تمام مرد عورت کی جارحیت کی کاروائیوں میں مشغول ہوئے بغیر ہی پدرانہ غلبہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اسی نظام کو(عورت کی محکومیت کو ظاہر کرنے) کے لیے ہر مذہب اور تہذیب نے اپنایا مگر ان کا انداز مختلف مگر ملتا جلتا تھا۔ سب سے پہلے بابلی اور حمورابی تہذیبیں تھیں۔بابل مصر کا بادشاہ تھا جس نے عائلی زندگی کو اہمیت دی اور قوانین بنائے تھے۔انہوں نے ہی خواتین اور داشتاؤں کے متعلق قوانین بنائے۔انہوں نے عورت کو کھیتی قرار دے کر دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے عورت کو جنسی طور پر استعمال کیا۔ان کے ہاں زرعروس ،نکاح اور جہیز کا عام رواج تھازرعروس سے مراد بیوی کو خریدنا ہے جس کی ادائیگی شوہر یک مشت یا اقساط کی شکل میں ادا کرتا ہے۔وہ

بیوی کو خریدنے کے بعد کسی اور کے ہاتھ بیچنے کا حق رکھتا ہے۔وہ اس کو رہن میں دے یا وارثوں کے نام منتقل کر دے۔ان کے ہاں غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں جس میں ان کی قیمت کا تعین شکل وصورت دیکھ کر کیا جاتا تھا۔مالک رام کے مطابق:"بیوی اس کی ملکیت تھی جب اس کے پاس زر اور جواہر نہ رہے تو اس نے جائیداد ہارنا شروع کر دی اور جب کوئی اور چیز نہ رہی تو سب سے آخر میں بیوی بھی داؤ پر لگادی،وہ بھی اس کی جائیداد کا حصہ تھی۔"(۱۶)

ایک بیوی کے بانجھ ہونے کی صورت میں کنیز سے شادی کروا دی جاتی تھی۔اسقاط حمل کی سزا موت تھی۔ مصری تہذیب کا تعلق فراعین، حضرت موسیٰؑ، اور بنی اسرائیل جیسی قوم سے تھا۔روہنس کی کتاب قدیم مصر میں عورت بہت مشہور ہے۔اس کے مطابق قدیم مصر میں عورتیں غائب تھیں کیوں کہ یہ تاریخ تین ماخذات کے تحت لکھی گئی جن میں آثار قدیمہ، تحریری متن اور مصری مجسمے مشہور ہیں۔آثار قدیمہ کے تحت حاصل ہونے والی معلومات ایک بار کھدائی سے لی جاتی ہیں بعد میں اس کو بھر دیا جاتا ہے اور یہ نہیں پتہ چلتا کہ کھدائی کہاں کی گئی تھی۔ متن کی تحریریں زیادہ تر مردوں کی لکھی ہوئی ہیں کیوں کہ اس وقت عورتیں زیادہ تر ان پڑھ تھیں۔مصوری اور مجسمے بادشاہ اور امراء کی خواہش کے تحت بنائے جاتے تھے۔ان سب حقائق کے مطابق مصر کے بارے میں ملنے والی معلومات زیادہ مستند نہیں۔قدیم مصر کی تاریخ میں عورت کا سفر ایک دیوی سے شروع ہو کر معاشرے کی تباہی و بربادی پھیلانے والی ناگن تک پھیلا ہوا ہے۔ مصریوں کی آئسس دیوی کی وجہ سے عورت کی حالت کافی دیر تک بہتر رہی مگر بعد میں اس تہذیب پر بھی پدر سری نظام کے اثرات رونما ہونے شروع ہو گئے۔اس کو تخت و تاج کا وارث بنایا گیا۔شاہی خاندان میں کوئی مرد وارث نہ تھا۔ملکہ ءمصر مردانہ لباس استعمال کرتی تھی کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ عورت سرداری کے لائق نہیں۔تاہم مصر کے کئی رسم ورواج نے اہلیان مصر کو پستی میں دھکیل دیا۔شادی کے بعد عورت مرد کی ملکیت قرار پاتی اور ساتھ میں اس کا سامان بھی مرد کا ہو جاتا۔تاہم ڈاکٹر محمد شہزاد شمس کی کتاب "عورت اور سماج" کے مطابق مصر میں عورت کی حالت قدر بہتر تھی اور پہلے نکاح کی ایجاد بھی یہاں سے ہی ہوئی اس سے قبل کسی بھی ملک میں شادی کے وقت شرائط لکھوا کر دستخط کروانے کی روایت نہیں ملتی۔ یونانی تہذیب پر افلاطون، ارسطو اور سلطنت عباسیہ نے اس تہذیب پر گہرے اثرات چھوڑے۔زیویس دیوتا کی سربراہی میں یہاں بہت سی دیویاں اور دیوتا تھے جن کو مختلف اچھی اور بری علامات کے ساتھ موسوم کیا جاتا تھا۔یونانی دیومالا کے مطابق جب زیوس دیوتا نے عورت کی تخلیق کی تو اس کا پتلا پنڈورا کی گیلی مٹی سے بنایا۔مختلف دیوتاؤں نے اس کے اندر خوب صورتی اور نسائی خصوصیات سے پیدا کیں زیوس نے پنڈورا کو ایک صندوق دیا جس میں بیماریاں، پریشانیاں، زحمت، پاگل پن، دکھ اور تکالیف تھیں۔اس لیے عورت کو استعاراتی طور پر ان مصائب کے

ساتھ جوڑ دیا گیااوروہ ان مصائب کی علامت کے طور پر پہچانی جانے لگی۔ سقراط نے عورت کو فتنہ فساد کہااور ایسے دفلی کے درخت سے تشبیہ دی جو دیکھنے میں خوب صورت لگتا ہے مگر اندر سے زہریلا ہے۔اس کو ایک ایسی خیالی عورت قرار دیا جس کے اندر تمام مصائب پائے جاتے ہیں۔افلاطون نے مرد اور عورت کی مساوی تعلیم پر توجہ دی مگراس کی کوئی بھی عملی شکل دکھائی نہ دی۔شادی کا مقصد صرف سیاسی تھا جس کے تحت طاقت ور بیٹے پیدا کرنا تھا۔اسپارٹا کے قانون میں یہ تحریص کی گئی کہ ضعیف شوہروں کو اپنی بیویوں کو جوانوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ تا کہ فوج تیار ہو سکے۔اس کی حیثیت ایک بچے پالنے والی لونڈی سے زیادہ نہ تھی۔اس میں اور غلام میں کوئی فرق نہ تھا۔وہ اپنی مرضی کے بغیر نکاح کرتی اور بڑی مشکل سے طلاق لیتی تھی۔شوہر اپنے جس دوست کو چاہتا وصیت کے طور پر اپنی بیوی کا نذرانہ پیش کر دیتا۔

اس معاشرے میں بھی لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں اور لڑکی کی پیدائش پر صف ماتم بچھ جاتی۔ایسی حالت میں ان کی عورتیں نیم غلامی کی زندگی بسر کرتی تھیں۔بیوی منتخب کرنے کا معیار بہت کڑا تھااس کے باوجود بیوی اگر بیمار ہو جاتی تو اس کے کمرے میں ایک داشتہ دل بہلانے کے لیے ہوتی تھی۔عورت کو معاشی طور پر بوجھ بھی سمجھا گیا۔جس میں پہلے شوہر لڑکی کے باپ کو کوئی تحفہ دیتا تھا بعد میں باپ اپنی بیٹی کو جہیز دینے لگا۔ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "تاریخ و تحقیق" میں جہیز دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"جہیز کی اس رقم سے یہ خیال کیا جاتا کہ شادی کا بندھن مضبوط ہو جائے گا،کیوں کہ طلاق کی صورت میں شوہر کو جائیداد واپس کرنی ہوتی ہے۔"(۱۷)

ان کے ہاں آزاد عورتیں بھی تھیں جن کو کسی قسم کا پابند نہیں کیا جاتا تھا،گھریلو اور آزاد عورتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔گھریلو عورتیں ان کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔یونان کا زیادہ تر تعلق برصغیر سے ہے آریا قوم بھی یہاں ہی آئی تھی۔اس لیے اس تہذیب نے برصغیر پر اپنے اثرات زیادہ مرتب کیے۔

عرب میں عورت ایک ناکارہ شے سمجھی جاتی تھی۔یونان اور روم جیسی اعلی تہذیبوں میں عورت کی حالت نا قابل گفتہ بہ تھی تو ایسی تہذیب میں کیا حال ہو گا۔اس کا تصور ہی محال ہے۔عرب معاشرے میں عورت ایک جائیداد کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ان کے ہاں عورت کے بارے میں چند تعصبات پائے جاتے تھے کہ عورت جسمانی اور ذہنی طور پر مرد سے کمزور ہے یہ مرد کے بغیر ضروریات زندگی پوری نہیں کر سکتی ہے اور نہ اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کر سکتی ہے اس لیے یہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔شوہر کی وفات کے بعد عورت کو فروخت کر دیا جاتا تھا۔اس کو بھی زمین اور جوئے کی طرح داؤ پر لگایا جاتا تھا۔

ایران میں بھی عورت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ یہاں عورت کی زندگی اور موت کا اختیار مرد کے ہاتھ میں تھا امیر مرد عورتوں کو پردے کی تلقین کرتے اور وہ گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ جاتی۔ اس لیے ان کی تاریخوں، قدیم عمارتوں اور کتبوں میں کسی عورت کا مجسمہ نہیں ہے اور تو اور یہاں یہ بھی رواج تھا کہ شوہر اپنی بیوی کسی بے روزگار شخص کو دے تا کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کر سکے۔ اس عمل میں عورت کی رضامندی یا رائے نہیں لی جاتی تھی۔ اس عارضی ازدواجی زندگی میں جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ پہلے شوہر کی ہی مانی جاتی تھی۔ یہ مفاہمت ایک قانونی اقرارنامے کے ذریعے انجام پاتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عورت ناپاک ہے اور اس کی نظر بد، نجس اور بری ہے جو جس بچے پر پڑے وہ زندہ نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ بچوں سے دور رہے تا کہ شیطانی ناپاکی بچوں کی بدبختی نہ بنے۔ ان میں محرم رشتوں میں بھی ازدواجی تعلقات پائے جاتے تھے۔ اس شدید شہوانیت رجحان کے خلاف مانی تجرد کی تحریک چلائی۔ اور نکاح کو حرام قرار دیا۔ اس تحریک کی وجہ سے ایران جنسی انارکی اور شہوانی میں ڈوب گیا۔ ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ شراب کی تین قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ نشہ آور اور زہریلی عورت ہے۔ چین میں متعدد شادیاں کرنے کی روایت عام تھی۔ مردوں کو ایک سو تیس عورتیں رکھنے کا اختیار حاصل تھا۔ زائد شادیوں پر پابندی لگنے کی صورت میں لونڈیاں رکھنے کی اجازت عام تھی۔ لونڈی کی حیثیت بیوی سے کم تر ہوتی تھی البتہ اولاد کو اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

"Women is not a subject .She is an object, which man uses and abuses as a thing is used and abused."(۱۸)

عورت ایک فاعل نہیں ہے بلکہ ایک وہ مفعول ہے، جسے مرد ایک شے کے طور پر استعمال ہی نہیں کرتا بلکہ اس پر زیادتی بھی کرتا ہے۔

یورپ میں بھی عورت کسی معاملے میں آزاد نہ تھی جان اسٹورٹ مل کی کتاب "محکومیت نسواں" کے مطابق باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا بیچ سکتا تھا اور اس کی مرضی کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا۔ روس میں بیوی کو زدوکوب کرنے کے لیے خسر کی طرف سے دولہا کو ایک کوڑا دیا جاتا تھا۔ مغربی امریکہ میں عورتیں فوج کا حصہ تھیں ان کی کارکردگی مردوں سے بہتر ہونے کی بناء پر وہ راجہ کی محافظ نہیں تھی اس کے باوجود ان کو کم تر درجہ دیا گیا۔ دنیا کے تمام ممالک اور خطے میں عورت کو کم تر درجہ دیا گیا۔ وہ ہر جگہ بے بس اور مظلوم ہی رہی۔

تہذیبوں کے بعد مذاہب کو دیکھا جائے تو یہ ایک اہم سماجی ادارہ ہیں، جہاں پر معاشرے کی فلاح کے لیے قوانین مرتب کیے جاتے ہیں۔ یہودی مذہب کے مطابق عورت ناپاک ہے۔ وہ اس کائنات کے لیے مصیبت کا باعث ہے۔ کیوں کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت کا ممنوع پھل کھانے پر مجبور کیا۔ ان کے مطابق عورت باپ یا

شوہر کی مرضی کے بغیر منت نہیں مان سکتی۔وہ وصیت، شہادت اور وراثت جیسے حق سے بھی محروم قرار دی گئی۔ یہودیوں کی یہ دعا مشہور ہے کہ یااللہ تیرا شکر ہے کہ تونے مجھے عورت نہیں بنایا۔یورپ کا سماجی نظام، بادشاہت اور کلیسائیت پروہت کا زور ۱۴۰۰ءویں صدی تا ۱۷۰۰ءویں صدی تک رہا۔اس دوران تقریبا پانچ لاکھ کے قریب انسانوں کو جادوگر کہہ کرنا جائز مروایا گیا جس میں سب سے زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔عیسائیت کا وجود رومی سلطنت کے جبر اور یہودیت کے رد عمل کے طور پر آیا اس لیے عیسائیت میں بھی یہودیت سے ملتا جلتا نظریہ پایا جاتا تھا ان کے خیال میں عورت گناہ کی ماں، بدی کی جڑ اور جہنم کا دروازہ ہے۔ مسیحیت میں عورت کی زندگی ایک بے بس مخلوق اور مرد کے ہاتھوں کھلونا بننے کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ انہوں نے عورت کو ایک طرف حضرت مریمؑ کی صورت ماں تصور کیا تو دوسری طرف جادوگرنی کہہ کر ناحق مروایا۔بائبل کی تشریحات پدرسری اصولوں کے تحت کی گئی جس کے تحت ان کے ذہنوں پر راج کیا گیا۔ہندومت میں عورت کو مکار، احمق اور ظالم قرار دیا گیا۔ان کے عقیدے کے مطابق عورت پیدائشی گناہ گار ہے۔اس کی اہم ترین ذمہ داری بیٹے کو جنم دینا ہے۔ان کے مطابق عورت کے ذمہ کوئی عبادت نہیں سوائے مرد / شوہر کی خدمت کے۔نیوگ کا قابل نفرت طریقہ بھی پایا جاتا تھا جس کے تحت شوہر کے ہاں اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوی کو کسی اور مرد سے تعلق قائم کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ صاحب اولاد ہو۔ان کے نزدیک عورت کا اہم ترین کردار بیوی اور ماں کا ہی ہے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کے مطابق بدھ مت میں عورت کو نجس قرار دیا گیا۔یہ عورت سے بے زار تھے اور جنسی تعلق کو گناہ سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ عورت سے تعلق رکھنے والا کبھی نروان حاصل نہیں کرسکتا۔تاہم ڈاکٹر آمنہ تحسین کے مطابق ہندو دھرم کی نسبت بدھ مت میں عورت کو زیادہ آزادی حاصل تھی۔ جین مت کے مطابق عورت خیر سے عاری اور تمام برائیوں کی جڑ ہے۔وہ مردوں کو نصیحت کرتے کہ وہ عورتوں سے کسی قسم کے بھی تعلقات نہ رکھیں۔نہ عورت کی طرف دیکھیں اور نہ بات چیت کریں۔اس مذہب میں راہبانہ زندگی کی طرف اکسایا گیا ہے، اور کیثر زوجگی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ دوسری طرف بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہیں۔

قدیم ہندوستان میں دڑاوروں کے دور میں مادرسری نظام تھا، جس کے تحت وید میں عورتوں کی حالت کچھ بہتر تھی وہ سائمبر کے رواج میں اپنے جیون ساتھی کا انتخاب خود کرتی تھی۔مرد عورت دونوں برابر حقوق رکھتے تھے۔بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت تھی۔بعد میں یہ روایات رگ وید کی شکل میں ہی منسوخ ہوگئی۔لوگ بیٹوں کی شدت سے خواہش رکھتے تھے تاکہ لوگوں سے لڑسکیں۔دھرم شاستر کے عہد میں عورت کی حالت مزید بگڑ گئی۔ آریا قوم نے بھی شروع میں ان کی پیروی کی بعد میں وہ پدرسری نظام لے آئے۔ آریہ ہی ہڑپہ

اور موہنجوڈرو کو تباہ کرتے ہوئے آگے بڑھے تو وہاں بھی اسی نظام کو لاگو کیا۔ یہاں کم عمری کی شادی کو رواج دیا گیا جس میں دس سال کی لڑکی کی تیس سال کے لڑکے سے شادی ہوتی تھی۔ بیوہ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے عورت کو چالاک، مکار، اور شیطانیت کا مجموعہ کہا۔ اس قوم میں زن، زر اور زمین طاقت کے بل بوتے پر ملتے تھے۔ یوں آقا اور غلام کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ بے شمار سنگ دل والدین اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیتے تھے یہاں سے ہی ستی کی رسم نے جنم لیا۔ جس کا مطلب پاک کرنا ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کو بھی زندہ جلا دیا جاتا جس سے عورت کو پاک باز اور باعفت سمجھا جاتا اور آخرت میں نجات کا ذریعہ سمجھا جانے لگا تھا۔ ہندو مذہب میں اس رسم کو مذہبی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ستی نہ ہونے والی عورت کو سماج میں گری ہوئی نظر سے دیکھا جاتا۔ اس کا سر منڈوا دیا جاتا۔

ابوالفضل نے ”آئین اکبری“ میں ستی کی چار قسمیں بیان کی ہیں پہلی جو شوہر کے غم میں بے ہوش ہو جائے اور اس کے رشتے دار اسکو آگ میں جلا دیں۔ دوسری وہ جو شوہر کی محبت میں خود بھی اس کے ساتھ جل جائے۔ تیسری وہ جو معاشرتی دباؤ کے تحت زبردستی جلائی جاتی ہے اور مزاحمت نہیں کرتی، چوتھی صورت میں خاوند کے خاندان والے زبردستی جلا دیتے ہیں۔ ستی کا آنکھوں دیکھا حال بہت سے سیاحوں نے لکھا جن میں ابن بطوطہ بھی شامل تھے۔ جو عہد سلاطین میں ہندوستان آئے۔ وہ ستی کی جانے والی عورتوں کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کرتے ہوئے اپنی کتاب "عجائب الاسفار" میں لکھتے ہیں:

> ”اس نے آگ کی طرف ڈنڈوت کی اور اپنے تیئں ڈال دیا۔ اس وقت نقارے اور نفیریاں بجنی شروع ہوئیں اور لوگوں نے جو بہت سی لکڑیاں ہاتھ میں لیے ہوئے تھے آگ میں ڈالنی شروع کر دیں اور اس کے اوپر بڑے بڑے کندے ڈال دیئے تاکہ وہ عورت حرکت نہ کر سکے۔ حاضرین نے بھی نہایت شور کیا۔ میں یہ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔“[(۱۹)]

وہ عورتیں جو اغوا ہو جاتیں یا زبردستی زیادتی کا نشانہ بن جاتیں ان کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی عہد میں نیوگ کا رواج بھی تھا جس سے مراد یہ ہے کہ اگر شوہر سے اولاد پیدا نہ ہو تو بیوی کسی دوسرے مرد سے جنسی تعلق قائم کر سکتی ہے اس طرح بغیر شادی کے بچے کا پیدا ہونا برا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یوں ایک عورت کئی شوہر رکھتی تھی جس کے تحت شادی کا مقصد صرف لڑکے پیدا کرنا ہی تھا۔ راجہ رام موہن نے اصلاح مذہب کی تحریک کے نتیجے میں ستی کی رسم پر پابندی لگائی۔ ۱۹۱۹ء کے قانون میں بچپن کی شادی پر پابندی لگائی گئی۔ سمرتیوں، پرانوں، اور رزمیہ داستانوں میں عورت کی حالت زیادہ بگاڑا دی گئی۔ اس کو تمام برائیوں کی جڑ کہا جاتا

تھا۔ دھرم شاستر پر کئی سمرتیاں بھی لکھی گئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور منو سمری تھی۔ جس میں ہندو سماج کی عائلی و معاشرتی زندگی کے قوانین لکھے گئے ہیں۔ جس کے دو قانون یہ تھے کہ شادی کے بعد عورت خود کو شوہر کے ماتحت کر دے اور اس کی وفات کے بعد صرف اس کے چھوٹے بھائی سے شادی کر سکتی ہے۔ منو میں ایک یہ بھی عقیدہ تھا کہ عورت ناپاک اور مکروہ ہے جو مرد کی روحانی نجات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین اس وقت کے لوگوں کی تنگ نظری کو اپنی کتاب "حیدر آباد میں اردو کا نسائی ادب" میں ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں: "قطب شاہی دور میں عورت کی تین حیثیات تھیں: رفیق حیات، کنیز اور طوائف۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عورت کی آزادی اور تعلیم کے متعلق گفتگو کرنا گناہ میں داخل تھا"[۲۰] "مہابھارت" کے مطابق طوائف کی چار اقسام ہیں۔ جن میں شاہ کی طوائف، امراء کی طوائف، دیوتاؤں کی طوائف اور عام طوائف۔

اسلام نے دوسرے مذاہب کی نسبت عورت کو معاشرے میں اعلیٰ مقام دلایا۔ اسے ایک آزاد فرد تسلیم کرتے ہوئے تمام صنفی اور جنسی امتیازات کو ختم ہی نہیں کیا بلکہ سزا و جزا میں بھی دونوں کو برابر کا حق دار قرار دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "مرد جیسے عمل کریں ان کا پھل پائیں گے اور عورتیں جیسے عمل کریں گی ان کا پھل پائیں گی۔"[۲۱]

اسلام نے ہی عورت کو پسند کی شادی، جائیداد میں حصہ، تعلیم، روزگار، خلع اور دوسری شادی کی اجازت دی۔ دینی اور اخلاقی لحاظ سے عورت دوسرے مذاہب کی طرح مرد کی تابع نہیں رہی۔ اسلامی تاریخ کے مطابق بہترین مردوں کے گھر بدترین عورتیں رہی ہیں جیسے حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں۔ اسلام ہی نے عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے قانونی تشخص عطا کیا اور نکاح کو مرد اور عورت کے درمیان طے پانے والا قانونی معاہدہ قرار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے خاندانی اور معاشرتی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے کچھ پابندیاں بھی عائد کیں جس سے مراد پاکیزہ اور باعصمت زندگی کے اصول و ضوابط مقرر کرنا تھا۔ جن میں پدر سری نظام کو لاگو کرتے ہوئے یک زوجی، پردے اور زنا سے بچنے کے احکامات ہیں۔ مردوں کو عورتوں پر قوام بنا کر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضلیت دے دی۔ کیوں کہ مرد گھر بنانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اسلام کی یہ تمام تبدیلیاں انقلابی تھیں جن سے عورت کے معاملے میں مثبت اثرات رونما ہونے کی امید تھی۔ لیکن بدقسمتی سے رسول اللہ کی وفات کے بعد دین اسلام کے ماننے والے مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور قرآنی تعلیمات کی تشریح و تفسیر کو اپنے فرقے کے مطابق تشکیل دینے لگے۔ احادیث کو بھی لکھنے کا کام بھی حضورؐ کی وفات کے تین یا چار صدیوں بعد عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں جاگیردارانہ نظام کی غلامانہ ذہنیت غالب آئی جس کے تحت مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب "بہشتی زیور" اور اہل تشیع کے احکامات و فرمودات کی کتاب "تحفۃ الصوام" لکھی گئی تھیں دونوں کتابوں میں عورت کے فرائض ہی فرائض بیان کیے گئے ہیں اور مرد تمام فرائض کی تکمیل کروانے والا حاکم اعلیٰ جو عدم ادائیگی پر عورت

کو سزا یافتہ بھی قرار دے سکتا ہے۔ان کتابوں کی تشریحات کے مطابق بیوی کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا شوہر کی رضا اور مرضی کے تحت ہو یہاں تک کہ مذہبی عبادات کی ادائیگی میں بھی شوہر کی رضا لازم ہے۔ان تشریحات کی تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے لیلے احمد کہتی ہیں:"

مسلہ تعبیر کے اختلاف کا ہے اور یہ اختلاف مخصوص الفاظ کی تفہیم کا اختلاف نہیں تھا بلکہ زیادہ انتہا پسندانہ، یا ماورائے متنی لحاظ سے اس بات کا اختلاف ہے کہ حضورؐ کے افعال اور الفاظ کا کیا مطلب لیا جائے اور تاریخ سے ان کے کیا معانی لیے جائیں۔"(۲۲)

اس سلسلے میں بھی معاشرے کے غالب حصے کی ثقافت، مذہب اور سیاست آڑے آئی جس کے نتیجے میں یہ لوگ جلد ہی اپنی فطرت پر لوٹ آئے۔چالیس سال کے مختصر عرصہ خلافت کے بعد ملوکیت کا آغاز ہوا۔ جس کے مطابق حکمرانوں کی رضا ہی شریعت کا درجہ رکھتی تھی۔غلامی کی دم توڑتی ہوئی روایت دوبارہ مستحکم ہو گئی۔ مسلمانوں کے گھر کنیزوں لونڈیوں اور غلاموں سے بھر گئے۔ جن کی نگرانی کے لیے خواجہ سرا کو مامور کیا جاتا تھا۔ان کنیزوں کے مالک کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ان غلام عورتوں سے جنسی تعلقات تو قائم رکھتے تھے مگر نکاح کے پابند نہیں تھے۔ ان سے ہونے والے بچوں کو اپنی اولاد بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔اس وقت کے قوانین کے مطابق ان کو ایک آزاد شہری کا درجہ دیا جاتا تھا یوں اس نظام نے آقا اور غلام کا رشتہ استوار کیا۔عباسی معاشرے میں عورتوں کی تجارت جنسی استعمال کی حیثیت سے ہوتی تھی۔بقول پروفیسر وارث میر کے:"عہد ملوکیت میں ہر گھر میں لونڈیاں موجود تھیں۔۔۔بیشتر عباسی خلفاء لونڈیوں کی اولاد تھے۔"(۲۳)

مسلمانوں کی تاریخ اور ادب ایسے کئی واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔بے جا رسم ورواج اور عقائد کو مذہب کا نام دے کر لاگو کیا گیا۔ان کے بارے میں علمائے کرام میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے ان ہی احکام میں سے ایک پردہ بھی ہے جس کا حکم مرد وعورت دونوں کو نگاہیں نیچی کرنے کی صورت میں دیا گیا ہے۔ دور جدید میں عورت جب گھر سے باہر کوئی کاروبار، جائیداد یا پیشہ اختیار کرے یا کسی کام کی غرض سے گھر سے باہر جائے تو کن اعضاء کا پوشیدہ ہونا لازمی ہے۔شرعی پردہ کیا ہے؟ کے بارے میں مستند دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں اپنی زینتوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:"

اے نبیؐ مومن عورتوں سے کہہ دیں کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنے اوپر ستر کی حفاظت کریں۔سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینے پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔"(۲۴)

حج اور نماز کے دوران بھی عورت کے یہ حصے پردے سے باہر ہوتے ہیں۔ان کی گفتگو پر بھی پردے کا اطلاق نہیں ہوتا وہ مختلف موضوعات پر کھل کر بات کرسکتی ہیں۔قرآن کریم نے عورتوں کو گھروں میں بند سزا کے طور پر کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:"جن عورتوں سے تمہیں جھگڑے کا خدشہ ہے تو انہیں ان کے بستروں پر الگ کردوں اور گھروں سے باہر جانے سے روک دو، لیکن اگر اطاعت کریں توان کے خلاف کارروائی نہ کی جائے۔"(۲۵)

اس آیت میں ضرب کا لفظ مارنے کے لیے نہیں بلکہ (عربی زبان کی مشہور لغت "تاج عروس" کے مطابق) قانونی اصطلاح کے طور پر روکنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔تمام بڑے بڑے آئمہ جن میں امام مالک،امام شافعی،امام ابو حنیفہ،امام ابو یوسف اور امام ابن حزم کے مطابق عورت کے چہرے اور ہاتھ کے سوا باقی تمام حصہ ستر ہے۔چہرے کا پردہ تو مولانا مودودی اپنی کتاب پردہ میں بھی ثابت نہیں کرسکے۔تو یہ آج کل نقاب و حجاب کی رسم اسلامی ہے یا علاقائی؟اس کے بارے میں بھی پورے برصغیر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔یہ وہ رسم ہے جس کو دیہاتوں کی عورتیں نہیں کرتیں اور متوسط شہری طبقے کی خواتین اپنے ایمان کا حصہ سمجھتی ہیں جبکہ امراء کی عورتیں اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں۔عورتوں کا پردہ یا برقعے میں رہنا پوری اسلامی دنیا میں ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کسی زمانے میں آزاد اور غلام عورتوں میں امتیاز کرنے کے لیے پردے کی علامت استعمال ہوتی تھی۔غلام عورتوں کی خرید و فروخت کے کاروبار میں چھان پھٹک کے لیے اسے ننگ منہ میلوں اور بازاروں میں لے جایا جاتا تھا۔آج کل کالجوں کی طالبات میں سر کے پردے کی تحریک چل رہی ہے۔اس تحریک کا مقصد مغربی قدروں کا رد اور اسلامی قدروں کا احیاء ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔یہ رسم مذہبی اور سیاسی دباؤ کے تحت اپنائی۔پروفیسر وارث میر اپنی کتاب "کیا عورت آدھی ہے"؟میں معروف عالم دین اور محقق محمد مظہر الدین کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "زمانہ حال میں مسلمانوں کے متوسط طبقات کی عورتیں جس قسم کا پردہ کرتی ہیں۔اس کا اسلام اور اسلامی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔پردے کا تعلق موجودہ طرز و طریق ایک غیر مذہبی رسم ہے۔"(۲۶)

یوں تمام مذہبی کتب میں عورت کو حقوق سے محروم نہیں کیا گیا بلکہ غلط تشریحات کے ذریعے چرچ اور دوسرے مذہبی اداروں نے بجا پابندیاں عائد کیں تاکہ وہ ذہنی غلام بن کر معاشرتی اکثریت پسند افراد کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔مذہب تو ایک ادارہ ہے البتہ عورت کی محکومیت میں مذہب سے زیادہ سیاست،معاشرت اور ثقافت کا عمل دخل ہے۔مذہب اس کا صرف ایک جز ہے۔اس کا اعتراف سبط حسن اپنی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقا" میں کرتے ہیں:"

مذہب تہذیب کا جز تو رہا ہے اور ہو سکتا ہے مگر تہذیب کا کل کبھی نہیں رہاہے۔البتہ تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں مذہب کو بہت دخل حاصل رہا ہے۔پاکستانی تہذیب کو اسلامی تہذیب سے تعبیر کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہاں کی تہذیب کے غالب عناصر کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔"(۲۷)

اسلامی تہذیب کے غالب عناصر میں ہندوازم کے گہرے اثرات ہیں جنہوں نے پدرسری نظام کے تحت پرورش پائی۔ پدرسری نظام نے اپنی جڑیں برصغیر میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں مضبوط کیں۔اس نظام نے خود کو سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی تنظیموں کی صورت میں مستحکم کرلیا۔عورت کے حیاتیاتی فرق کو برا سمجھانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کچھ منفی اصطلاحات بھی متعارف کروائیں۔جس کے تحت کاہل، بزدل اور نکمامرد بھی قابل اور فاتح ہوتا ہے اور عورت بہادر، ذہین ہو کر بھی شکست سے دوچار ہوتی ہے۔یوں عورت کی حیثیت بد سے بدترین حالت میں تبدیل ہوگئی پدرسری نظام کا تعلق صرف گھریلو معاملات تک محدود نہ رہا بلکہ یہ طاقت کا قانون تھا جس کا اطلاق گھر، دفتر، علاقے اور ملک کی صورت میں بھی لاگو ہوا۔تہذیبی اور تاریخی جبر نے عورت کی شخصیت کو مسل ڈالا۔اس کے اندر خوداعتمادی کی کمی واقع ہوئی۔جانوروں کی طرح بدسلوکی کا شکار ہونے والی عورت نے خود کو ذہنی طور پر غلامی اور فرماں برداری کا لبادہ اوڑھالیا جس سے اس میں ایک غلام کی طرح ہاں میں ہاں ملانے کی حس پیدا ہوئی۔ تانیثی تحریک پر شائستہ شریف نے اپنے مضمون تانیثیت پر اعتراض: تحقیقی اور تنقیدی جائزہ میں تین طرح کے اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ عملی اور تنقیدی سیاق میں کیے گئے اعتراضات

۲۔ تہذیبی اور معاشرتی تناظر میں کیے گئے اعتراضات

۳۔ مذہبی بنیادوں پر کیے گئے اعتراضات(۲۸)

یہی اعتراضات تانیثی تحریک کے وجود میں آنے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔تہذیبی صورت میں مرد کو فاعل اور عورت کو مفعول کہا گیا۔جس سے وہ انسانیت کے دائرہ کار سے باہر نظر آتی ہے۔مردوں پر حملہ ہو تو ہنگامی صورت حال پیدا ہوتی ہے اور عورتوں پر ہونے والے گھریلو تشدد کو عزت کے نام پر دبا دیا جاتا ہے یوں یہ عورت کو قابو میں رکھنے والی ایک خاموش تحریک ہے حتی کہ انیسویں صدی تک عورتوں کی تعلیم وتربیت کا کوئی اہتمام نہ تھا۔جدید تعلیم کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کا صرف ایک ہی واحد ذریعہ رسائل تھے جنہوں نے چاردیواری میں مقید عورت کی سوچ کا دھارا بدلا۔خاتون تخلیق کار اپنی ذات کے اثبات کے بغیر ماں، بہن، بیٹی کی حیثیت سے سامنے

آتی ہے۔یوں مردوں کے حوالے سے شناخت ہونے والے رشتے اس کی پہچان بنے۔کشور ناہید عورت کی اس پہچان کے حوالے سے کہتی ہیں:"میں کون ہوں۔۔۔۔ماں،بیوی،بیٹی اور بہن۔۔۔۔۔۔عورت کہاں ہے؟۔۔۔۔۔"[۲۹]

ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا خواتین کا ادب اور مجموعی ادب۔اس تقسیم میں بھی مردانہ تعصب پن ابھر کر سامنے آتا ہے۔مجموعی ادب کی اصطلاح مرد تخلیق کار کو فاعل اور خواتین تخلیق کاروں کو مفعول کا درجہ دیتی ہے۔خواتین کے ادب کی تخصیص ان کو انسانیت کے دائرہ کار سے بے دخل کر دیتی ہے یوں آدھی آبادی کے بغیر ادب کی تکمیل کیسے ممکن ہے۔؟تانیثیت پر اعتراضات تانیثی ادب میں تناؤ اور کشمکش کا جواز بنتے ہیں۔معاشرتی طور پر اس کی تخلیق کی نفی کرنے کے ساتھ ساتھ عورت کو ثانوی درجہ دیا گیا جس کی وجہ سے وہ عدم تحفظ کا شکار ہوئی۔عورت کی محکومیت کو قائم رکھنے میں مذہبی اداروں نے بھی فعال کردار ادا کیا۔پدرسری نظام نے عورت کو محکوم بنانے کے لیے مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔مذہبی اسکالرز کے مطابق تانیثیت ایک مغربی تحریک ہے جب کہ مزاحمت ہمیشہ روایت پسند اور مذہبی حلقوں کی طرف سے آتی ہے۔جب مردوں کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے تو وہ مذہب کو سامنے لے آتے ہیں۔مذہبی تشریحات اور تفاسیر بھی مردوں کی ذمہ داری سمجھی گئی اور زیادہ تر انہوں نے ہی کیں۔تانیثیت کی کسی ایک (ریڈیکل) قسم کو بہانہ بنا کر عورت کو آزادی سے محروم کر دینا بھی مذہبی اجارہ داری کا ثبوت ہے۔ان اعتراضات کی وجوہات مذہب سے زیادہ ثقافتی،تہذیبی اور معاشرتی ہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ عورت کی محکومیت کی ہزاروں برس کی تاریخ ہی تانیثیت کی وجہ بنی تو بجا ہو گا۔جس میں پدرسری نظام مرکزی حیثیت کا حامل ہے اسی نظام کے تحت طاقت کا مظاہرہ اپنے مقامی طریقے اور موقع محل کے مطابق کیا جاتا ہے جس میں ایک سردار کا کسان کی بیٹی کو اغوا کرنا اور ایک دفتر میں بوس کا اپنی ماتحت خاتون ملازم کو جنسی طور پر ہراساں کرنا شامل ہے۔ثقافتی طور پر عورت کو عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے جو مرد مرکز معاشرے میں عورت کی ظاہری حیثیت یہ ہے کسی خاندان سے دشمنی لینی ہو تو اس کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔عورت سے خاندان کا خونی اور نسلی تعلق ہونے کی بناء پر عورت کی پامالی خاندان کی پامالی کا باعث بنتی ہے اس لیے عورت کو یا تو قتل کر دیا جاتا ہے یا پھر چاردیواری میں قید کچھ بھی نہ بن پائے تو جرگے کے جھگڑے ختم کرنے کے لیے لڑکی کا رشتہ دشمنوں میں کر دیا جاتا ہے۔اس لیے نسائیت کو عالم گیر ثقافت کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے مقامی ثقافت کو ترجیح دینی چاہیے۔عورتوں کی تحریک نے مردوں کی بالادستی یا پدرسری نظام کو چیلنج کر دیا۔

ر۔تانیثیت:

تانیثیت ایک سیاسی، سماجی اور معاشی اصطلاح ہے۔ جس کا آغاز مغرب سے ہوا۔ اس تحریک کے ذریعے خواتین نے پدر سری قانون کے خلاف رد عمل ظاہر کیا فرانس کے ایک تخلیق کار (Alexander Dumas Flls) نے اپنی کتاب میں Feminist کا لفظ استعمال کیا۔ اجتماعی طور پر اس تحریک کا آغاز ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ فرانس میں ہوا۔ اس سے پہلے یہ لفظ فرنچ میڈیکل ٹیسٹ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں اس کو فیمنزم کا نام دیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں اس کے لیے فیمنسٹ کا لفظ بھی بولا گیا۔ یہ تحریک برطانیہ میں ۱۸۹۰ء جبکہ امریکہ میں ۱۹۱۰ء کے اوائل میں شروع ہوئی[۳۰] تانیثیت کا لفظ اردو میں سب سے پہلے شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مضمون "تانیثیت کی تفہیم" میں استعمال کیا اور تانیثی تنقید کے کچھ اصول وضوابط بھی واضح کیے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "مذکر کا مونث ہونا"[۳۱] یہ لاطینی زبان کے لفظ فے مینا سے مستعار لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب عورت ہے۔ انگریزی زبان میں یہ لفظ مخصوص معنی اور اصطلاح کے لیے بولا جاتا تھا۔ جیسے لاطینی زبان میں عورت، فرانسیسی زبان میں عورتوں کے حقوق، انگریزی زبان میں جنسی برابری کے لیے بولا جاتا رہا ہے۔ لغوی معنوں میں فیمنزم کی اصطلاح بہت وسیع ہے۔ یہ تحریک اپنی مختلف صورتوں میں مساوی جنسی اور صنفی حقوق دینے کی دعوے دار ہے۔ جس میں تمام جنسی اور صنفی طبقات شامل ہیں جن کو اس تحریک میں برابری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جن میں خواتین کے حقوق بھی شامل ہیں جو شہرت اس تحریک کو حاصل ہوئی دوسری تحریکیں اس سے محروم رہیں کیوں کہ ان تحریکوں میں صرف فرد واحد کے حقوق کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جیسے میل چوانیزم (Malechawa nism)، آزادی نسواں ، حقوق نسواں وغیرہ۔ باقی کی تحریکیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں کیونکہ ان تحریکوں کے لفظی معنی ہی محدود نہیں بلکہ یہ احتجاج کی ترجمانی بھی نہیں کرتیں۔ اس کا تعلق سماج اور سیاست سے ہے۔ یہ ایک تحریک نہیں بلکہ کئی تحریکوں اور نظریات کا مجموعہ ہے اس لیے یہ تحریک اب صرف مغربی تحریک نہیں رہی بلکہ تیسری دینا کے ممالک ایران، مصر، فلسطین، انڈونیشیا، آسٹریلیا، بنگلہ دیش اور پاکستان جیسے ممالک میں بھی قدم جمانے لگی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق:

> "Feminism is the belief in social, economic and political equality of the all sexes. Although largely originating in the West, feminism is manifested worldwide and is represented by various institutions committed to activity on behalfof women's rights and interests."[۳۲]

> "تانیثیت تمام جنسوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی برابری کا عقیدہ ہے اگرچہ یہ بڑے پیانے پر مغرب میں شروع ہوئی، دنیا بھر کے ممالک نے اس میں نمائندگی کی۔ مختلف ادارے خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم اور پر عزم ہیں۔"

پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا کی خواتین نے اپنی مختلف ورک شاپس میں فیمنزم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"Feminism means working towards achieving global gender equality .Every one isborn equal regardless of gender, race or sexuality."(۳۳)

"حقوق نسواں کا مقصد عالمی صنفی مساوات کے لیے کام کرنا ہے۔ ہر فرد جنس، نسل اور صنف کے باوجود برابر پیدا ہوا ہے۔"

انگریزی ڈکشنری "لونگ مین" میں فیمنزم کی تعریف یوں کی گئی:

"Feminism social movement that seeks equal rights for women wide spread concern for women's rights date from the Enlightenment."(۳۴)

"فیمنزم ایک معاشرتی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کی عالم بردار ہے اس کی روشن خیالی عورتوں کے حقوق کے لیے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔"

ڈاکٹر عنبرین صلاح الدین کے مطابق: "یہ اصلاح عورتوں کے لیے برابر حقوق اور قانونی تحفظ کو مستحکم کرنے کے لیے سیاسی، ثقافتی یا معاشی تحریک کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔"(۳۵)

فہمیدہ ریاض کے مطابق: "عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے کسی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔"(۳۶)

جان نثار مومن ور جینا وولف کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے: "نسائی جدوجہد کا ایک مقصد مردانہ پن اور نسائیت کے زوجی تضاد کو ڈی کنسٹرکٹ کیا جائے تاکہ عورت بھی مرد کی طرح اپنی مرضی کے مطابق زندگی کے تمام فیصلے خود کرے، انہیں اپنی مرضی پر پورا اختیار ہو۔"(۳۷)

دیویندر اسر کے مطابق:"

تانیثیت کے مخصوص معنی متعین کرنا ممکن نہیں یہ کثیر معنی تصور ہے جس میں مختلف ایشوز اور رویے شامل ہیں۔ مرد غالب معاشرہ، پدر سری نظام، معاشی استحصال، جنسی جبر، اور دہشت جیسے مسائل میں تشخص کا مسئلہ اس کا محور ہے۔"(۳۸)

مرزا خلیل بیگ کے مطابق:

"تانیثی تھیوری ایک ایسے ڈیسکورس کا نام ہے جس میں فلسفیانہ طور پر نسائی ایشوز اور مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ یہ تھیوری ان سماجی و سیاسی تحریکات سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے

جو عورتوں کے حقوق کی پاس داری کرتی ہیں خواہ ان کا تعلق ازدواجی زندگی کے مسائل سے ہو یا سیاسی و معاشی معاملات سے، یا محض سماجی نابرابری اور جنیڈر تفریق سے"(۳۹)

تانیثی تحریک کی تاریخ کا آغاز عورت کی محکومیت کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس کو ایک باقاعدہ ایک تحریک کے طور پر اٹھارویں صدی کے آخر میں لیا گیا۔ اس کی بہت سی اقسام ہیں جو دوسری ماڈرن تحریکوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے ہیں۔ میزر اینڈ سائکس کی کتاب "جینڈر اینڈ سکولنگ" میں تانیثیت کو چار اقسام روشن خیال تانیثیت، انتہا پسندانہ تانیثیت، تحلیل نفسی تانیثیت، اور شوشلسٹ تانیثیت میں بیان کیا ہے۔ جب کہ ٹانگ نے اپنی کتاب "فیمنسٹ تھاٹ" ۱۹۷۹ء میں اس کی سات شکلیں لکھیں ہیں۔ جن میں روشن خیال، تحلیل نفسی، سوشلسٹ، وجودیت پسند اور پس ساختیات ہیں۔ پس ساختیات نے یہ خیال پیش کیا کہ تانیثیت کی درجہ بندی کرنا مشکل ہے، کیوں کہ اس میں ہر وقت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں ہی عورت، نسوانیت اور تانیثیت جیسی اصطلاحات استعمال ہونے لگیں۔ تانیثیت ایک تشکیل پذیر نظریہ ہے جس نے آنے والے امکانات کو کھلے دل سے تسلیم کیا۔ اس کے مختلف رجحانات اس کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد تانیثیت کی مختلف تھیوریاں اور اقسام سامنے آئیں جن کو ماہرین نے مختلف نام دیئے۔

۱۔ روشن خیال تانیثیت:

اس کی عمارت برابری کے حقوق پر استوار ہے جس کی بنیاد سرمایہ دارنہ نظام کے تحت وجود میں آئی جب کمانے کی ساری ذمہ داری مرد پر عائد ہوئی اور عورت گھر میں بند ہونے کی وجہ سے محکومیت کا شکار ہوئی۔ جس نے شوہر کی مرضی کو غلامانہ حیثیت کے تحت اپنی مرضی قرار دیا۔ اسی صورت حال میں میری ولسٹن نے اٹھارویں صدی کی خواتین کو پنجرے میں بند پنچھی قرار دیا جو اپنی صحت، آزادی اور کردار کو شوہر کی رضا میں ڈھال لیتی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب Vindication of right of Woman A میں عورتوں کو جمہوری اصطلاحات کے تحت ووٹ، تعلیم، روزگار کے یکساں مواقع دینے کی طرف توجہ دلائی۔ اس پر مارکسی نسائیت کے اثرات بھی واضح ہوتے ہیں۔ کیوں کہ دولت نے عورت کو ایک شے اور چیز کے طور پر متعارف کروایا۔ عورت سے وابستہ عزت و عصمت کے تصور نے پدر سری نظام کو ہوا دی۔ انقلاب روس کے بعد اس تحریک نے زور پکڑ لیا۔ یہ اصلاح نسواں سے ایک قدم آگے آزادی نسواں کا رومانوی دور تھا۔ اس تحریک کا رخ مردوں کے خلاف نہ تھا بلکہ مردوں کے ساتھ عورتوں کی یک جہتی تھی۔ ابیگلا اور میری وال سٹون اس کے بانی تھے۔ اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی تک انہوں نے حق رائے دہی حاصل کی۔ اس کے بعد چار صدیوں تک یہ تحریک خاموش رہی۔

۲۔انتہا پسندانہ تانیثیت:

۱۹۶۰ء کے بعد یہ تحریک ایک نئے دور سے آشنا ہوئی۔اس تحریک کے علم برداروں نے طبقاتی اور جنسی ماتحتی کو موضوع بنایا اور عورتوں کو اس سے نجات دلانے کی کوشش کی۔شولامتھ فائرسٹون نے اس سوچ کے دواسباب بیان کیے۔عورتوں کی جسمانی کمزوری کا سبب بچوں کی پیدائش کو قرار دیا۔عورتیں عام بالغ فرد کی نسبت بے سہارا ہوتی ہیں ان کو سہارے کے لیے مردوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ان کے خیال میں محبت عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے جس سے جنسی اختلاط ممکن ہوتا ہے جو عورت کی کمزوری اور استحصال کا باعث ہے۔ان کے خیال میں معاشرے کو اپنارویہ عورتوں کے بارے مکمل طور پر بدلنا ہو گا چند ایک اصطلاحات سے کچھ نہیں ہو گا۔بنیاد پرست معاشرے کی تعمیر نو لازمی ہے کیونکہ مرد کی برتری کو سماجی اور معاشی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔یہ تحریک جنسی رشتوں میں عورت پر جبر کے رجحان تلاش کرتی ہے ان کا تقاضا ہے کہ روایتی جنسی کرداروں اور تشدد کا خاتمہ کیا جائے نیز عورت کو جنسی شے تصور نہ کیا جائے۔تحریک کی اس قسم نے مزاحمت،احتجاج اور جارحانہ انداز کو ہوا دی جس کی وجہ سے دوسری لہر ناکام ہوئی۔مذہبی پیشواؤں کا اس کے خلاف شدید ردعمل سامنے آیا۔

۳۔انارکسٹ تانیثیت:

ان کے خیال میں عملی بغاوت بہت ضروری ہے۔طاقت کے خلاف عملی جدوجہد ہی مسائل کا حل ہیں۔یہ تحریک پدرسری معاشرے کے خلاف عمل میں آئی۔

۴۔مارکسی تانیثیت:

مارکس یا سوشلسٹ نظریات کے حامی لوگ عورت کے استحصال کو مارکسی نظریات سے جوڑتے ہیں۔پیداوار ذرائع کی غیر منصفانہ تقسیم معاشرے کو طبقات میں بانٹ دیتی ہے جس سے رشتوں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اسی سے عورت کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔بعض مارکسی دانشور تانیثیت کی مخالفت بھی کرتے ہیں ان کے خیال میں اصل جدوجہد طبقات کے خلاف ہونی چاہیے۔

۵۔سوشلسٹ تانیثیت:

یہ تانیثیت کا عملی اور استدلالی نظریہ ہے جس میں انتہا پسندانہ اور مارکسی خیالات کے درمیان مصالحت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔سرمایہ داری اور جنسی عمل ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔اس لیے مارکس نے پیداواری تصورات کو جسمانی اور وجودی دو حصوں میں تقسیم کیا۔جن کو پروڈکشن اور ری پروڈکشن کا نام دیا۔ری پروڈکشن کا مطلب معاشرتی نظام پیدا کرنا ہے۔جبکہ مولوی عبدالحق کی لغت کے مطابق اس سے مراد اولاد پیدا کرنا

ہے۔ انسان مادے کی ترقی یافتہ شکل ہے جو Right is Might کے قانون کی نفی کر کے معاشرتی کشمکش کو ختم کرتا ہے۔ جن میں مرد اور عورت کے درمیان ناہمواری کو ختم کرتا ہے۔ یہ سیاسی نظریہ عورتوں کو اپنی توجہ کی طرف مبذول نہ کر سکا۔

۶۔ سیاہ فام تانیثیت:

اس شکل کا تعلق طبقاتی کشمکش، جنس، رنگ، نسل اور ذات سے ہے۔ ان لوگوں کا یقین ہے کہ ان پر زیادتی رنگ اور نسل کی وجہ سے ہوتی ہے اور تانیثیت کی کوئی بھی شکل ان کو انصاف نہیں دلا سکتی۔ سیاہ فام خواتین کے ساتھ ساتھ سفید فام عورتیں بھی ان کے حقوق دلانے کے لیے شامل ہوئیں اگرچہ اس کا آغاز بھی سفید فام نے ہی کیا۔ سیاہ فام کو آج بھی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جس کا ذکر ماما اینگلو نے اپنی تحریر "ڈینٹیسٹ اور ماما" میں کیا جس کے مطابق چار دن سے دانت کے درد میں مبتلا بچی کا علاج کرنے سے ڈاکٹر یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ: "میرا اصول ہے کہ میں کسی کتے کے منہ میں ہاتھ ڈال لوں گا لیکن کسی نیگرو کے نہیں۔"(۴۰)

۷۔ لیسبین تانیثیت:

تانیثیت کا دعوی ہے کہ جنسی تکمیل اور معاملات نجی اور انفرادی ترجیحات کا مسئلہ ہیں۔ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جنسی ضرورت کو اپنی مرضی کے مطابق تکمیل کر سکتا ہے۔ پدر سری نظام اور مذاہب اس عمل کو مخرب اخلاق کہہ کر ان لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔

۸۔ تحلیل نفسی تانیثیت:

اس قسم کا تعلق عورت کے ان ذہنی اور جذباتی عناصر سے ہے جو اب اس کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ فیمنسٹوں کا ایک حلقہ تذکیر و تانیث کی بنیاد بدنی ساخت یا حیاتیاتی فرق کو نہیں قرار دیتا بلکہ وہ اسے نفسیاتی سمجھتا ہے اس لیے وہ اس کا حل بھی نفسیات کے ذریعے تلاش کرنا چاہتا ہے۔

۹۔ جدید تانیثیت:

جدیدیت کا نظریہ سائنسی کامیابی کے مرہون منت ہے۔ سائنس غیر جانب داری سے عام تانیثی نظریات کو اکھٹا کرتی ہے ان کے مطابق فطرت عورت ہے۔ بیلی اور میکاوٗلی نے جن سائنسی طریقوں کو متعارف کروایا ان میں عورت کی فطرت پر قابو پانے کے لیے عصمت دری اور بدسلوکی جیسی بری عادات کا بھی قابل مزاحمت ہیں تاہم سائنس نے عورت کو فطرت کہہ کر اس کی حیثیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ سائنس جس بھی شکل میں ہو اس سے روگردانی کرنا ممکن نہیں۔ عورت کا منشور، تہذیب اور علم کے ذرائع کو فروغ دینا ہے۔

۱۰۔مابعد جدیدیت اور تانیثیت:

یہ اصطلاح ۱۹۸۰ء کی دہائی میں سامنے آئی۔ یہ تانیثیت کی دوسری دہائی کے رد عمل کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوئی۔ اب یہ کئی نظریات کی علامت ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ تانیثیت آج کے دور میں غیر متعلقہ ہے عورت کو اس کے تمام حقوق مل چکے ہیں۔ اس لیے یہ اصطلاح تانیثی تھیوری کو ترقی دیتی ہے۔ جس سے نئی سوچ اور فکر کی راہیں ہموار ہوئیں اور ایک نئی عورت کا تصور تشکیل پاتا ہے، جو عورت مرد سے کسی صورت کم نہیں۔ یہ عورت مہذب اور جدید تعلیم سے آراستہ ہے۔ یہ اپنے خلاف ہونے والی مذہبی، اخلاقی اور روایتی باتوں کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔ وہ خاموش بت بننے کی بجائے انسانیت کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ مرد کی حاکمیت کو نہیں مانتی جہاں پر دباؤ کا شکار ہو اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے جدیدیت اور ساختیات کو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزم کہا کیوں کہ پس ساختیات کا زیادہ تعلق تھیوری سے ہے مابعد جدیدیت کا تعلق ثقافت کے مزاج اور صورت حال سے ہے یعنی مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ مقدمات پس ساختیات سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے وہاب اشرفی دعوی کرتے ہیں کہ: ”یہ دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے بدل کے طور پر استعمال ہو سکتی ہیں۔“[۴۱] ان کے خیال میں دور جدید میں عورتوں کا مردوں میں تبدیل ہونا ممکن ہے حیاتیاتی لحاظ سے عورت بچوں کی پیدائش کی وجہ سے کمزور ہے۔ اس عمل کو عورتوں کے لیے آسان بننے کے لیے ٹیسٹ ٹیوب بی بی اور سی سیکشن جیسی سہولتیں پیدا کی گئیں۔ اس کو ماؤفیمی کہتے ہیں۔

۱۱۔ماحولیاتی تانیثیت:

یہ اصطلاح تانیثیت کو ماحول سے جوڑتی ہے۔ ان کا موقف ہے کہ پدر سری نظام اور سرمایہ دارنہ نظام نے ان کے درمیان ایک خلیج بنا دی ہے۔ اس شاخ کا تعلق سیاست کی بجائے فطرت اور روحانیت سے ہے۔ عورت اور فطرت کے درمیان تخلیقی مماثلت ہے اور یہ دونوں ہی استبداد کا شکار ہیں۔ جن میں اس کی تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کو لہریں کہا جاتا ہے ڈاکٹر سیما اصغر نے اپنی کتاب ”تانیثیت اور ادب (روایت، مسائل اور امکانات)“ میں اس کو مندرجہ ذیل ناموں سے موسوم کیا۔

الف۔ماقبل جدیدیت

ب۔جدیدیت

ج۔مابعد جدیدیت

د۔معاصر

تانیثیت کے پہلے دور پر انقلاب فرانس کے گہرے اثرات ہیں۔روشن خیال عورتیں نئے نظریات اور انقلاب فرانس کی وجہ سے پرجوش تھیں یورپی ملکوں کے ساتھ ساتھ آسٹریلیا،امریکہ اور ایران میں عورتوں کے سیاسی اور سماجی حقوق کے لیے آوازیں بلند ہوئیں۔ نپولینی ضابطہ ۱۸۰۴ء کے مطابق شوہر کو بیوی بچوں پر ایسے ہی حق حاصل ہے جیسے قانونی طور پر جائیداد پر۔بدکاری کی صورت میں بیوی پر شدید تعزیرات کا اطلاق ہو گا۔انیسویں صدی میں مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ سماجی ادارے بنائے گئے۔ان اسباب کی بناء پر اسی عہد میں خواتین نے اپنی حیثیت بیان کرنے کے لیے غلامی کا استعارہ استعمال کیااور ایران میں بدشت کانفرنس ۱۸۴۸ء میں منعقد ہوئی۔جو امریکہ کے شہر سینیکافالس (نیو یارک) میں منعقد ہوئی جس میں تین سو خواتین نے شرکت کی۔ معروف بہائی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ بھی اس کانفرنس میں شامل تھیں۔ جس کا ہدف اسلام کو بہائی فرقے میں ضم کرنا اور عورتوں کے حقوق پر آواز اٹھانا تھا اسی کانفرنس میں عورتوں کو حق رائے دہی ملا۔ "شمالی امریکہ کے بیش تر علاقوں میں ۱۹۲۰ء میں عورتوں نے ووٹ کا حق جیت لیا"[۴۲] اسی دور میں ۱۸۲۹ء میں ستی کی رسم کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ انقلاب فرانس کے نکات لکھے گئے جس میں مرد فعال عورتیں اور گھریلو ملازمین غیر فعال شہریوں کی تقسیم میں آئے۔ٹام پین کی تحریر(The Right of men)میں انقلاب فرانس کے نکات لکھے گئے جس میں مردوں کو فعال اور عورتوں کو غیر فعال قرار دیا۔سیاسی کارکنوں اور معتبرین نے اس تحریر کو چیلنج کیا۔اس کے جواب میں میری وول سٹون کرافٹ کی کتابA vindication of the right of womenلکھی۔جس میں عورتوں کو مردوں کی طرح عقل مند فضلیت والی تسلیم کیا گیا۔ جان اسٹوارٹ مل کی کتابsubjection of womenلکھی جس کا ترجمہ افتخار شیرانی نے کیا۔ جس میں مردوں اور عورتوں کے لیے برابر حقوق کا مطالبہ کیا گیا مگر اسٹوارٹ مل کے دلائل حکومت وقت کو متاثر نہ کر سکے۔کتاب ھذا کے باب اول میں ہی یہ بات کہی گئی ہے کہ صنفی تابعداری بذات خود انسانی اصلاح کے لیے رکاوٹ ہے۔اس دور میں عورتوں کے ساتھ مردوں نے بھی آواز اٹھائی۔اسی دور میں مصر کے قاسم امین،ہربرٹ اسپنسر،جان اسٹوارٹ مل،محمد عبداللہ اور سعد علول جیسی شخصیات نے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔

اس کی دوسری لہر کا آغاز ۱۹۶۰ء میں ہوا اور ۱۹۸۰ء تک برقرار رہی۔ترکی،اسرائیل میں یہ تحریک طاقت ور انداز موجود رہی۔ریڈیکل فیمنزم نے جنس کاری،عصمت دری اور عورتوں پر ہونے والے تشدد کے خلاف آواز

اٹھائی۔ یہ لوگ پدر سری نظام کو عورتوں کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اس سے معاشرتی اور ثقافتی غلامی کو نمو ملتی ہے۔ اسی دوران ہی اناث، تانیث اور مونث Feminist ,Female ,Feminine کا تصور سامنے آیا۔ اناث میں عورتوں کے سماجی اور ثقافتی کردار پر توجہ دی گئی کہ خواتین کے خیالات اور احساسات کچھ اور ہیں اور معاشرہ ان کو پیش کسی اور صورت میں کر رہا ہے۔ عورت کے جسمانی اور صنفی فرق کو حیاتیاتی حوالہ سے پرکھا گیا۔ تانیثی مرحلے میں عورت اپنے حقوق کے لیے تصادم پسندانہ رویہ سامنے آیا۔ ریڈیکل تانیثیت کے خلاف لبرل تانیثیت سامنے آئی۔ جو تانیثیت انفرادی کی حامل تھی ان کے مطابق دنیا کا کوئی بھی سماج عورتوں کو ان کے حقوق سے دور نہیں رکھ سکتا۔ حق رائے دہی، تعلیم و ملازمت کے مساوی مواقع، جنسی تشدد، جنسی تعلق کی کمیت و نوعیت، حفظان صحت، اور بچوں کی پرورش وغیرہ کے موضوعات اس کے موضوع زیر بحث رہے ہیں۔

دوسری لہر کی ناکامی کے بعد تیسری لہر آئی جس کو ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پائی جانے والی تانیثی سرگرمیاں اس تحریک کا پس منظر رہی ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں دیا جانے والا Inter Sectionality انقطاع کا تصور اسی کا سنگ میل ہے۔ اس تصور نے خواتین کو جنسی، روحانی، جسمانی، تمدنی تکثیریت کے جلووں میں پیش کیا۔ ۱۹۹۲ء کے سال کو خواتین کا سال قرار دیا گیا کیونکہ اس سال سینٹ میں چار خواتین کو جگہ ملی۔ اس دور میں جنسی تلذذ، تولید، عصمت دری، اسقاط حمل، جنسی اعضاء کے قطع وبرید وغیرہ کی سرگرمیاں تانیثی تحریک کے زیر غور رہیں۔ اس میں سیاہ فام خواتین کے حقوق پر بھی بات کی گئی۔

تانیثیت کی چوتھی لہر کا آغاز ۲۰۰۸ء سے ہوا۔ اس لہر پر نیویارک میں چلائی جانے والی تحریک Take our daughters to work to days کا گہرا اثر ہوا۔ الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ جنسی طور پر ہراساں کرنا، تولیدی انصاف، تیسری جنس کے مسائل، فیشن کی تائید، نوجوان فیمنسٹ لڑکیوں کی آمد اس رو کی خصوصیات ہیں۔

اینٹی فیمنزم: فیمنزم کا ردعمل اینٹی فیمنزم کہلاتا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ فیمنزم نے اپنے مقاصد حاصل کر لیے ہیں اب ان کا مقصد صرف مردوں پر عورتوں کی برتری قائم کرنا ہے۔ ان کی تنقید کا ہدف وہ مسائل ہیں جن میں عورتوں کو مراعات دینے کا کہا گیا ہے۔ جیسے بچے کی تولید، تحویل، طلاق اور جائیداد کے مسائل وغیرہ۔ ان کا یہ بھی الزام ہے کہ طلاق کے بڑھتے ہوئے کیسز میں سب سے بڑا ہاتھ تانیثی تحریک کا ہے۔ عورت مرد کی برابری کرنے کے لیے ملازمت جیسی جو مشقت کرتی ہے اس کی ضرورت نہیں۔

ز۔ نسوانیت، نسائیت اور تانیثیت میں فرق:

نسوانیت: یہ حیاتیاتی اصطلاح ہے جس کا تعلق عورت کی جسمانی بناوٹ سے ہے۔ جس کو عورت پن بھی کہا جاتا ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان ایسی مخصوص حیاتیاتی عضویت کی تفریق ہے جس کی وجہ انھیں دو علیحدہ علیحدہ خانوں اور درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے جسمانی خدوخال کی نقل مرد اتار سکتا ہے۔

نسائیت: اس قسم کا تعلق ثقافت سے ہے کہ معاشرہ عورت کے احساسات، جذبات اور خیالات کو کیسے بیان کرتا ہے۔ جس میں معاشرتی، معاشی، مذہبی، سیاسی اور پدری عوامل حصہ لیتے ہیں, جس کے تحت تاریخ میں عورت کو ملکیت سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا۔ اس کو دل و دماغ سے عاری سمجھتے ہوئے مردوں نے عورت کو تصبانہ انداز میں بیان کیا۔ جس میں اس کو ضمنی کرداروں سے نوازا گیا۔ نسائیت میں پدرسری نظام اپنی مضبوطی کے لیے معاشرے اور مذہب کا سہارا لیتا ہے مگر عورت کے حقیقی جذبات احساسات اور تجربات کو مرد بیان کرنے سے قاصر ہیں، کیونکہ وہ ان مراحل سے نہیں گزرے ہوتے جن کا سامنا ماں بننے کے دوران عورت کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ سماجی اور تہذیبی اعتبار سے کی جانے والی تقسیم تذکیر و تانیث کے لحاظ سے کی گئی ہے جس میں بڑی چیزوں کو مذکر اور چھوٹی چیزوں کو مونث کہا گیا ہے اس لیے مرد گھر کا سربراہ ہے وہ مذکر اور عورت اس کی ماتحت ہے تو وہ مونث کہلاتی ہے۔ نسائیت میں عورت کی حالت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ انسان ہے اور اسے انسان سمجھا جائے۔ تانیثیت: تانیثیت ایک سیاسی اصطلاح ہے جو عورت کے ساتھ کیے جانے والے سماجی ظلم کی وجہ سے مزاحمتی طور پر سامنے آئی۔ ان کے خیال میں عورتوں کی یہ حالت سماج کی پیدا کردہ ہے اور اس میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ شروع میں مادرسری نظام کی وجہ سے عورت کی حالت بہتر تھی۔ تانیثیت پدرسری نظام کو ختم کرکے مرد اور عورت کو مساوی حقوق دینے کی حامی ہے۔ اس نے عورتوں کے ادب کی تفہیم کو تانیثی تنقید کی صورت میں بیان کیا۔ وہ تجربات، خیالات اور احساسات جو عورت کی جسمانی ساخت گھریلو ماحول اور مخصوص پرورش کا نتیجہ ہیں نسائیت کے زمرے میں آتے ہیں جبکہ تانیثیت حیاتیاتی جبر کو رد کرتی ہے سماج کی طرف سے عائد کردہ مروجہ حیاتیاتی اور سماجی پابندیوں کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔

ا۔ تانیثیت کا عالمی تناظر:

۱۵ اکتوبر ۱۷۸۹ء میں پیرس کی عورتیں برتن لے کر بازار میں جمع ہوئیں اور غذائی قلت کے خلاف نعرے لگائے۔[۴۳] اسی انقلاب نے ہی نئے نظریات اور افکار پیدا کیے جن میں نیشنل ازم، سیکولرازم، سوشل ازم اور فیمنزم شامل ہیں۔ ان افکار نے نئی راہوں کو ہموار کیا۔ اسی انقلاب کی وجہ سے چرچ اور سنسر شپ کی پابندیاں بھی اٹھ گئیں

اور تخلیق کاروں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔۱۷۹۱ء میں چارلس مورل نے فرانس کی قومی اسمبلی میں مردوں کی تعلیم کا خاکہ پیش کیا اور عورتوں کو گھر تک محدود رہنے کی تلقین کی۔اس کے خیال میں یہ مردوں کی دنیا ہے اور انہوں نے ہی اس کی باگ دوڑ سنبھالنی ہے۔اس کے رد عمل کے طور پر A vindication of women right کے نام سے ایک پمفلٹ شائع ہوا۔ جس میں عورت کو ملک اور سماج کا لازمی حصہ قرار دیتے ہوئے اس کے حقوق کے لیے آواز بلند کی گئی۔میری وال سٹون کی کتاب A Vindication of the rights of men جو ایڈمنڈ برک کی تحریر کے جواب میں لکھی گئی جس کا نام Reflection on the revolution in France تھا۔اس کے خیال میں انقلاب اچھا نہیں ہوتا اس کی وجہ سے شہریوں کو حقوق نہیں ملتے۔بعض مضامین میں A vindication of the rights of men کے جواب میں A vindication of women right کو کہا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے۔جیسے پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون "بیسویں صدی میں خواتین اور ادب" اور انور پاشا کے مضمون " ادب اور تانیثیت "میں یہ غلط فہمی عام پائی جاتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد خواتین کو سیاسی اور حکومتی ذمہ داریاں دی جانے لگیں اس سے پہلے انہیں بالکل کمتر عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا۔فرانس میں عورت کو ووٹ کا حق ۱۹۴۴ء میں ملا جس کے پانچ سال بعد سائمن دی بوا کی کتاب Second Sex منظر عام پر آئی۔ جس میں عورت کے بارے میں نظر ثانی کرنے کی تحریک دی گئی۔ یہ کتاب دو اہم ترین زاویوں پر بحث کرتی ہے:

۱۔ عورت کو ہمیشہ غیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے

۲۔ نسائیت مردوں کا گھڑا ہوا تصور ہے۔

یہ کتاب فرانسیسی زبان میں تھی جس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کیا گیا۔اس تحریک نے سب سے زیادہ مقبولیت فرانس ہی سے حاصل کی اور اس کے مختلف روپ بھی یہاں سے ہی نمودار ہوئے۔ جیسے دنیائے ادب و فلسفہ کو پس ساختیات اور رد تشکیل کا نظریہ دینے والے دریدا کا تعلق بھی فرانس سے ہی تھا۔اس کے فلسفے نے تانیثی تھیوری وضع کرنے والوں کو بھی متاثر کیا جس میں کئی خواتین مصنفین (جوالیا کرسٹیوا، ہیلن کسکاؤس اور لوسی گرے) بھی شامل تھیں۔ ان مصنفین نے نسوانیت کے ساتھ مخصوص کر دیئے گئے عیوب اور منفی خصوصیات کو توڑنے کی کوشش کی۔ جیسے ہسٹریا جیسی بیماری کو عورت کی خوبی کہا جاتا تھا۔ دریدا نے Phallogocentrism کا نظریہ وضع کیا۔وہ عورتوں پر مردانہ تفوق اور برتری کا قائل تھا۔ فرانسیسی تحریک گزاروں نے اس نظریے کو چیلنج کیا۔ لوسی ایری گرے نے لسانیات اور تحلیل نفسی پر گہری نظر ڈالی۔ ہیلن کسکاؤس کی کتاب The Lugh of Medusal تانیثی مضامین میں اہم حیثیت کی حامل ہے اس نے جنسیاتی شناخت کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کی

روایت کو رد کر دیا۔ فرانس میں سر گرم فرانسیسی تحریک ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئی۔ اسی سال فرانس میں women's liberation movement شروعات ہوئیں۔ خواتین نے اسقاط حمل اور منع حمل کی ادویات کے استعمال پر زور دیا۔ ۱۹۶۷ء میں ان ادویات کی فروخت قانونی طور پر جرم تھی۔ اس تحریک کی اہم اراکین نے مل کر ایک گروپ تشکیل دیا۔ جس نے اسقاط حمل کے صحیح طریقوں پر زور دیا۔ خاندانی منصوبہ اور اسقاط حمل پر زور دیا گیا۔

امریکہ میں تانیثیت: ۱۹۰۰ء انیسویں صدی میں امریکہ میں غلامی سے خاتمے کے لیے Abolition movement چلی جس نے تحریک نسواں کو بھی تقویت دی۔ کیونکہ مردوں کے تشدد کو غلامانہ زندگی کے مشابہہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں لوسی اسٹون الزابتھ اور سوزن بی مشہور ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں امریکی مخالف غلاموں کی حمایت کی ایک سوسائٹی تشکیل دی گئی جس میں ۲۰ خواتین نے شرکت کی اس مقصد کے لیے انہیں علانیہ طور پر دستخط کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس سوسائٹی کے اولین مقررین میں سے سارہ، انجلینا اور گرمگے کے نام مشہور ہیں۔ انھوں نے پہلے گروہ اور بعد میں اجتماعات سے خطاب کیا۔ ۱۸۴۰ء لندن میں مخالف غلامی کنونشن منعقد ہوا، جس میں انہوں اگلی نشستیں نہ مل سکیں۔ امریکی صحافی مارگریٹ فلر نے تانیثیت کو بنیادیں فراہم کیں اس کی کتاب (1843) Women in nineteen century شائع ہوئی۔ ۱۸۴۸ء کو نیو یارک پارک میں خواتین نے ایک قرارداد منظور کی جس کا نام Declaration Rights and Sentiments تھا۔ اس قرارداد میں ایک طاقت ور عورت کا تصور پیش کیا گیا۔ الزابیتھ اور اسٹون نے مل کر ۲۱ افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے چرچ اور بائبل میں خواتین کے خلاف ہونے والی غلط تشریحات کا جائزہ لیا گیا۔ انہوں نے مل کر خواتین کی بائبل کے نام سے دو جلدوں پر مشتمل تشریح و تفسیر بھی لکھی۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں Sisterhood is powerful کا نعرہ بہت مشہور ہوا۔ Ardre lorde اڈرے لارڈ نے اس کے مشہور ہونے کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی: "نسلی تفاوت، جنسیت، طبقاتی اور عمروں کی تفریق کے باوجود یہ رجحان ان تفرقات کو برداشت کرنے کی حمایت کرتا ہے۔"(۴۴)

۱۸۶۹ء لوسی اسٹون نے جولیا وارڈ ہو اور جوسفن رفین کے ساتھ مل کر بوسٹن میں American women sufferage association کی بنیاد رکھی۔ اس نے بیس سال تک ایک تانیثی رسالے کی ادارت بھی کی۔ ۱۶ء صدی تک برطانیہ میں تعلیم نسواں کو کوئی فروغ نہ تھا۔ لڑکیوں کو ثانوی درجے تک تعلیم دی جاتی تھی جبکہ لڑکوں کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کے دور میں تعلیم نسواں پر زور دیا گیا۔ ۱۸۱۳ء میں ایملی ڈیوس نے بادشاہ کے گھوڑے کے سامنے آکر خود کشی کر لی۔ تحریک نسواں کی حامی خواتین کو جیل میں بند کر دیا گیا اور ان کے خلاف مقدمے چلائے گئے۔ اس وقت کئی دوسرے ممالک میں خواتین حقوق حاصل کر چکی تھیں۔ برطانیہ میں

مسلح افواج میں جنسی امراض پھیلنے کے حوالے سے تشویش کے تناظر میں ۱۸۶۰ء کی دھائی کے دورانContagious diseases actمنظور کیا گیا۔ان قوانین کو فوجی تعصبات والے علاقوں پر لاگو کیا گیا۔پولیس اور مجسٹریٹ جسم فروش خواتین کو گرفتار کرنے لگے کہ وہ جان سکیں ایسی عورتیں کسی جنسی مرض میں تو مبتلا نہیں۔انہیں ہر حال میں ہسپتال میں بھیج دیا جاتا۔اس قانون کا اطلاق صرف خواتین پر ہی لاگو ہوتا تھا۔خواتین نے اس قانون کے خلاف مہم چلائی اور اس کو مزاحمت کے ذریعے ختم کروایا۔یہاں کی خواتین فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔انہوں نے حکومت سے مساوی تعلیم، ملازمت اور تنخواہ کا مطالبہ کیا۔۱۸۶۹ء میں جان اسٹوارٹ مل کی تصنیفThe Subjection of womenنے عورت کی سوچ کو وسعت بخشی۔اس کتاب میں ان روایات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا جس کے تحت عورت کو کم تر سمجھا جاتا تھا۔آکسفورڈ اور کیمبرج میں خواتین کے کالج قائم ہوئے۔شادی شدہ عورت کو حق وراثت اور شوہروں کی معاشی غلامی سے نجات ملی۔۱۸۹۷ء میں حق رائے دہی کی سرگرم تحریکوں نے خواتین کے حوصلے کوMillicent Fawcentنے تقویت بخشی۔ National Union of women suffrageکا قیام عمل میں آیا۔اس یونین کی خواتین پرامن احتجاج پر یقین رکھتی تھیں۔انہوں نے دلائل پیش کیے کہ اگر خواتین سکولوں میں اعلیٰ منصب کے فرائض سرانجام دے سکتی ہیں تو ووٹ دینے کی اہل کیوں نہیں، جبکہ پارلیمنٹ قانون بناتی ہے تو یہ قانون مردوں اور عورتوں دونوں پر لاگو ہوتا ہے۔

جرمنی میں خواتین کا سیاسی اجلاس / سیاسی پارٹی میں حصہ لینا یا شمولیت اختیار کرنا خلاف جرم سمجھا جاتا تھا۔سوئزرلینڈ میں لمبے عرصے تک خواتین کو ووٹ کا حق نہ ملا لہٰذا احتجاج کے ذریعے ووٹ کا حق حاصل کرنے والی خواتین کے لیے کاSuffragetteلفظ استعمال کیا گیا۔

۲۔تانیثیت کا مشرقی تناظر:

یورپ، امریکہ اور برطانیہ باقی ممالک سے بہت آگے تھے انہوں نے طاقت کے بل بوتے پر لاطینی امریکہ ،افریقہ ،ایشیا اور مشرق وسطیٰ ممالک پر ناجائزہ قبضہ کر لیا۔ان ممالک کی خواتین کی زندگیاں نوآبادیات اور جدید نوآبادیاتی نظام سے بری طرح متاثر ہوئیں۔ان ممالک کے لیے تیسری دنیا کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ان ممالک کی غلامی نے نسلی اور طبقاتی ناہمواریاں پیدا کیں۔لاطینی امریکی ممالک میں اس آمریت کے خلاف پرآشوب دور نے جنم لیا عورتوں نے ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۸ء تک کی جدوجہد میں عملی طور پر حصہ لیا۔اس وقت انہوں نے خود کو ایک عورت کی بجائے ایک سپاہی کے طور پر پیش کیا۔کیتھولک چرچ عورتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھا جس کے تحت ان کو بہت کم

تنخواہیں ملتیتھیں۔ غربت، حفظان صحت کی نامناسب سہولیات کی بناء پر زچگی کی شرح اموات میں اضافہ ہوا۔ یہ عورتیں جنسی استحصال کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنتی رہیں۔ ۱۹۵۵ء میں بیجنگ میں گلوبل کانفرنس منعقد کروائی گئی ان ممالک کے مسائل کے بارے میں ایک خاتون نے کہا: "مغربی تانیثیت کے مسائل کو مثال کے طور پر جنوبی امریکہ کی خواتین پر لاگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے معدے کی تکلیف کا سر درد کی گولی سے علاج کرنا۔"(۴۵)

مسلم ممالک میں خواتین کے پردہ کرنے کے مسائل متنازع اور پیچیدہ صورت حال اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جس کی حمایت اور مخالفت کی جاتی ہے۔ سعودی عرب میں جبری پردہ کروایا جاتا ہے عورت محرم کے بغیر بازار نہیں جاسکتی۔ ایرانی خواتین کی خود مختاری کی لمبی داستان ہے۔ ۱۹۷۸ء کے اسلامی انقلاب میں خواتین کافی پرجوش تھیں۔ خواتین نے انجمنیں قائم کیں۔ اس وقت حکومت کا عورتوں کے متعلق سرکاری رویہ کافی سخت ہو گیا تھا۔ ایرانی عورتوں کی قابل رحم حالت زار پر ایک مجلہ " Shortcoming of men" جاری کیا گیا۔ آیت اللہ خمینی نے عورتوں پر سختیاں مزید بڑھا دیں۔ سرکاری دفاتر میں کام کرنے والی خواتین پر حجاب کی پابندی عائد کی گئی۔ خواتین ججز کو برطرف کر دیا گیا۔ خاندانی تحفظ کا قانون واپس لے لیا گیا۔ عورتوں کو خلع کے حق سے برطرف کیا گیا۔ ۱۹۹۰ء کے وسط تک خواتین نے خود کو منوانے کی کوششیں جاری رکھیں "۱۹۹۸ء میں ایران کی یونی ورسٹی میں خواتین طالب علموں کی تعداد باون فی صد ہو گئی"(۴۶) خواتین قیدیوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی جاتی۔ بہت سے گروہوں نے اسلامی تانیثیت کو لاگو کرنے حمایت کی کیونکہ مشرقی یورپ اور روس کی خواتین مغربی تانیثیت کے حق میں نہیں۔ تاہم انقلاب نے خواتین کی کم ہی مدد کی ہے۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء میں آیا۔ کارکنوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ چند ہی ماہ میں کارکنوں نے لینن کی سربراہی میں حکومت کو گرا دیا۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۷ء میں خواتین کا عالمی دن منایا گیا۔ قاسم امین کو عرب دنیا کا پہلا تانیثی مفکر مانا جاتا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے پردے، کم عمری کی شادی، سماجی زندگی سے دوری اور کم تعلیم جیسے مسائل پر تنقید کی۔ مصر کی پہلی یونی ورسٹی کے بانی بھی تھے۔ ان کی تصانیف "المرۃ" ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء میں "المرۃ جدید" ہیں۔ ان کتابوں میں انہوں نے قرآنی آیات کے حوالے سے اپنے موقف کو واضح کیا۔ مصری کارکن جسیم امین نے انگریزی کتاب "Freedom of Women "کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس پر مذہبی حکمرانوں نے سخت پابندی عائد کر دی۔ ۱۹۲۳ء میں شرآوی ایک مصری سیاست دان کی بیوی نے ایک دورے سے واپس آتے ہوئے سرعام اپنا نقاب اتار پھینکا۔ لبنانی خاتون نازرازین نے حجاب کو مردوں اور عورتوں کی توہین کہا۔ جس کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ مصری خواتین نے ہی ۱۹۱۹ء میں برطانوی حکومت کے خلاف شورش میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۳ء میں ہدی شعراوی نے مصری فیمنسٹ یونین کی داغ بیل ڈالی۔ اس نے وویمن سفریج الائینس

میں فعال کردار ادا کیا۔یورپی ممالک سے دوستیاں قائم کیں۔یہ تانیثی جریدے کی مدیر بھی رہیں۔جس کا اجراء ۱۹۲۵ءمیں ہوا۔سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے بھی عورت پیچھے رہ گئی۔نوکری کی تلاش میں دوسرے ممالک جانے والی خواتین کی حالت بھی ابتر تھی۔ان کو مقامی زبان اور ہنر مندی نہ ہونے کی بناء پر لیبر کا کام دیا جاتا جس کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر تھا۔اکثر اوقات ان کو جسم فروشی پر مجبور کر دیا جاتا۔اکثر خواتین کو فلپائن،امریکہ اور جاپان کے ڈاک خانوں کے ذریعے بطور دلہن بھرتی کیا جاتا جہاں سے ان علاقوں کے مرد خرید کر لے جاتے تھے۔اسی نظام نے عورت کو تمباکو نوشی کا عادی ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو اشتہار کے طور پر بھی استعمال کیا۔میڈیا نیٹ ورک کو استعمال میں لا کر ایک ڈرامائی تشہیر کے ذریعے پرانے دستور کو توڑا گیا اور تمباکو نوشی کو خواتین کی آزادی کی علامت قرار دیا گیا۔ہالی ووڈ سٹارز تک سگریٹ کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا یوں شمالی امریکہ اور یورپ میں عورتوں کا سگریٹ نوشی کرنے کا عمل پسندیدہ قرار دیا گیا۔"تمباکو نوشی کی شرحیں ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے درمیان ۷۲ فی صد سے بڑھ کر ۷۴ فی صد ہو گئیں۔"[۴۷]یوں عورتوں کو مختلف قسم کی سازشوں کے جال میں ماڈرن ازم کے نام پر بھی پھنسا دیا گیا۔ہندوستان کا شمار بھی نو آبادیاتی ممالک میں ہوتا ہے جہاں پر اورنگ زیب عالم گیر تک فارسی زبان راج کرتی رہی۔سنسکرت محدود ہو گئی مغربی ادبیات سے واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی۔انگریزوں نے اپنے تسلط کے دوران انگریزی زبان لاگو کر دی۔رگ وید اور منو سمرتی عہد میں مرد وزن کا صنفی فرق موجود تھا مگر انگریزوں نے تعلیم میں اس فرق کو روا نہ رکھا۔دوسری جنگ عظیم کے ثمرات کی طرح انگریزی حکومت عورتوں کے حق میں بہتر ثابت ہوئی،جس نے نئے زرعی اور صنفی نظام متعارف کروائے۔اس وقت مغرب میں تانیثیت کا آغاز ہو چکا تھا مگر ہندوستان کی عورت پسماندہ تھی۔وہاب اشرفی کے مطابق:

> "مغرب میں نسائی تعلیم کا فروغ ہو چکا تھا بلکہ بعض معاملات میں عورتیں اس طرح آگے بڑھی تھیں کہ ان کے مقابلے میں ہندوستان کی عورت کھڑی ہی نہیں ہو سکتی تھی۔"[۴۸]

ہندوستان میں ہندوانہ رسم و رواج کا غلبہ تھا جس کے اثرات دوسری قوموں پر بھی پڑے جن میں مسلمان بھی شامل تھے۔ان کی کچھ رسم و رواج نے تو انگریزوں کو بھی چونکا دیا۔جیسے "ستی" کی رسم جس میں شوہر کی وفات پر بیوی کو بھی زندہ جلا دیا جاتا تھا۔لڑکیوں کو منحوس سمجھا جاتا تھا ان کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ایک زمانے تک یہ اپنی ضد کی وجہ سے عورتوں کو تعلیم نہیں دیتے تھے۔ایسا رویہ عام افراد کے علاوہ امیر اور پڑھے لکھے طبقے میں بھی عام تھا۔مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "مسلمان عورت" میں بھی عورت کو کمتر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے مطابق عورت کا کاروبار میں حصہ لینا اس کے فطری جذبات کو کچل دیتا ہے۔اس بات میں کوئی شک

نہیں کہ ہندوستان میں مذہب کے نام پر پائی جانے والی رسم ورواج کی پکڑ مضبوط تھی۔ڈاکٹر آمنہ تحسین نے اپنی کتاب "مطالعات نسواں" میں ہندوستان کے اندر پائی جانے والی آٹھ اہم ترین سماجی اور مذہبی برائیوں کا ذکر کیا ہے جن میں بچیوں کا قتل، کمسنی کی شادی، تعدازدواج، سخت پردہ، تعلیم کا فقدان، دیوداسی نظام اور مشترک کنبوں کا نظام شامل ہے۔(۴۹) ایسے معاشرے میں مذہبی نظریات کی صحیح تشریح وتفسیر ضروری ہے۔کیونکہ برصغیر کی تاریخ میں ایک طرف علماء عورتوں کی آزادی اور پردے کے خلاف تھے تو دوسری طرف ان نظریات کے حامی لوگ پیدا ہوئے۔مولوی محب حسین نے حیدرآباد میں خواتین کی ترقی کی اولین کوششیں کیں۔جس میں مختلف مکتبہ فکر اور مذاہب کے لوگ شامل تھے مولوی صاحب نے تعلیم نسواں، آزادی نسواں اور پردے کے خلاف تقاریر کیں اور اپنے رسالے "معلم نسواں" کو ایک محاذ کے طور پر استعمال کیا۔اس رسالے کے ذریعے کئی افراد تعلیم نسواں کے ساتھ جڑ گئے۔ اسلامی سوسائٹی پر بھی اس کے اثرات مرتب ہورہے تھے مخالف مکتبہ فکر کے مولوی صاحب نے کہا:"مسلمان عورتیں اس وقت تک تعلیم یافتہ نہیں ہوں گی جب تک پردہ ترک نہ کردیں۔ان کے خیال میں یہ شرعی پردہ نہیں ہے۔"(۵۰) اسی صورت حال میں ایک عام آدمی شش وپنج کا شکار ہوجاتاہے کہ کون ٹھیک کہہ رہاہے اور کون غلط۔اصلاح معاشرے کا اولین مقصد تعلیم نسواں تھا جو کہ ناپید تھا۔اس دور میں ہندوستان میں تعلیم کا کوئی اہتمام نہ تھا مشنری سکولوں کے دھڑا دھڑ قیام سے لوگوں کے اندر مشنری تعلیمات کا خوف گہرا ہوتا جارہا تھا وہ اپنے بچوں کو عیسائی تعلیم نہیں دینا چاہتے تھے انیسویں صدی تک صرف اعلی طبقے کے چند ایک خاندان ہی تعلیم یافتہ تھے۔عورتوں کی تعلیم تو دور کی بات ہے۔سماجی اصلاح کاروں کے دو گروپ تھے۔

۱۔حریت پسند گروپ

۲۔احیاء پسند گروپ

ان سماجی اصلاحی ارکین میں راجہ موہن لال، کیشوچندراسین، ایشورچندردیاساگر اور شیخ محمد عبداللہ شامل ہیں۔انہوں نے عورتوں کے لیے سماجی کمیٹیاں قائم کیں۔راجہ موہن لال کی سالی کو ستی کی بھینٹ چڑھایا گیا تو اس نے اس ظالمانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی۔ان کی کوششوں سے ہی اس رسم کو قانونی طور پر کالعدم قرار دیا گیا۔ایشورودیاساگر نے عورت کو زندہ لاش بننے سے اپنی کتاب "بیواؤں کی شادی" لکھ کر بچالیا۔دیانند نے تعلیم کو لازمی قرار دیا۔اصلاحی تحریک میں مردوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس میں تعلیم نسواں کا فروغ اور فرسودہ رسم ورواج کے خلاف محاذ آرائی کی گئی۔ہندووں کے بعد مسلمانوں نے جدید تعلیم کی طرف اپنی توجہ مبذول کی کیونکہ مسلمان مغربی تعلیم کو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد زیادہ تر ملازمتوں سے فائدہ

ہندوؤں نے اٹھایا کیونکہ مسلمان صرف مکتب اور مدرسہ تک محدود تھے۔اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی نے مختلف تحریکوں کو ہوا دی۔ ہر تحریک نے عورت کو مختلف زاویوں سے دیکھا۔ان تحریکوں میں مماثلت تو نہیں پائی جاتی تھی البتہ مزاحمت ضرور سب میں موجود تھی۔ان میں دو اہم ترین تحریکیں بھگتی تحریک اور سرسید تحریک تھی۔ بھگتی تحریک ایک تحریک نہیں تھی بلکہ کئی تحریکوں کا مجموعہ تھی۔اسی تحریک نے ہندوستان میں جدیدیت کے عمل کی راہ ہموار کی۔اس تحریک کے پس پردہ بھی پدر سری نظام کار فرما ہے اس کی مشہور شاعرہ میرا بائی تھی جو اپنے شوہر کی باتیں سنتی ،مار کھاتی پھر بھی اس کے گن گاتی تھی۔میرا بائی کا کردار ایک عام ہندوستانی عورت کا کردار ہے جس پر شادی مسلط کی گئی عقیدت ،وابستگی کی وجہ سے وہ قربانی دیتی ہے اپنے شوہر کو چھونے نہیں دیتی یہ سوچ کر وہ کسی اور کی امانت ہے دوسری طرف اپنے شوہر کی دوسری بیوی سے حسد بھی کرتی ہے یہ عورت اپنی ذات کو کچلنے کی وجہ سے محرومیوں کا شکار ہے۔دوسری تحریک سرسید تحریک تھی جو سب سے زیادہ متحرک اور بارآور تحریک ثابت ہوئی۔اس وقت سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء خواتین کی تعلیم کو قبل از وقت سمجھتے تھے۔ان کے خیال میں مرد کے مہذب ہونے سے پہلے عورت کو تعلیم دینا ایک وبال ہے۔مسلم معاشرے میں پہلے مرد تعلیم یافتہ ہوں گئے بعد میں عورتیں،انہوں نے ایک گروپ تشکیل دیا جس نے عورتوں کی اصلاح پر توجہ دی جس میں سجاد حیدر یلدرم، شیخ محمد عبد اللہ، غلام ثقلین اور ممتاز علی شامل ہیں۔یہ سب علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے اس کے بعد روشن خیال اور تعلیم یافتہ افراد کا رواں بنتا گیا۔۱۹۰۶ء میں All Indian Muslim Ladies conference منعقد کی گئی جس کی صدارت بیگم بھوپال جہاں نے کی۔اس اجلاس میں شریک خواتین میں عطیہ فیضی، صغرا ہمایوں، نذر سجاد حیدر، جہاں آرا، بیگم شاہ دین اور زہرا فیضی تھیں۔تعلیم نسواں کو فروغ دینے میں اردو ادب نے اہم کردار ادا کیا۔اس دور میں لکھے جانے والے افسانوں اور ناولوں میں سماجی مسائل کو اجاگر کیا گیا۔ بیسویں صدی میں تحریک آزادی اور حقوق نسواں ساتھ ساتھ چلے۔تنویر انجم ہندوستان میں تانیثی ادب کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔جس میں اصلاحی نسائیت، روشن خیال نسائیت، ترقی پسند نسائیت، اور انقلابی نسائیت ہیں۔

پہلا دور اصلاحی دور تھا جو ہندوستان کے امیر طبقے کے افراد پر مشتمل تھا۔ان کی کوشش تھی کہ عورتوں کے حالات میں بہتری پیدا ہو اور غیر مساوی قوانین کا خاتمہ ہو۔تاہم اس تحریک کا مقصد پورے معاشرے کے لیے انقلاب لانا نہیں تھا۔اس لیے مسلمانوں نے اس تحریک کو اچھا نہ سمجھا۔اردو ادب میں اس تحریک کے اثرات سرسید اور ان کے رفقاء کی تصانیف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ان میں ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "مراۃ العروس" ہے جسے آج کے دور کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں پرانی اقدار کے ساتھ ساتھ مردانہ برتری کا عکس بھی نظر آتا

ہے۔یہی اصلاح مرزاہادی رسوا کے ناول ”امراؤجان ادا“ میں پائی جاتی ہے۔جاگیر دارانہ معاشرے میں مرد کو اعلی وارفع مقام حاصل تھا۔اس معاشرے کے افراد ان اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لانا چاہتے تھے جبکہ دوسری طرف مغربی خیالات وافکار نے جاگیر دارانہ معاشرے کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ان تبدیلیوں نے قدیم اقدار کے حامی افراد کو متحرک کر دیا یہ حضرات معاشرے میں تبدیلی خاص طور پر عورت کے مقام کو بدلنے کے حامی نہ تھے انہوں نے اس کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔ان میں مولانا اشرف علی تھانوی بھی تھے جنہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے جاگیر دارانہ نظام کی بگڑتی ہوئی کیفیت کو مذہب اور اخلاق کے سہارے سے بہتر بنانے کی سعی کی۔انہوں نے عورتوں کی تربیت کے لیے ”بہشتی زیور“ کے دس حصے لکھے۔تاکہ عورتیں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مرد کی افضلیت کو تسلیم کریں۔اس کتاب میں عورت کو ایک اچھے غلام بننے کے تمام گر بتائے گئے ہیں۔وہ بیوی کا مقصد حیات شوہر کی خوشی قرار دیتے ہیں۔مولانا عورتوں کی مذہبی تعلیم کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کے خلاف تھے۔انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ عورتوں کو کون سی کتابیں پڑھنی چاہیں اور کونسی نہیں۔یہ کتاب ہندوستان کے جاگیر دارانہ نظام کی مکمل عکسی کرتی ہے۔اصلاح نسواں سے نسائی تحریک نے آزادی نسواں کا سفر طے کیا۔ہندوستان پر مغربی اقدار کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔اس کا مقصد پدرسری نظام کو توڑنا نہیں بلکہ اعلی طبقے کی اقدار کو اپنا کر ترقی کرنا ہے۔یہ لوگ انقلاب اور بنیادی تبدیلی کے حق میں نہیں ہیں۔اس کے باوجود ان کا شمار انقلابی لوگوں میں ہوتا ہے۔قرۃالعین کا شمار بھی اسی طبقے میں ہوتا ہے۔اس ادب کے پیروکار نے ناسٹلجیا،انگریزی طبقے کی روایات سے ہمدردی اور درمیانے طبقے کے مسائل کو اہمیت نہ دینا ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔یہ سب روشن خیال افراد ہیں۔جیسے محمد علی جناح،جواہر لال نہرواور گاندھی جنہوں نے ہر شعبے سے وابستہ عورت کے لیے تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ان پر مارکسی نسائیت کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔مارکسی نسائیت کی بنیاد مارکس اور انیگلز کے نظریہ خاندان پر استوار ہے۔دولت کے بٹوارے کے دوران طبقات نے جنم لیا جن میں عورت بھی ایک شے اور چیز کے طور پر متعارف کروائی گئی۔عورت سے وابستہ عزت وعصمت نے پدرسری نظام کو جنم دیا۔انیگلز کے مطابق عورت کا استحصال اور ظلم خاندانی دباؤ کا نتیجہ ہیں۔عورت پر تشدد ان کے خاندان کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔اردو کے تمام ترقی پسند افراد مارکس کے فلسفہ خاندان کو ماننے والے ہیں اور ان کی تحریریں اسی نظریے کا عکس ہیں۔انقلاب روس کے بعد اس تحریک نے زیادہ عروج پکڑا۔ان کے حامی مشہور مصنفین میں منٹو،بیدی،کرشن چندر کی تحریریں ہیں۔ان کا ایک منشور طبقاتی کشمکش کے خلاف آواز اٹھانا بھی ہے۔حقوق نسواں کے تمام مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ طبقاتی ناہمواری کے ختم ہونے کے ساتھ ہی عورت کے مسائل بھی ختم ہو جائیں گے۔تاریخی

حقائق نے ثابت کیا کہ غیر طبقاتی معاشرے میں عورت کے مسائل جوں کے توں ہی ہیں لہذا ان کا یہ نظریہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ چوتھا دور انقلابی نسائیت کا دور ہے جس میں حقوق نسواں کا کھلم کھلا اظہار کیا گیا ہے۔ اس دور میں پدر سری اور طبقاتی نظام کا خاتمہ اور مردانہ برتری سے انکار کیا گیا ہے۔ ان مصنفین میں عصمت چغتائی، رقیہ سخاوت حسین اور سیتا کا اگنی کے خلاف بولنا شامل ہے۔

i۔ پاکستان میں تانیثیت:

تحریک پاکستان کے وقت عورتیں گھر کی چار دیواری کی حد تک محدود تھیں ان کا گھر سے باہر جانا اور تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو تحریک خلافت کی وجہ سے دو سال کی قید بامشقت سنائی گئی تو ان کی والدہ نے بیٹے کو معافی مانگ کر باہر آنے سے منع کیا اور ان پڑھ ہونے کے باوجود بی اماں نے تحریک خلافت چلانے کے لیے میدان عمل میں آئیں۔ بی اماں کے ہمت اور حوصلے کو دیکھ کر بیگم محمد علی بھی تحریک آزادی کی جنگ میں کود پڑیں۔ اس کے بعد قیام پاکستان کی تحریک میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۲۸ء میں قائداعظم نے مسلم لیگی خواتین کی کمیٹی بنانے کا حکم دیا۔ ان کو خواتین کی سیاسی حمایت اور مسلم لیگ میں شمولیت کرنے کی اہمیت کا بخوبی علم تھا اسی لیے انہوں نے ۱۹۴۴ء میں اپنی تقریر میں کہا:

> "یہ انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے کہ ہماری عورتیں گھروں کی چار دیواری میں قیدیوں کی سی زندگی بسر گزاریں۔ ہماری عورتیں جن شرم ناک حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اس کا کوئی جواز نہیں۔ آپ اپنی عورتوں کو زندگی کے ہر شعبے میں کامریڈ کی طرح ساتھ لے کر چلیں۔ "(۵۱)

ہندوستان کے ہر صوبے سے خواتین کی تنظمیں لائحہ عمل میں آئیں۔ جن کی صدارت قیام پاکستان تک لیڈی ہارون نے کی۔ ان تنظیموں کی خواتین نے تحریک پاکستان میں قید ہونے والے افراد کی رہائی کی جدوجہد، مسلم کے اجلاس میں شرکت، مزاحمتی جلوس، بنگال کے قحط زدہ لوگوں کی مدد کرنا شروع کی۔ ان خواتین میں بی اماں، بیگم محمد علی جوہر، محترمہ فاطمہ جناح، بیگم شاہ جہاں، بیگم رعنا لیاقت علی خان، سلمی تصدق حسین اور شائستہ اکرام اللہ جیسی متعدد خواتین شامل تھیں۔ ان تنظیموں میں سب سے زیادہ متحرک پنجاب کی خواتین تھیں۔ پروفیسر وارث میر کے مطابق: "تحریک پاکستان کی داستان میں پنجاب کی چند خواتین کو خارج کر دیا جائے تو دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والی تین چار خواتین ہی باقی بچتی ہیں۔ "(۵۲)

فروری ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک چلائی جس میں خواتین نے مردوں کے ساتھ مل حصہ لیا۔ اس دوران بہت سی خواتین پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس پھینکی گئی۔ بہت سی گرفتار ہوئیں۔ پنجاب کی تیرہ سالہ بہادر بیٹی فاطمہ صغرا ان نے جیل کی عمارت پر اپنے ڈوپٹے کو جھنڈا بنا کر لہرا دیا۔ لیڈی ماونٹ بیٹن نے مسلم لیگ کی خواتین کو تبادلہ خیال کے لیے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ تین گھنٹے یہ ملاقات جاری رہی۔ ان کے جذبے سے لاجواب ہو کر لیڈی ماونٹ بیٹن نے کہا: "حصول پاکستان کا جو جذبہ مسلم لیگی خواتین میں پیدا ہو چکا ہے وہ دبانا اب مشکل ہے۔"[۵۳] تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں نے اپنا رخ پاکستان کی طرف موڑا تو ہندو مسلم فسادات کے تناظر میں سب سے زیادہ نقصان خواتین کا ہی ہوا۔ بہت سی خواتین کی عزتوں کو پامال کیا گیا کچھ نے اپنی عصمت کی حفاظت کی خاطر خودکشی کر لی۔ ایک لاکھ کے قریب خواتین کو اغوا کر لیا گیا ان کو بازیاب کروانے کا کام ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء تک جاری رہا۔ بچ بچا کر واپس آنے والی خواتین کو گھر والوں نے پناہ دینے اور قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنوں کی خون ریزی کو آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود انہوں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے زخمیوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کی۔ مہاجرین کے کیمپ کے پاس بیٹھے ہوئے پریشان حال بزرگ کا ذکر کرتے ہوئے نور الصباح انہی کی زبانی لکھتی ہیں: "میں وہ بدنصیب ہوں جس کی پانچ بیٹیوں کی عزت اس کے سامنے لوٹی گئی اور جوان بیٹوں کو مرے سامنے ذبح کیا گیا۔"[۵۴]

پاکستان کے قیام میں عورتوں نے سب سے بھیانک جسماجی، ذہنی، جذباتی اور سماجی طور پر وہ قیمت ادا کی جس کا نعم البدل خواب دیکھنے والے بھی نہ بن سکے۔ قیام پاکستان کے وقت ہی خواتین کی دو تنظیمیں بنائی گئیں۔ ایک وومن نیشنل گارڈ اور دوسری وومن والنٹری سروس تھی جس کا کام مہاجرین کی آبادکاری تھا۔ یہی تنظیم "اپوا" کے (وومن ایسوسی ایشن) نام سے ۲۲ فروری ۱۹۴۹ء کو قیام عمل میں آئی۔ ۱۹۴۸ء میں مارکسی رجحان رکھنے والی خواتین نے انجمن جمہوریت پسند خواتین قائم کی۔ نام نہاد مولویوں نے شروع سے ہی عورتوں کے آئینی اور قانونی حق پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی۔ رجعت پسند عناصر اور مولویوں نے ان دونوں تنظیموں کی مخالفت کی۔ اپوا کی اتنی مخالفت کی گئی کہ بیگم رعنا لیاقت علی اور ان کی ساتھی خواتین کو مجلس احرار کے مولوی سرعام "طوائف" کہتے تھے۔ اور تو اور لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ان تنظیموں کو سرکاری سرپرستی نہ ملی جس سے وہ تحلیل ہو گئیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کا انتخابات میں حصہ لینا ایک جرات مندانہ فیصلہ تھا اس سے نہ صرف پاکستانی بلکہ برصغیر کی تمام خواتین کو امید کی ایک کرن دکھائی دی مگر افسوس ان کی جرات اور کوشش بھی سیاسی سازش کی نظر ہو گئی۔

۱۹۵۶ء کے آئین میں عورتوں کو ووٹ ڈالنے اور مخصوص نشستوں پر انتخابات میں حق رائے استعمال کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔ شادی، طلاق، نان نفقہ اور بچوں کے تحویل میں لینے کے معاملات کو بھی زیر بحث لایا

گیا۔ مولویوں نے واویلا مچا کر اس رپورٹ کو پس پشت ڈال دیا۔ ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کا اجراء کیا گیا جس کے تحت لڑکیوں کی کم سے کم عمر، دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے تحریر اجازت نامہ اور طلاق کی شقیں شامل ہیں۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۷ء کا دور خواتین کے لیے کچھ بہتر ثابت ہوا جس میں ان کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا دور خواتین کے بارے میں آزاد خیال رویوں کا دور تھا اقوام متحدہ کی طرف سے ۱۹۷۵ء میں خواتین کا عالمی دن منایا گیا۔ تاہم ۱۹۷۱ء کی جنگ بنگلہ دیش کی عورتوں کے لیے افتاد ثابت ہوئی۔ اس جنگ کا خون بہاء بھی عورتوں ہی کو ادا کرنا پڑا۔ زاہدہ حنا کے مطابق: "۸ مہینے اور ۱۶ دن کے دوران ڈھائی لاکھ مسلمان پاکستانی عورتیں جن کی ضمنی قومیت بنگالی تھی بے حرمت کی گئیں۔"(۵۵) افسوس کی بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی عورتوں کو مسلمان پاکستانی کلمہ گو سپاہیوں نے ہی یرغمال بنایا۔

جنرل ضیاء الحق کا دور خواتین کی کڑی آزمائش کا دور تھا جس میں پاکستانی جیلوں میں قید خواتین کو شدید جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ ۱۹۷۹ء میں کوڑے لگانے کا اسلامی قانون نافذ ہوا۔ جس کے تحت عورتوں کو بیٹھ کر اور مردوں کو کھڑا کر کے کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا۔ ان کی آمریت میں کسی کو بھی کچھ بولنے کی جرات نہ تھی۔ انہوں نے بیگم نصرت بھٹو، نسیم ولی خان اور بے نظیر بھٹو کو بھی ذہنی اور جسمانی اذیتیں دیں۔ ۱۹۸۴ء میں قانون شہادت کا اجراء کیا گیا جس کے تحت دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔ اسی قانون میں زنا اور عصمت دری میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ اسی دور میں عورتوں کا کھیلوں میں حصہ لینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان کو عام اور معمولی مضامین میں داخلہ دیا جاتا تھا جس میں ہوم اکنامکس جیسے اختیاری مضامین شامل تھے۔ ۱۹۹۸ء میں کراچی کی ایک اخبار کے اداریے میں اپنی مرضی سے شادی کرنے والی لڑکی کو والدین کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا خواہ وہ اس کو ہلاک ہی کیوں نہ کر دیں۔ پاکستان میں جمہوریت بحال نہ ہونے کی بناء پر عورت پسماندگی کا شکار ہے جس میں اقتصادی پسماندگی کے ساتھ ساتھ مذہبی شعور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے پاکستانی عورت کی زبوں حالی دوسرے ممالک کی نسبت سے زیادہ ہے۔ وہ سماجی اور معاشی محاذ پر بدتر حالت میں زندہ رہنے پر مجبور ہے۔ سنہ ۲۰۰۰ء میں ملک کی آبادی کے ۳۲٪ میں سے اکثریت تعلیم سے محروم ہیں۔ مغربی پاکستان میں صدیوں سے قبائلی، نیم قبائلی اور جاگیر دارانہ نظام قائم تھا۔ سندھ میں ترک وطن کر کے آنے والی خواندہ اور نیم خواندہ شہری عورتوں کا پڑاؤ ہونے لگا۔ شمال مغربی، سرحدی ریاست اور بلوچستان میں عورت کی حالت ناقابل بیان ہے۔ کاروکاری کا رواج بلوچوں میں عام تھا جو اپنے ساتھ سندھ میں بھی لے کر آئے۔ سندھ میں کارو کا مطلب سیاہ مرد اور کاری کا مطلب سیاہ عورت ہے۔ یہ ایک غیرت کے نام پر قتل کرنے کا دستور قدیم ہے جس کو ہر صوبے میں مختلف نام دیئے جاتے ہیں

سندھ میں کاروکاری، بلوچستان میں سیاہ کاری ،پنجاب میں کالا کاری اور سرحد میں طور طورہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔کاروکاری کے کیسز کی تعداد دو قسم کی ہے ایک وہ قسم ہے جس میں جنسی روابط رکھنے والے فرد کو قتل کر دیا جاتا ہے یہ کام متعلقہ عورت کے شوہر، بھائی یا باپ کرتا ہے دوسری وہ قسم ہے ایسے فرد کو جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ منڈی میں عام عورت کی نسبت کاری خاتون کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ فروخت ہونے والی خاتون کو اپنے گھر والوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی کاری عورتوں سے جنسی تعلق تو ہر کوئی قائم کرنا چاہتا ہے مگر شادی کوئی نہیں۔ غیرت کے نام پر ہونے والے قتل میں صرف الزام لگانا ہی کافی ہے۔اس قتل میں نوعمر بچیوں سے لے کر بڑی عمر کی عورتیں بھی شامل ہیں۔ زندگی بچانے والی عورتیں اگر پکڑی جائیں تو قتل کر دی جاتی ہیں۔ اپنی مرضی سے شادی کرنے والی اور خلع مانگنے والی عورتوں کے خلاف جان بوجھ کر زنا اور قتل کے مقدمات درج کروائے جاتے ہیں۔ عورتوں کی تجارت بھی ایک نفع بخش کاروبار ہے جس میں غیر ملکی، ملکی، علاقائی خواتین زر کے طور پر فروخت ہوتی ہیں۔ان کی قیمت کا تعین شکل اور عمر دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ہر روز ہزاروں خواتین خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ اس کام کے لیے پولیس کو بھی رشوت دے کر ساتھ ملا لیا جاتا ہے۔ خاندانی جائیداد بچانے کے لیے اکثر گھرانوں میں لڑکیوں کی قرآن پاک سے شادی کر دی جاتی ہے اس رسم کو "حق بخشوائی" کہتے ہیں۔ زیادہ روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاندان کے اندر چھوٹی عمر یا بڑی عمر کے شخص سے شادی کر دی جاتی ہے۔ کچھ علاقوں میں پیدائش کے وقت منگنی یا نکاح کرنے کا رواج بھی عام ہے۔ اس رسم کو "پیٹھی" کہا جاتا ہے۔ فرمانبرداری نہ کرنے والی لڑکی کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ گھریلو تشدد کا بدترین طریقہ انہیں زندہ جلا کر مارنا ہے۔ اس جرم میں شوہر، دیور، ساس، نندیں اور سسر شامل ہوتا ہے۔"١٩٩٩ء کی ایک رپورٹ کے مطابق پنجاب میں ٢٨٠ سے زیادہ خواتین کو جلانے کے واقعات منظر عام پر آئے۔ ٢٠٠٢ء میں ان کو جلانے کے واقعات میں بیس فی صد اضافہ ہو چکا تھا۔"(٥٦) یہاں پر وٹے سٹے کی شادی کا بھی عام رواج تھا۔ اگر باپ یا بھائی کے سر پر قرضہ ہو یا کوئی بڑا جرم ہو جائے تو دو خاندانوں میں صلح کروانے کے طور پر عورت کو ونی کی رسم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو جرمانے یا ہرجانے کے طور پر دینے کا فیصلہ پنچائت یا جرگہ کرتا ہے پنجاب میں اسے ونی جبکہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں سوارہ کہا جاتا ہے۔ مزاحمت کرنے والی لڑکی پر پولیس کے ساتھ مل کر مختلف جرائم میں ملوث کر دیا جاتا ہے تھانے جانے والی خواتین کے لیے پولیس اہل کاروں سے محفوظ رہنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ پنجاب کی حالت ان صوبوں سے کچھ بہتر تھی۔ جہیز دینے کی وجہ سے لڑکے کو لڑکی پر فوقیت حاصل ہے۔ معاشی لحاظ سے بھی وہ مکمل طور پر مردوں پر انحصار کرتی ہے۔ جبکہ وہ اپنے گھر کے اندرونی اور بیرونی ساٹھ فی صد مسائل خود حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ صوفی ازم کی منظوم کہانیاں بھی نسوانی کردار کے

بغیر ادھوری ہیں۔اس کے باوجود ایک قبیلہ جب دوسرے قبیلے پر حملہ آور ہوتا ہے تو سب سے پہلے عورت کو ہی غلام بناتا ہے۔ایک مسلم ملک ہونے کے باوجود یہاں عورت پر ہونے والے جرائم کی تعداد زیادہ ہے۔پاکستان کا ایک پرانا قانون بزرگوں کی اطاعت کرواور جھوٹوں سے کراؤ ہے یہ قانون والدین کی پسند کی شادی کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ جہاں ان کا دل کیا شادی کر دی۔اس قانون کو زیادہ اہمیت جنرل ضیاء الحق کے دور چادر اور چار دیواری میں ملی جس کے تحت لڑکا اور لڑکی پسند کی شادی نہیں کر سکتے۔مذہبی جماعتیں موسیقی اور رقص کی دشمن تھیں انہوں نے عورت کو مرد کا غلام بنایا۔وہ مرد کی باندی بن کر زندگی گزارنے لگی۔مرد کے جبر نے عورت کو غلامانہ ذہنیت کا شکار کر دیا۔چادر اور چار دیواری کے پس پشت زنا،ڈسکو ڈانس، مجرے ہوتے رہے جس سے جاگیر دارانہ زناکاری اور عیاشی بڑھنے لگی۔ جہیز، جبری شادیاں، جہیز نہ لانے پر جلا دینے کے واقعات بڑھنے لگے۔ان کا رہن سہن مختلف تھا مگر حیوانی کلچر سے ممتاز نہیں تھا پدر سری نظام کے تحت مرد نے عام چیزوں کی طرح عورت کو بھی اپنی ملکیت جانا۔ جس پر اس کا مکمل اختیار ہے وہ جو چاہے گا عورت مشین کی طرح وہی کرے گی۔ملکیت کے اس نظام نے ہماری کئی نسلوں کو تباہ و برباد کر دیا۔یہ ملکیت جائیداد حاصل کرنے کی ہو یا سیاسی کرسی کو حاصل کرنے کی، میڈیا پر بالادستی حاصل کرنے کی ہو یا کاروبار بڑھانے کی سب کے پیچھے دوسروں کو نیچا دکھانے کی حکمت عملی کارفرما ہے یہ نہ ملنے پر ہونے والی لاکھوں برائیاں اور ناجائز قتل ہوتے ہیں۔ عورت کو کم تر ثابت کرنے کے لیے پردے کی شرط عائد کی گئی جو کہ ہندووں کے پنڈت منو نے عائد کی تاکہ عورت اور اس کے بچے غلامانہ ذہنیت کا شکار ہو کر ذات پات اور برادریسسٹم برقرار رہے۔پاکستانیوں نے بھی اس رواج کی راہ ہموار کی تاکہ چوہدریوں اور فرقہ پرستوں کے گھر میں یہ فرق جون کا توں قائم رہے۔ اسلامی معاشرے کے نام پر جنرل ضیاء الحق نے ترقی پسند تحریک کو رد کیا اس انتہا پسندی نے تصور عورت کو بھی اپنی زد میں لے لیا۔ زبیر رانا اپنی کتاب "پاکستانی تہذیب کا بحران" میں کہتے ہیں :"عورت اور مرد کے ہر رشتے میں مرد شکاری بن کر عورتوں پر کوئی ہتھیار چلاتے رہتے ہیں۔"[۵۷] دور جدید میں تعلیم یافتہ عورت سرمایہ دارانہ نظام کے مظالم کا شکار ہوتی ہے جہاں پر عورت کو ایک نمائش کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔اس کو مردوں سے کم عہدے اور تنخواہوں پر رکھا جاتا ہے یوں پاکستانی عورت کبھی مذہبی پیشواؤں، کبھی سیاست دانوں اور سرمایہ دار طبقے کے ہاتھوں سازشی چالوں کا حصہ بنتی ہے جس کا آغاز گھر سے لے کر معاشرے تک ہوتا ہے۔

تمام پابندیوں اور سختیوں کے باوجود لکھاری عورتوں کی آواز کہیں دبی دبی اور کہیں مزاحمتی صورت اختیار کیے ہوئے آتی رہی۔ جن میں فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت کا تصور نظر آتا ہے جو مرد اساس معاشرے

میں مساوی حقوق کے لیے کوشاں ہے۔ اس نے جنسی معاملات پر کھل کر لکھا اور مردوں کے عیار رویوں سے نقاب اٹھایا۔ فاطمہ حسن نے بڑی دانائی سے تحریک نسواں کو آگے بڑھایا۔ اس کی کتاب "خاموشی کی آواز"۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آئی۔ کشور ناہید نے عورت کی آزادی کو مشرقی اور مغربی معاشرے کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری قدیم روایات کا تسلسل اور انحراف کا امتزاج ہے۔ وہ محبت کرنے والی خواتین کی نمائندہ بن کر سامنے آئی۔ جو اپنی اعلی صلاحیتوں اور ذہانتوں کے باوجود مرد کی طرح بااختیار نہیں۔ خالدہ حسین کو شکایت ہے کہ عورت کا تصور ادب میں غلط اور غیر حقیقی ہے۔ وہ مسلم گھرانوں میں پائے جانے والے پدرسری نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ زاہد حنا اپنے مضامین میں عورت کی تاریخ اور حال میں کی جانے والی زیادتیوں کا نوحہ بیان کرتی ہیں کہ ملازمت پیشہ خواتین کس طرح ہراساں ہوتی ہے اور بازاری منڈی میں اس کی خرید و فروخت کے لیے مختلف حکومتوں نے کون سا طریقہ اختیار کیا؟

۳۔ تانیثیت کا ادبی تناظر:

تانیثی تحریک کی بنیاد تانیثی فکر پر قائم ہے جس کے پیچھے صدیوں کی جدوجہد کارفرما ہے۔ اس کے مطابق مرد اور عورت ہر لحاظ سے برابر ہیں ان کو زندگی کے ہر میدان میں برابر حقوق ملنے چاہیں۔ ماضی میں خواتین اپنی ذات کی نفی کر کے مردوں کی خواہشات کو پورا کرتی رہیں جس پر تانیثی تحریک نے احتجاجی رد عمل کا اظہار کیا۔ یہ عورتوں کو سیاسی، سماجی اور ذہنی آزادی دلانا چاہتی ہے۔ روز اول سے ہی مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی تخلیقی میدان میں گراں قدر اضافے کیے مگر ان کی تخلیقات عدم توجہی کا شکار ہوئیں۔ خواتین اپنی تحریریں باپ ،بھائی یا شوہر کے نام سے شائع کرواتی رہیں ایسا مشرقی ممالک میں ہی نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی ہوتا رہا جیسے جارج الیٹ کرر، ایلس اور ایکٹن بیل کے علاوہ ہزاروں خواتین مردوں کے فرضی ناموں سے لکھتی اور چھپواتیں رہیں۔ یوں خواتین نے اپنے چہرے کے ساتھ ساتھ ناموں کو بھی پردہ کروایا۔ دوسری طرف ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ماننے سے انکار کیا گیا کیونکہ پدرسری نظام کے تحت ہر طرف مردوں کی اجارہ داری تھی۔ اسی لیے سائمن دی بوا نے کہا تاریخ کی کتابوں میں عورت غائب ہے۔ کیا عورتیں تھیں نہیں یا ان میں تخلیقی صلاحیتیں نہیں پائی جاتیں ان سوالوں کا جواب جاننے کے لیے ادب کی رد تشکیل ضروری ہے تاکہ دیکھا جائے کہ خواتین نے جو ادب لکھا ہے اس میں اسکے وجود کا کیا تصور ہے۔ تانیثی تنقید دو قسم کی ہے۔ عورت پر تنقید اور نسائی تھیوری۔ عورت پر تنقید میں عورت کا غیر سیاسی اور غیر سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے پدرسری معاشرے کے لحاظ سے عورت ایک پھوہڑ، حقیر اور

کیڑے مکوڑوں کی طرح ہے جب تک اس پر لکھا نہ جائے وہ سامنے نہیں آتی۔امریکہ میں انتقاد نسواں کے نام سے خواتین لکھاریوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔انیسویں صدی کی عورت لکھاری نے عورت کے کردار کو برتر اور کمتر صورت میں بیان کیا ہے جس کے مطابق وہ یا تو دیوی ہے یا پھر چڑیل۔درمیانے طبقے کی عورت صف ہستی سے ہی غائب تھی۔ان لکھاری عورتوں نے کہیں نہ کہیں پدرسری نظام کے خلاف اپنا غصہ ضرور نکالا ہے جو مرد لکھاریوں کے ہاں نہیں پایا جاتا۔یوں نسائیت کی تشکیل میں ہی نسائیت کی تعریف پوشیدہ ہے۔رد تشکیل کی زیادہ تر تھیوریوں کا تعلق فیمنزم سے نہیں ہے جیسے فرائڈ کی جنسی تھیوری،مارکسی تھیوری وغیرہ۔نسائی تھیوری سے مراد وہ تھیوری ہے جو نسائیت کو دوبارہ تشکیل دیتی ہے۔نسائی پس منظر میں عورت پر جنسی اور حیاتیاتی لحاظ سے حملے کیے گئے ہیں جس میں اس کی خصوصیات کے جواہر خامیوں میں بدل گئے جیسے فرائڈ کی جنسی اور نفسیاتی تھیوری نے جنسی تضاد کو بڑھ چڑھ کر بیان کیا۔پدرسری نظام نے ان منفی خواص کو لے کر کئی ایک سازشی کھیل کھیلے۔جب متن میں تہذیبی نشانات اور ان کی قدریں متعین کی جاتی ہیں تو متنی قرات کی پہلی سطح میں ہی ان تہذیبی کوڈز کی نشان دہی کی گئی جو مرد اور عورت کے اس تانیثی تخالف binary opposition میں مردانہ صفات کی تہذیبی ترجیحات کی نشان دہی کرتی ہیں۔متن میں معاشرتی ترجیحات کی رد تشکیل سے لے کر زبان کے تخلیقی کردار پر سوالیہ نشان تک تانیثیت نے قرات کے نئے امکانات سے متعارف کرواتی ہے۔جس میں جملوں کی ساخت،ڈسکورس کی مختلف اقسام،تانیثی زبان اور اسلوب کے عناصر کو ایک طاقت اور رجحان میں تبدیل کرتی ہے۔تانیثی تنقید کے اولین نقاد ارسطو ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "ری پبلک" میں عورت کی حکمرانی کے حق میں دلائل دیئے۔اس کے بعد چاسر کے ہاں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ارجمند آرا نے اپنے مضمون "تانیثیت کے نقوش" میں میگی ہم نامی تحریر میں Inanana کا ذکر کیا ہے جو بائبل سے بھی دو ہزار سال پہلے کا متن ہے۔اس متن میں ایک دیوی کا ذکر ہے جس نے جنس کے متعلق ڈسکورس پر اعتراضات کیے۔ورجینیا وولف کا مضمون (۱۹۲۹ء) A room of in one 'own کو صنف،جنس اور تنقیدی کتابوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔اس تصنیف کا تعلق پہلی جنگ عظیم کے بعد کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں سے ہے جس میں ورجینیا وولف نے پدرانہ نظام کے اندر ثقافتی،معاشرتی،معاشی اور تعلیمی معذریوں کا ذکر کیا ہے جو خواتین کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنے سے روکتی ہیں۔مرد غالب معاشرے میں عورت کو گھریلو ذمہ داریوں کی حد تک محدود کر کے احساس کمتری کا شکار کر دیا جاتا ہے۔اس وجہ سے نہ صرف ادب بلکہ ہر ادارے میں مردوں کی اجارہ داری ہے۔خواتین کی عدم موجودگی ہنر کی بجائے مواقع کی کمی کا نتیجہ ہے۔متن کا سیاسی معنی مچھلی کے استعارے سے جڑا ہوا ہے دوسری طرف کمرے کا استعارہ نجی،مقامی،سیاسی اور ثقافتی جگہ کے اعلان کی

علامت ہے۔ شکسپیر کی بہن کا کردار اس کا اپنا ہی کردار ہے جس کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور وہ خودکشی کرلیتی ہے۔ دوسری طرف عورتوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں اس کا تعین معاشرتی ادارے کرتے ہیں جن کا کنٹرول طاقت ور گروہوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ قوانین بھی یہی لوگ تشکیل دیتے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق اکیلی عورت کو گھاس پر چلنے کی بھی اجازت نہیں۔ فرسودہ رسم ورواج اور قوانین کی پاس داری کرتے ہوئے وہ اپنی ذات کو بھی پس پشت ڈال دیتی ہے ،یوں یہ قوانین کمزوراور طاقت ور طبقے کے درمیان طبقاتی فاصلوں کو جنم دیتے ہیں۔ ورجینیا وولف کے مطابق عورتوں کی خاموشی ہی عورتوں کے خلاف رسم ورواج کو ہوا دیتی ہے جو تعلیم اور زبان کے عوامل میں ضمنی کرداروں کی تشکیل و تشہیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً زبان میں رائج ضرب الامثال اور لطائف عورت کو کمزور ہونے کی بناء پر منفی رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں: "یہ سب کچھ اتنے لطیف (subtle) طریقے سے کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات کمزور گروہ جن کو تختہ مشق بنایا جارہا ہوتا ہے وہ بھی اس سارے عمل میں لطف اٹھاتے ہیں۔"(۵۸)

اس نے خواتین کو اپنی تخلیقی صلاحیتیں نکھارنے کے لیے خود کو مستحکم اور خود کفیل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس کا ماننا ہے کہ عورت کی تخلیقات کسی صورت بھی مرد سے کم تر نہیں۔ پدری معاشرے کے تحت پرورش پانے والا قاری مرد اور عورت تخلیق کاروں سے الگ الگ توقعات وابستہ کرتا ہے۔ مصنفہ کی اپنی تخلیقات بھی پدری معاشرے میں تعصب کا شکار رہیں ان حالات کے پیش نظر وہ یہ کہنے پر مجبور نظر آتی ہے کہ عورت کا اپنا کوئی گھر نہیں جہاں وہ اپنی مرضی اور آزادی سے امور سرانجام دے سکے۔ اس کو تنہائی اپنے واش روم کے علاوہ اور کہیں میسر نہیں۔ اس لیے وہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کے پاس پانچ سو روپے ڈالر اور ایک کمرا ہونا چاہیے جہاں وہ معاشی اور ذہنی الجھنوں سے آزاد ہو کر لکھ سکے۔ جب مصنف سوچتا ہے تو ایک خیال کو تخلیقی قوت سے ہم کنار کرتا ہے جس میں صنف اور جنس کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس نے کارل جنگ کے نفسیاتی نظریے سے متاثر ہو کر Androgyny کا فلسفہ پیش کیا یہ یونانی زبان کے دو لفظوں کا مرکب ہے Andro جس کا مطلب مرد اور gyny کا مطلب عورت ہے یعنی ایسا مرد جس میں مردانہ اور زنانہ دونوں خصوصیات ہوں وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ لکھنے والا تب ہی جامع انسانیت کا کلیہ پیش کر سکتا ہے جب وہ مرد اور عورت کی قید سے بالاتر ہو کر لکھے گا اور اس کی سوچ اور فکر کا محور کل کائنات ہو گی۔ اس نے جنسی نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مرد اور عورت کی تخلیق میں جسمانی تفاوت ضرور ہے مگر ذہنی اور فکری دانش کی حد تک کوئی پیدائشی اور فطری فرق نہیں۔

سائمن دی بوا کی کتاب "سکینڈ سیکس" (۱۹۴۹ء) تانیثی دستاویزات میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے جس میں عورت کی وجودی شناخت اور حالات زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مصنفہ کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جس کی دو جلدیں ہیں۔ اس نے ایسے معاشرے کے خلاف آواز اٹھائی جس نے عورت کو ثانوی درجہ دیا۔ اس نے عورتوں کے ماضی اور حال کا جائزہ لیتے ہوئے عورتوں کے ساتھ کی جانے والی بے اعتنائی کا قصوروار معاشرے کو قرار دیا۔ مرد خاندانی وقار اور استحکام کو برقرار رکھنے کے لیے عورت پر ظلم کرتا ہے شروع سے ہی ایک لڑکے کی تربیت ایک طاقتور اور حاکم فرد کے طور پر اور عورت کو خاموش، برداشت کرنے والی محکوم مخلوق کے طور پر کی جاتی ہے۔ اس نے انیگلز کی تاریخ سازی اور فرائڈ کی حیاتیاتی سوچ کو ٹھکراتے ہوئے کہا عورت ہونا ویسے ہی ہے جیسے اس کو بنایا جاتا ہے وہ مختلف تہذیبوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ شروع سے ہی خواتین کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کیا گیا اور نسائی تقدیر کو اس پر مسلط کر دیا گیا۔ نسائیت پدری معاشرے میں مردوں کا گھڑا ہوا تصور ہے جس میں عورت کو ہمیشہ ثانوی درجہ دیا گیا۔ سماج نے مرد کو مثبت اور عورت کو منفی تشکیل سے متعارف کروایا جس میں عورت اور مرد کے بنیادی فرق کو حیاتیاتی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ عورت کا اولین کردار تولیدی ہے جس میں مرد ثانوی کردار ادا کرتا ہے۔ اگر عورت اس خیال کو مسترد کر دے تو پدرسری نظام کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ یوں سائمن دی بوا نے اپنی کتاب "دی سکینڈ سیکس" میں عورت کو فلسفہ وجودیت کے تحت دیکھا ہے جو اس بات پر بحث کرتی ہے کہ عورت ایک شے نہیں موضوع ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان جنسی امتیاز کے بارے میں وجودی تانیثیت اس پر زور دیتی ہے جنس سے پہلے مرد اور عورت دونوں ہی انسان تھے۔ اس لیے ڈاکٹر آمنہ تحسین "دی سیکنڈ سیکس" کے بارے میں تصدیق کرتی ہیں کہ اس میں "سارتر کے فلسفہ وجودیت کے تناظر میں عورت کے وجود کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔"[۵۹] وجودیت کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ وجود جوہر سے پہلے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا پیدائشی کوئی جوہر نہیں۔ پیدائشی صرف حیاتیاتی وجود ہے جبکہ جوہر کی تشکیل کی جاتی ہے جس میں سیاسی، سماجی اور فکری طور پر انسان کا جوہر اس کی ثقافت اور خود اس کے فیصلوں اور پسند پر منحصر ہے۔ سائمن دی بوا کے نزدیک بھی عورت ایک حیاتیاتی وجود رکھتی ہے۔ مرد کی طرح اس کا جوہر بھی سماجی تشکیل سے نمو پاتا ہے۔ سماج کی بھاگ دوڑ مرد کے ہاتھ میں ہے لہٰذا عورت کے کردار کی تشکیل میں مرد کی فرماں برداری اس کی گھٹی میں ڈال دی جاتی ہے وہ اپنی زندگی مرد کے مفاد کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ جبکہ سائمن دی بوا کے مطابق عورت کو اپنے ہونے کا ثبوت دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ شعوری طور پر اپنی پسند کا استعمال کرتے ہوئے تخلیق و تشکیل خود کر سکے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عورت نے اعتماد، عرفان ذات اور خود آگہی جیسے وصف کو اپنایا۔ جو تانیثیت کا نقطہ آغاز تھی۔

عورتوں کے تخلیق کیے گئے ادب کو خاص زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر زور دیا۔اس کے نزدیک آزاد عورت زیادہ بہتر ادب تخلیق کر سکتی ہے۔اس کی پیروی ڈی۔ایچ لارنس، ژاں لائس، ڈارس لینگ اور ٹیلی آسن جیسے اہم نقاد نے کی ہے۔۔ڈارس لینگ کتاب The Golden role book تانیثی تنقید میں خاص درجے کی حامل ہے. جس کے مطابق شروع سے ہی مرد کی طاقت طے شدہ ہے اور عورت سے دوجے پن کا سلوک کیا جاتا ہے۔انسانیت مرد ہے اور مرد عورت کے ساتھ رشتہ تعلق کے لحاظ سے متعین کرتا ہے وہ اسے ایک خود مختار وجود نہیں سمجھتا۔"عورت محض وہی کچھ ہے جس کا فیصلہ مرد دے لہذا اسے جنس کہا جاتا ہے۔"(۶۰)اس کتاب میں عورت کو حیاتیات، نفسیات، یا معاشی قوت اور تاریخی مادیت کے تحت کیسے دیکھا گیا حقیقی نسوانی تصور کی وجوہات، مرد اور عورت کا اس کے بارے میں نظریہ اور اس پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے جیسے اہم مباحث کو زیر غور لایا گیا۔اس کے نزدیک خواتین کی ترقی میں دو عوامل اہمیت کے حامل ہیں جن میں پیدوار میں حصہ لینا اور تولید غلامی سے نجات پانا ہے۔امریکی تانیثی نقاد بیٹی فرائیڈن کا تعلق تانیثیت کی دوسری لہر سے ہے اس کی کتاب The Feminine Mystique(1961) ساٹھ کی دہائی میں عورتوں کی آزادی کی تحریک کا باعث بنی۔اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی شادی شدہ عورتوں کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ وہ تعلیم، معاش، سیاست کے بارے میں اظہار رائے کی خواہش نہیں رکھتیں۔وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے خوش نہیں اس لیے خاموش ہیں اور اپنے جذبات کو آواز نہیں دے سکتی ہیں۔

تانیثی تنقید کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔جس میں قدیم روایات کی تجدید کی گئی۔سائرہ ملز نے اپنی کتاب Feminist stylistic(1995) کے ابتدائی صفحات میں فیمینسٹ اسلوب کا جملہ استعمال کیا۔یہ اسلوب صرف جنس کو ہی بیان نہیں کرتا بلکہ صنفی معاملات اور تخلیقی روایات کو بھی بیان کرتا ہے۔تخلیق خود بتاتی ہے کہ مجھے تخلیق کرنے والا کون ہے؟اس کا بیانیہ سیاسی تحریک سے بھی جوڑتا ہے ۱۹۷۰ء کے تانیثی ادب میں زیادہ تر پدرسری نظام کے جبر کو موضوع تحریر بنایا گیا جس میں امریکن تانیثی نقاد کیٹ ملٹ کی کتاب "جنسی سیاست" (۱۹۷۰ء) کو شہرت دوام حاصل ہوئی یہ مصنفہ سائمن دی بوا سے متاثر تھی اس لیے وہ جنس کی بنیاد پر قائم ہونے والے معیارات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتی ہے جس میں پدرسری نظام کے تحت ایک صنف کو برتر اور دوسری کو محکوم قرار دیا جاتا ہے۔ان وجوہات کی وجہ سے کیٹ ملٹ پدری جبر کو ختم کرنے کے لیے مزاحمتی رویہ اختیار کرنے کی تنبیہ کرتی ہے جس نے عورت کو گھٹنوں کے بل زندگی گزارنے کا عادی بنا دیا۔اس کتاب میں تین موضوعات پر بحث کی گئی۔جس میں جنسی سیاست، پدری نظام اور ادب پر پدری نظام کے اثرات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔وہ روایتی خاندانی

یونٹ کی مخالفت پدری نظام کی وجہ سے کرتی ہے جس کے تحت خواتین کو جسمانی، جذباتی اور جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس نظام کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اس اساس کے تحت قائم شدہ اداروں میں خواتین مردوں کے تسلط کا شکار ہیں۔ جنس کا تعلق حیاتیات سے ہے جبکہ صنف کو نفسیاتی اور معاشرتی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سماجی ماہرین نے مرد کو امن پسند اور عورت کو لڑاکا قرار دیا تو کیٹ ملٹ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کے مطابق جنسی کرداروں میں پایا جانے والا تسلسل بھی جبری ہے۔ ان کرداروں سے نکل کر غلبے اور اطاعت کے غیر مساویانہ تعلق سے پیدا ہونے والے حالات کو وہ جنسی سیاست کا نام دیتی ہے۔ اس کے مطابق نسائیت اور جنسی سیاست دونوں میں مماثلت ہے اس لیے عورتوں کا موازنہ، غلام، کالے اور پسے ہوئے طبقے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں ہر مظلوم طبقے کے دلائل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پدری نظریے کے طور پر ظالم ظلم کو شعوری طور پر جاری رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حیاتیاتی علوم کے حمایتی عورت کو کمزور قرار دے کر گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیتے ہیں اور روایتی خاندانی ڈھانچہ اس کو گھریلو کاموں تک محدود کر دیتا ہے جس کی کوئی وقعت نہیں۔ خاندان اور معاشرتی ادارے مل کر خواتین کی محکومیت میں اجتماعی کردار ادا کرتے ہیں اسی وجہ سے عورت کے کردار غیر فعال، تماشائی اور مداح کے سوا کچھ نہیں۔ ملٹ کورا کپلان کے اس قول سے متفق ہے۔ ”آئیڈیالوجی مردانہ عضو کی آفاقی انجمن ہے جسے ہر طبقے کے مرد خواتین کی مار پیٹ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔“[٦١] عورت کے کمزور اور دکھی ہونے پر پدری نظام کے حامی افراد کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ صنف کی تشکیل کے دوران شعوری اور لاشعوری طور پر ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کے نمایاں اور غیر جانب دار سماجی اور اقتصادی محرکات کو نظر انداز کیا جاتا ہے اسی لیے تاریخ میں بھی عورتوں کو حقوق نہیں دیئے گئے اور نہ ہی ادب میں خواتین کا کوئی مقام ہے اس لیے مصنفہ نے قدیم متون کو از سر نو دریافت کرنے پر زور دیا۔ اس نے مرد و خواتین کے درمیان زبان واصلاحات کا اصل سبب جنس کو قرار دیا۔ اس کے خیال میں مرد عورتوں کے ساتھ زیادتی جان بوجھ کر نہیں کرتے بلکہ مردانہ تسلط ان کے لاشعور میں سرایت کر چکا ہے اس نے مزید کہا کہ جس طرح فرائڈ نے خوابوں کے ذریعے فرد کے دبے ہوئے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی اس طرح ادب میں بھی عورتوں کے جذبات، اور خصوصیات کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ اس نے انڈروگائنس کا خواب دیکھا جس میں مردانہ اور نسوانی کلچر کا باہمی ارتباط ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں عورتیں اپنی فکر کا نامناسب انداز میں اظہار کرتی ہیں جیسے بیان یا حکایت جو رومانوی یا دلبرانہ خواہشات کے حصول کے لیے تخلیق کی گئی ہو۔ قاری بھی خود کو مرد ہی ظاہر کرتا ہے۔ اشتہارات میں عورتوں کی فحش انداز میں نمائندگی کی جاتی ہے۔ جو مردوں کی جنسی ہوس کا ذریعہ بنتی ہے۔ یوں مردانہ تسلط اور جبر سے مختلف جنس کی جگہ طبقے کو تاریخی عمل کا تعین

کرنے والا اہم عنصر گردانتا ہے۔ اس کتاب میں شامل انتہا پسندانہ متن انتہا پسندانہ تانیثیت کے وجود کا باعث بنا۔ کیٹ ملٹ نے نہ صرف خواتین بلکہ ہم جنس پرستوں، ذہنی مریضوں اور بوڑھوں کے حقوق کے لیے بھی آواز بلند کی۔ ۱۹۶۶ء میں قومی تنظیم برائے خواتین کی تعلیمی کمیٹی کی پہلی صدر بنی۔ اس کے ہم خیال لوگوں میں سمیتھ فائرسٹون کا نام آتا ہے۔ امریکی تانیثی نقاد ایلین شوالٹر کی کتاب(1977) A literature of their own ایک منفرد تنقیدی کتاب ہے جس میں برطانوی خاتون ناول نگاروں کا جائزہ برونٹز کے دور سے خواتین کے تجربات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ ظاہری طور پر زنانہ اور مردانہ کی کوئی طے شدہ خصوصیات نہیں مگر ان کی تحریروں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس نے مردوں اور عورتوں کے متون کے لیے الگ الگ اصطلاحات استعمال کیں۔ Andotext مردوں کے متون کے لیے اور عورتوں کے لیے Gynocriticism کی اصطلاح استعمال کی گئی اگرچہ یہ بہت وسیع ہے۔ جس کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے:

> "Gynocriticism is the term cointed in the seventies by Elaine Showalter to describe a new literature project intended to construct a female framework for analysis of women's literature."(۶۲)

"گائنو تنقید ایک اصطلاح ہے جو ستر کی دہائی میں ایلین شوالٹر نے ایک نئے لٹریچر پروجیکٹ کو بیان کرنے کے لیے بنائی تھی۔ جس کا مقصد خواتین کے ادب کے تجزیے کے لیے ایک زنانہ فریم ورک تیار کرنا تھا۔"

اس نے مردانہ برتری کے چار ماڈلز پیش کیے جو حیاتیاتی، لسانی، نفسیاتی اور ثقافتی ہیں۔ وہ مغربی ادبی روایت کی تنقید کو اپنی کتاب The New Feminist Criticism تین مراحل میں تقسیم کیا۔(۶۳)

1. Feminine نسوانیت
2. The Feminist Criticism نسوانی تنقید
3. The Female عورت

نسوانیت: عورتوں کی تحریروں کی روشنی میں پہلے مرحلے کو نسوانیت کہا جاتا ہے۔ یہ دور ۱۸۴۰ء سے لے کر ۱۸۸۰ء تک کا ہے۔ جس میں یورپ اور امریکہ کے معاشرے میں پہلی دفعہ عورتوں کو ان کے حقوق کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اس دور کی تحریروں کے مطابق عورت اپنے بنیادی حقوق کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اس دور میں خواتین کا سماجی دائرہ کار گھریلو اور قریبی معاشرتی زندگی تک محدود تھا۔ اس دور کا تعلق انقلاب فرانس کے بعد کے دور سے ہے جب ہر شخص جدید دور کے انسان کا مطالعہ کر رہا تھا تاہم اس دور میں بھی خواتین کی تحریروں کو ان کے تجربات کے اظہار

کے طور پر نہیں دیکھا گیا جس کا ثبوت اسی دور میں جارج ایلیٹ جیسی خاتون اپنی تحریروں کے لیے مردانہ تخلص کا سہارا لیتی دکھائی دیتی ہے۔ دوسرا مرحلہ حقوق نسواں کے دور سے شروع ہوتا ہے جو ۱۸۸۰ء تا ۱۹۲۰ء تک کا ہے۔ اس دور میں مردوں کی تحریروں کو عورت کی پیش کش کے حوالے سے دیکھا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے مردوں نے عورتوں کو کس طرح سمجھا ہے۔ یہ مکتب تنقید Androcentric تھا اور Male Oriented تصور عورت کو پیش کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ایک عورت مرد کے تناظر میں کس طرح کم تر ہے اگر ہے تو احتجاج اور تنقید سے اس تفریق کو دور کیا جائے۔ تیسرا مرحلہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۶۰ء تک کا ہے جس کے تناظر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورت کیا ہے ؟ یہی سوال عورت کے سماجی اور انسانی حقوق کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ شوالٹر نے اسے عورت کی خود شناسی کا مرحلہ بھی قرار دیا ہے جس میں عورت کو عورت کے طور پر جاننے پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی خود شناخت مرحلے کو Gyno Criticism کا نام دیا گیا۔ نسوانیت اور نسوانی تنقید چھوٹی سطح کے مرحلے ہیں جو دوسروں کے سہارے سمجھنے سمجھانے کی ادنی سی کوشش کرتے ہیں۔ نسوانی تنقید میں عورت کے ساتھ مخلصی اور ہمدردی کا رویہ تو اپنایا گیا مگر وہ عورت کی شناخت کے خود آشنا محرکات سے آگاہ نہیں تھے۔ ڈاکٹر قاسم یعقوب کے مطابق گائنو کریٹسزم جسے اردو میں انتقاد نسواں کا نام دیا جاتا ہے یہ عورت کی شناخت اور وجود کے بارے میں بنیادی سوال اٹھاتی ہے مثلاً:

> "عورت کی وجودی شناخت کیا ہے ؟ عورت بطور صنف مردوں میں کیا اختصاص رکھتی ہے اور وہ اختصاص عورت کے وجودی اور ذاتی حوالوں کو کس طرح معرض بحث میں لاتا ہے؟ عورت کی جنسی اور صنفی خوبیوں کا دائرہ کار کیا ہے؟ کیا عورت مادر سری اور پدر سری دائروں میں جبلی طور پر تقسیم ہے یا کر دی گئی ہے۔"[۶۴]

نسوانیت، تانیثی تنقید اور عورت یعنی انتقاد نسواں کے تمام سوال اور ان کے جوابات مل کر تانیثیت کہلاتے ہیں۔ جو تھیوری کے عمل سے گزر کر تانیثی تھیوری کہلاتے ہیں۔ تانیثی تھیوری نے ادب کے اندر عورت کو ایک بنیادی سوال بنا کر پیش کیا کہ عورت کیا ہے اور کیسے پیش کی گئی یوں ایلین نے صرف گائنو کرسٹکیس کی اصطلاح ہی متعارف نہیں کروائی بلکہ عورتوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو شامل کر کے ایک تحریک چلائی جس کو سب کلچر کا نام دیا جاتا ہے۔ سب کلچر میں ادبی، تانیثی اور معاشرتی مباحث نے عورت کے اندر شعور پیدا کیا۔ مردانہ تعصب پسند معاشرے میں ہم جنس پرستی کے رجحان نے پرورش پائی۔

اس کے بعد کی دہائی میں تانیثی ادب کا دیگر ادبی تناظر کی طرح موڑ بدل گیا۔ تانیثیت کو موضوعاتی طور پر دیکھا جانے لگا، جس میں مارکسیت، ساختیات، اور لسانیات کے تحت نسائی دنیا اور تصورات کو تلاش کیا گیا۔ اس سلسلے

میں فرانسیسی اور امریکی دو دبستان زیادہ مشہور ہیں جن میں امریکی تنقید میں مارکسزم اور بلیک فیمنزم پر بحث کی جاتی ہے جب کہ فرانسیسی تنقید میں ساختیات اور تحلیل نفسی کو مرکز بنایا گیا۔اس پر لاکاں، فوکو اور دریدا کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں یہ لوگ متون کی بجائے ذاتی احساسات کی جزیات اور باریکیوں کو مد نظر رکھتے ہیں ان کے مشہور نقاد میں جولیا کرسٹیوا، ہیلن سکسو اور لوس اری گارے ہیں۔جولیا کرسٹوا کے ہاں Ecriture feminine تانیثی تحریروں میں علامات اور اصطلاحات استعمال کرتی ہے۔اس کے ہاں پایا جانے والا سیمیاتی اور علامتی تصور بنیادی طور پر لاکاں کے تصور تخیلیت سے ماخوذ ہے۔لاکاں کا تصور تخیلات ایڈیپس یعنی تصورذات ہے جس کے تحت بچہ زمین پر ایک جنت نما تصور میں رہتا ہے اس پر خواہش اور مایوسی کی پرچھائیاں نہیں ہوتیں۔یہ شیر خوار اور لاشعور بچے کا ماڈل ہے یعنی یہ لاکانی تصور زبان کا نیا استعمال ہی ہے۔کرسٹیوا سیمیات کو شاعری کی زبان تصور کرتی ہے نہ کہ نثر کو۔یہ تصوراتی سطح پر نسائیت سے جوڑا ہوا ہے۔وہ زیادہ مثالیں بھی شاعری سے ہی لیتی ہے۔وہ متضاد جوڑوں کی رد تشکیل پر زور دیتی ہے۔ان جوڑوں کی تشکیل میں مرد اور عورت کی خصوصیات کو پدر سری نظام کے تحت ترتیب دیا گیا ہے جس کے مطابق عورت حیادار، نازک مزاج، شرمیلی، بزدل اور کمزور ہوتی ہے جبکہ مرد بہادر، مضبوط، جرات مند، اور ہمیشہ فاتح ہوتا ہے۔اس صنفی ناانصافی کی بناء پر عورت ہمیشہ ذہنی کشمکش اور تذبذب کا شکار رہتی ہے۔من گھڑت متضاد جوڑوں کی تقسیم کی اصل حقیقت بیان نہیں کی جاتی۔مغربی فلسفہ اورادبی نظریہ ہمیشہ اس غیر حقیقی متضاد جوڑوں کی درجہ بندی سے الجھتا رہا ہے۔روایتی انداز فکر مثبت سوچ کی موت ہے۔اسی کشمکش سے ایک ناختم ہونے والی گرم گرما بحث جنم لیتی ہے۔جس میں ایک فریق برتر اور دوسرا کمتر قرار دیا جاتا ہے۔وہ ایسی ناہموار صورت حال کو نہیں مانتی۔اس کے خیال میں عورت کی خاموشی نے پدری نظام کو طاقتور بنایا۔جو کہ عورت کے لیے لاتعداد خطرات اور مسائل کا گڑھ ہے۔اس لیے وہ کہتی ہے:

> "These binary oppositions are heavily imbricated in the patriarchal value system: each opposition can be analysed as a hierarchy where feminine side is always seen as the negative, powerless instance."(٦٥)

> "یہ بائنری مخالفت پدرانہ اقدار کے نظام ساتھ بہت زیادہ جڑی ہوئی ہیں:اس مخالفت کا تجزیہ ایک درجہ بندی کے طور پر کیا جاسکتا ہے جہاں نسائی پہلوؤں کو منفی اور کمزور مثال کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔"

رد تشکیل کا ایک طریقہ مختلف اور متضاد معانی دریافت کرنا خواہ یہ متن کا لاشعوری، شعوری اور معنوی سطح پر تجزیہ کرنا ہی کیوں نہ ہو۔اس لیے جوالیا کرسٹیوا اور ہیلن جیکس دریدا کے تصور رد تشکیل سے بہت متاثر تھی جس

کے تحت ان متضاد اور غیر حقیقی جوڑوں کے تصور میں تبدیلی ممکن ہے کیونکہ یہ معاشرتی تشکیل ہے ان میں کوئی فطری رویہ ظاہر نہیں ہوتا۔ سینڈر گلبرٹ اور سوزان گبر نے اس مسئلے کا The Mad Woman in Attic میں جائزہ لیا۔ ان مصنفین کے نزدیک تاریخی روایت کا حصہ بننے کا مطلب خود پر ظلم اور جبر کرنا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے فرائڈ کی نسوانی جنسیات کے تصور کی روشنی میں Female affilliation نسوانی الحاقی گروہ کا تصور قائم کیا جس کے مطابق یہ دیکھا گیا کہ مردانہ غالب معاشرے میں کس طرح ایک نوبالغ لڑکی مرحلہ بہ مرحلہ تانیثی اور تذکیری دباؤ سے دوچار ہوتی ہے۔ اس قسم کی کشمکش نے بیسویں صدی کی خواتین لکھاری کو متاثر کیا۔ ان لکھاری خواتین کی تحریروں کی وجہ سے ایک سادہ اور عام سی لڑکی کی زندگی تشریحات و توضیحات کا موضوع بن گئی جس نے جلد ہی نسلی اور گروہی اور جنسی حدوں کو توڑا۔ رحم مادر نے ہی عورت کو عورت بنایا اور اس کو ایک شناخت دینے کے ساتھ ساتھ ایسے تجربات سے دوچار کیا جس کا تعلق صرف عورت سے ہی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مولانااشرف علی تھانوی مترجم، القران، سورہ نساء، آیت نمبر۱، تاج کمپنی لمیٹڈ، پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۱

۲۔ سیمون دی بووا، عورت، ترجمہ یاسر خالد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۸

۳۔ عنبرین صلاح الدین، ڈاکٹر، فرہنگ صنفی مطالعات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۹۷

۴۔ Toril Moi.Feminist,female,Feminine.published by Palgrave Macmillan 1997 Page 107

۵۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نسوانی تنقید، مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۷

۶۔ آمنہ تحسین، ڈاکٹر، سماج اور صنفی تصورات (ادب کے آئینے میں)، ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۵

۷۔ Toril Moi.Feminist,female,Feminine.published by Palgrave Macmillan, 1997,page no 114.

۸۔ قرۃ العین، خواتین کی آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، علی گڑھ یونی ورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴

۹۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (جلد دوم)، مشتاق بک کارنر ۲۰۱۵ء، ص ۳۰۸

۱۰۔ مولوی نورالحسن نیر، نوراللغات (جلد دوم)، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۷۳۷

۱۱۔ مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات، فیروز سنز، لاہور، س ن، ص ۹۰۶

۱۲۔ ابو اعجاز صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء ص ۱۹۷

۱۳۔ روش ندیم، ڈاکٹر، منٹو کی عورتیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۷۰

۱۴۔ عامر سہیل، ڈاکٹر، اردو شاعری میں قدیم صنف ریختی، مشمولہ الماس تحقیقی جرنل جلد ۱۰، سندھ یونی ورسٹی کراچی، ص ۱۷۷

۱۵۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۶۴۔

۱۶۔ مالک رام، حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، اپنا ادارہ، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۲۔

۱۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور تحقیق، فکشن ہاوس، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷۶۔

۱۸۔ محمد شہزاد شمس، ڈاکٹر، عورت اور سماج، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۲۰۰۶، ص ۲۱۔

۱۹۔ مترجم، مولوی محمد حسین، عجائب الاسفار از ابن بطوطہ، صرف ٹائیٹل دلی پرنٹنگ ورکس فائن آرٹ برانچ، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۳۸۔

۲۰۔ آمنہ تحسین، ڈاکٹر، حیدر آباد کا نسائی ادب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۴۸

۲۱۔ القران، سورہ نساء، آیت نمبر ۳۲، ص ۱۳۱
۲۲۔ لیلے احمد، عورت جنسی تفریق اور اسلام، مشعل پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۸
۲۳۔ وارث میر، پروفیسر، کیا عورت آدھی ہے؟، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ص ۴۸۔۴۹
۲۴۔ اشرف علی تھانوی مترجم، القرآن، سورہ نور، آیت نمبر ۳۱، ص ۵۶۴
۲۵۔ اشرف علی تھانوی مترجم، القرآن، سورہ نساء، آیت نمبر ۳۴، ص ۱۳۲
۲۶۔ وارث میر، پروفیسر، کیا عورت آدھی ہے؟، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص ۶۰
۲۷۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۴۰۲۔
۲۸۔ شائستہ شریف، تانیثیت پر اعتراضات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، مشمولہ "معیار، جلد نمبر ۱۵۔۱۶" آن لائن، یکم جون ۲۰۱۶ء، ص ۲۸۳۔
۲۹۔ کشور ناہید مرتب، خواتین افسانہ نگار ۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۰
۳۰۔ جان نثار مومن، تانیثیت: چند بنیادی مباحث، اردو ریسرچ جرنل شمارہ نمبر ۸، اگست ۲۰۱۶، ص ۵۶
۳۱۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۶۷
۳۲۔ www.britannica.com>topic last seen 24.3.2021.9.54PM
۳۳۔ www.iup.edu.last seen 27.3.2021.2.46PM
۳۴۔ Long man dictionary, longman Group Ltd.1978, Page
۳۵۔ عنبرین صلاح الدین، ڈاکٹر، فرہنگ صنفی مطالعات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۴۸
۳۶۔ فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن، فیمنزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۳۷
۳۷۔ جان نثار مومن، تانیثیت چند بنیادی مباحث۔ ص ۵۶
۳۸۔ دیویندر اسر، تانیثیت: چند پہلو، مشمولہ ادب اور تانیثیت، انور پاشا (مرتبہ) عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۴ء ص ۷۰۔
۳۹۔ مرزا خلیل بیگ، ادبی تنقید کی لسانی مضمرات، ایجوکیشنل بک، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۱۔۲۲۲
۴۰۔ خالد سہیل، مغربی عورت ادب اور زندگی، رپن پریس، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۷۵
۴۱۔ وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، تاب محل، الہ آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۴
۴۲۔ جون ہانام، عورتوں کی تحریک آزادی، مترجم یاسر جواد / سعدیہ جواد، الفیصل، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۷۰
۴۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، فرانسیسی انقلاب، ان پیپڈس اردو ویب گاہ، جمعرات ۱۴ نومبر ۲۰۱۹ء، ۷:۳۰ شام
۴۴۔ نیلم نسیم، تانیثیت ایک تعارف، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۷۷
۴۵۔ ایضاً، ص ۱۸۶

۴۶۔ ایضا، ص ۱۹۰
۴۷۔ جون ہانام، عورتوں کی تحریک آزادی، مترجم یاسر جواد / سعدیہ جواد، الفیصل، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۱۴۴
۴۸۔ وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، تاب محل، الہ آباد، ۲۰۰۲ء ص ۲۲۱
۴۹۔ آمنہ تحسین، ڈاکٹر، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸، ص ۱۸۲
۵۰۔ آمنہ تحسین، ڈاکٹر، حیدر آباد کا نسائی منظر نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۸۰
۵۱۔ اویس الحسن، قائد اعظم کے وژن کے مطابق قوم کی کردار سازی، مشمولہ ہلالِ اردو، افواجِ پاکستان کا مجلہ، آن لائن ریسرچ، ۱۴ فروری ۲۰۲۳ء، بوقت ۳۴:۱ منٹ
۵۲۔ وارث میر، پروفیسر، کیا عورت آدھی ہے؟، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۴
۵۳۔ نور الصباح بیگم، تحریک پاکستان اور خواتین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ن س، ۲۷۳
۵۴۔ ایضاً، ص ۲۹۰
۵۵۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۵
۵۶۔ ایضا، ص ۹۷
۵۷۔ زبیر رانا، پاکستان تہذیب کا بحران، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۷ تا ۸
۵۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، تعلیم اور سماجی حد بندیاں، الیکٹرونک کاپی روزنامہ دنیا، لاہور، ۱۹ دسمبر ۲۰۲۱ء
۵۹۔ آمنہ تحسین، ڈاکٹر، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸، ص ۱۶۰
۶۰۔ رامن سیلڈن، نظریہ ادب کے رہنما اصول، ترجمہ: اعزاز باقر، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۱
۶۱۔ جون ہانام، عورتوں کی تحریک آزادی، متراجم یاسر جواد / سعدیہ جواد، الفیصل، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۲۵
۶۲۔ www.wikipidea.last seen 3.7.2021.1.13PM
۶۳۔ Eline Showalter , Towards Feminist Politic, Women writing and writing about Women in the New Feminist , Randam House,1988, Page.
۶۴۔ قاسم یعقوب، لفظ اور تنقید معنی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۳۰
۶۵۔ Belse and Jane Moore ,Gender and the politics of literary Criticism Palgrave , Macmillan.1999, Page

باب دوم:

خواتین کی آپ بیتیوں میں تانیثی شعور: تشخص کی تلاش واثبات کے تناظر میں

آپ بیتی اپنے اوپر گزرنے والے حالات و واقعات کو موثر انداز میں لکھنے کا نام ہے جس کو خود نوشت بھی کہا جاتا ہے۔ شخصی عکاسی ہر صنف ادب میں ہوتی ہے مگر فن سوانح نگاری کی سب سے مستند صنف آپ بیتی ہے کیوں کہ روداد حیات وہی بیان کرتا جس پر بیتی ہوتی ہے۔ وہ واقعات کو صحت کے ساتھ جائز اور مناسب تسلسل سے بیان کرتا ہے۔ آپ بیتی داخلی وخارجی محرکات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں مصنف اپنے خیالات، احساسات، صدمات اور تاثرات بیان کرتا ہے انگریزی زبان میں آپ بیتی کے لیے Auto biography کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ Auto کا مطلب ہے خود اور biography کا مطلب ہے لکھنا۔ یہ دو یونانی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں سوانح نگار خود ہی اپنا ناقد اور تجزیہ نگار ہوتا ہے۔ یہ زندگی کے مقاصد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ سوانح حیات کوئی دوسرا لکھتا ہے تو اس کے لیے ماخذات تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس کے مکمل ہونے کے باوجود شبہات پائے جاسکتے ہیں جبکہ آپ بیتی مکمل اور نامکمل دونوں صورتوں میں لکھی جاتی ہے اس کے باوجود غلطی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ دوسرے سوانح نگاروں اور محققین کے لیے مستند ماخذ کی اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ آپ بیتی کا ہر لمحہ تجربات کی روشنی میں ریکارڈ ہوتا ہے۔ مصنف کی ذات، اس کے خاندان کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی، سماجی، معاشرتی حالات کا بیانیہ بھی ہوتی ہے۔ جس میں حقائق کو سچائی اور بے باکی سے بیان کرنا ضروری ہے۔ جب کہ اپنی ذات سے محبت کی بنا پر آپ بیتی لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں یا تو مصنف سب کچھ چھپا جاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق: ”انسان کی دل چسپی کا سب سے بڑا مرکز اس کی ذات ہے۔ اور سب سے بڑا خوف انکشاف ذات ہے۔“[۱] ”سوانح عمری لکھنے کے دوران دو رکاوٹیں ہوتی ہیں:

دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت “[۲] یوسف جمال انصاری کے مطابق

:”جب ہم سوانح مرتب کرتے ہیں تو گویا ہم ہر سانس کا محاسبہ لے رہے ہوتے ہیں۔“[۳]

آپ بیتی لکھنے کا عمل کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہے۔ روسو نے اپنی آپ بیتی ”اعتراف“ میں تمام حقائق کو بے باک انداز میں بیان کیا ہے روسو جیسی سچائی کی تشہیر کرنا مشرقی مصنف کے لیے ممکن نہیں ہے۔ عیسائی مذہب میں بھی یہ تصور عام تھا کہ جو شخص اپنے گناہ کا اعتراف کرلے اس کے گناہ معاف کر دیے جاتے تھے۔ مغرب کا ماحول آپ بیتیوں کے لیے بہت موزوں تھا۔ اس لیے انگریز اپنے ساتھ ہندوستان میں آپ بیتی بھی لائے۔ ریحانہ

خانم کے مطابق:"سوانح عمری کسی شخص کے حالات وواقعات، داخلی اور خارجی کوائف کا مجموعہ ہونے کے علاوہ اس ماحول ،زمانے اور سماج کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔"(۴) سماجی قیود اور اخلاقی معروضات سے پردہ ادب ہٹادیتا ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو چھپادینے کا بہترین طریقہ سوانح عمری لکھ دینا ہے۔ آل احمد سرور نے آپ بیتی کو جگ بیتی کا نام دیا۔ایک فرد صرف اپنے خاندان سے ہی نہیں بلکہ اداروں، شخصیتوں، معاشرتی، معاشی اور سماجی ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے۔

دوسری اصناف ادب کی طرح آپ بیتی اٹھارویں صدی میں انگریزی ادب سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ آپ بیتی کی ایک صورت صوفیاء اکرام کے ملفوظات بھی ہیں۔"تزک بابری "کو خودنوشت کی صورت میں اور تزک "جہانگیری"کو روزنامچے کی شکل میں لکھا گیا پرویز پروازی توزک کی صنف کو آپ بیتی میں شامل نہیں کرتے۔باقاعدہ طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہی آپ بیتی کا رجحان نظر آتا ہے جس میں جنگ کے حالات وواقعات بیان کیے گئے ہیں، پہلی آپ بیتی مولانا محمد جعفر کی "کالا پانی" تھی۔اس میں مولانا نے جلاوطنی کے دوران گزرے گئے لمحات کے بارے میں لکھا۔اسی دور میں شہر بانو کی آپ بیتی "بیتی کہانی" لکھی گئی۔ڈاکٹر معین الدین عقیل نے تو اسے اولین آپ بیتی کا نام دیا۔وہ لکھتے ہیں:"اسے نساخ اور جعفر تھانیسری کی مذکورہ تصانیف سے قبل تخلیق میں آنے والی اور اولین خودنوشت سوانح عمری کہا جانا چاہیے۔"(۵)

جب کہ ڈاکٹر روف پاریکھ کے مطابق شہر بانو کی بیتی کہانی ۱۸۸۵ء میں لکھی گئی اور مولانا جعفر تھانیسری کی کالا پانی ۱۸۸۶ء میں منظر عام پر آئی۔اس لحاظ سے خواتین نے آپ بیتی لکھنے کی جسارت پہلے کی۔ دوسری آپ بیتی تزک کی صورت میں سلطان جہاں بیگم تزک سلطانی ۱۹۰۳ میں لکھی گئی۔س جس کے تین حصے ہیں پہلا حصہ تزک سلطانی، دوسرا حصہ گوہر اقبال اور تیسرا حصہ اختر اقبال کے نام سے تھا۔ سلطان جہاں بیگم نے سرزمین بھوپال پر حکومت کی۔ یہاں پر تقریبا دوسو سال تک خواتین کی حکومت رہی۔انہوں نے خواتین کی فلاح وبہبود کے لیے بہت کام کیے۔ زمانہ تحصیل عطیہ فیضی کے خطوط پر مشتمل آپ بیتی ہے جو وہ اپنے سفر انگلستان کے دوران اپنی بہن زہرہ بیگم کو لکھتی رہیں۔یہ خطوط رسالہ تہذیب نسواں میں شائع ہوئے۔ عطیہ فیضی ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ اسکالرشپ پر لندن اعلی تعلیم کے لیے گئی تھیں تاکہ اپنے علم کی شمع سے دوسری خواتین کو منور کر سکیں مگر علیل ہو کر وطن واپس آئیں۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں مقیم رہیں۔ان خطوط کو ۲۰۱۰ء میں محمد یامین عثمان نے مرتب کیا۔عطیہ فیضی اور ان کی بہن زہرہ بیگم دونوں حق نسواں کی حامی تھیں "نیرنگ بخت" وزیر سلطان بیگم کی آپ بیتی ہے اس آپ بیتی کی خاص بات یہ ہے کہ مصنفہ طلاق ہونے کے بعد اپنے حق مہر کا مطالبہ کرنے عدالت گئیں۔اس کے بعد ایک اداکارہ کی آپ بیتی اور ڈپٹی نذیر احمد کی نواسی قیصری بیگم کی آپ بیتی کتاب زندگی شائع

ہوئی۔اس آپ بیتی میں نسوانی محاورات کی چاشنی ملتی ہے۔ بیگم محمد پاشا کی آپ بیتی ہماری زندگی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی اس کتاب کے دو حصے ہیں۔پہلا حصہ خاندانی پس منظر پر جبکہ دوسرا حصہ مصنفہ کی تعلیمی کارکردگی اور سماجی خدمات پر مشتمل ہے۔ بیگم محمد پاشا نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایم اے کیا۔اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں خواتین نے بڑی دلیری سے آپ بیتاں لکھیں۔اس وقت برطانوی نو آبادیاتی نظام کے تحت خواتین کے لیے تعلیم اور ملازمت کے مساوی راستے کھل گئے تھے اس سے پہلے خواتین تخلیق کاروں کی تخلیقات کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔خواتین کی آپ بیتیاں مردوں کے مقابلے میں کم ہیں اس کی وجہ جرات اظہار کی کمی ہے۔رشیدہ عیاں نے منظوم آپ بیتی میری کہانی کے نام سے لکھی۔شائستہ اکرام اللہ کی آپ بیتی پردے سے پارلیمنٹ تک ہے۔انہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا اور ۱۹۴۰ء میں لندن سے اردو میں پی۔ایچ-ڈی کرکے آئیں۔تقریبا سات سال تک پاکستان میں پارلیمنٹ کی رکن رہیں اور حکومت کی غلط پالیسیوں کے خلاف صدائے حق بلند کرتی رہیں۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سوانح نگاری کے سایے میں خودنوشت پروان چڑھی۔خودنوشت کے مصنف کا قلم آزاد، خود مختار اور بے باک ہوتا ہے وہ اپنے احساسات ،جذبات اور مشاہدات کو آسانی سے منتقل کر سکتا ہے اس لیے وہ اپنا تماشائی اور تماشا نگار ہوتا ہے وہ اپنی تصویر خود اپنے ہاتھوں سے تخلیق کرتا ہے۔فنکاروں کی زندگی میں دلچسپی آج بھی قائم ہے ان کی سوانح عمریاں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ڈاکٹر وارث علوی ایلیٹ کے قول کو دہراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ہملٹ کو سمجھنے کے لیے ہمیں شیکسپئر کے متعلق اتنا کچھ جاننا پڑے گا کہ وہ خود اپنے بارے میں نہیں جانتا تھا۔"(۶) اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔

خواتین نے خودنوشت میں بہت کم طبع آزمائی کی اس کی وجہ عورتوں کا زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونا، معاشرتی دباؤ اور اپنی ذات کو معاشرے کے سامنے اجاگر نہ کرنا ہے۔عورتوں نے اپنی ذات کا اظہار کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔اس لیے مردوں کی آپ بیتیاں عورتوں کی نسبت زیادہ ہیں۔تاہم اکیسویں صدی میں خواتین کی کچھ منفرد آپ بیتیاں لکھی گئیں جنہوں نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔اس لیے سید شاداب حسن لکھتے ہیں:

> "اکیسویں صدی کے شروع میں کچھ چونکا دینے والی خودنوشتیں بھی سامنے آئیں۔ان میں نسوانی اور جذباتی احساسات کی ترجمانی ہونے کے ساتھ ساتھ عورتوں کی بے باکی اور جرات اظہار کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ان کے اندر نسائیت بھی ہے اور تانیثیت بھی۔وقت کے ساتھ خواتین کے اتار چڑھاؤ کا انداز بھی ہوتا ہے۔"(۷)

۱۔ عورت بحیثیت فرد:

فرد کی فکری سوچ کسی بھی معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے کیوں کہ فرد سماج کو تشکیل دیتا ہے اور سماج فرد کے رویوں، فکر، تخلیق اور تہذیب و تمدن سے نمو پاتا ہے۔ فرد سماج میں فعال اور غیر فعال دونوں طریقوں سے زندگی گزرتے ہیں جو کچھ اس کے بس یا اختیار میں ہوتا ہے وہ ذمہ داری بن جاتا ہے جیسے پیشہ وارانہ فرائض وغیرہ۔ فرد پر پیشہ وارانہ اور اخلاقی قسم کی ذمہ داریاں لاگو ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اہم ترین ذمہ داری معاشرے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا اور اسے بدلنے کی کوشش کرنا۔ بقول قاسم یعقوب کے "افراد قوموں کے مزاج کا آئینہ ہوتے ہیں۔ قوموں کا زوال افراد کی سطح سے شروع ہوتا ہے۔"(۸)

فرد میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں بد قسمتی سے ہمارا ہندوستانی معاشرہ طبقات میں بٹا ہوا ہے جہاں پر چھوٹے بڑے، آقا، غلام مرد اور عورت میں فرق روا رکھا جاتا ہے اس لیے عورت کو بحیثیت فرد جلد تسلیم نہیں کیا گیا اور اگر تسلیم کیا بھی گیا تو عورت کو ثانوی درجہ دیا گیا۔ بر صغیر میں جاگیر دارانہ نظام ہونے کی وجہ سے عورت کو ذہنی طور پر غلام بنایا جاتا ہے جس کے لیے مختلف قسم کے پدرانہ حربے استعمال کیے جاتے ہیں اس لیے ہمارے ہندوستانی معاشرے میں عورت مرد کی تابع تھی۔ اس کی اپنی ذات اسی فرمان برداری میں کہیں کھو گئی تھی ستی ہونا عورت کے لیے وفاداری، پاک بازی اور نیکی کی علامت بن گیا تھا۔ جو عورت مرد کی خواہشات پوری کرتی ہے اس کی معاشرے میں مانگ بڑھ جاتی ہے۔ عورت کو ایک کٹھ پتلی گڑیا کی صورت میں پیش کیا جاتا۔ جس کا خوب صورت ہونا بہت ضروری ہے کیوں کہ خوب صورت عورتوں کو امراء بادشاہ کے دربار میں تحائف کی صورت میں پیش کرتے۔ کانٹ جیسے فلسفی نے بھی عورتوں کی ذہنت سے زیادہ خوب صورتی پر زور دیا اسی لیے عورت کی خوب صورتی کے معیار مقرر کیے گئے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب "تاریخ اور عورت" میں عورت کی خوب صورتی کے معیار کو یوں بیان کیا ہے: "ایک مکمل خوب صورت عورت کا چہرہ انگریز عورت کا ہو، جسم جرمن کا، اور دلربائی پیرس والی ہو۔"(۹) سائمن دی بوار نے بھی عورت کی خوب صورتی کے متعلق کی جانے والی معاشرتی توقعات کا ذکر کیا ہے کہ اس کا گڑیا کی طرح سمارٹ، لمبے بال اور رنگ گورا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ وہ شادی تک خود کو خوب صورت بنانے کے لیے میک اپ کا خول چڑھاتی ہے۔ ہمارے پدر سری معاشرے نے عورت کی ذات کو ہمیشہ دبایا ہے اور اس کی شخصیت پر اپنی پسند کی تہیں چڑھا دیں۔ وہ مرد کی بنائی ہوئی اقدار اور روایات میں کھو گئی۔ عورت اور مرد کی خصوصیات مقرر کرتے ہوئے بھی عورت کو دوسرا درجہ دیا گیا۔ ارشد محمود نے اپنی کتاب "ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ" میں مرد اور عورت کی معاشرتی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "پدر سری معاشرے میں مردوں کو سخت جان، آزاد، خود

مختار اور صاحب عقل سمجھا جاتا ہے جبکہ عورتوں کو جذباتی، تسلیم خو اور اطاعت پر مائل ہو جانے والا"(۱۰) تاریخ میں بھی عورت کو اچھے لفظوں سے نہیں یاد کیا جاتا بلکہ اسے معاشرتی زوال کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اکثر یہ مشہور تھا کہ شراب اور عورت نے معاشرے کو تباہ کر دیا عورتوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ان کی مردانہ صفات ختم ہو گئیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے عورت کی ذات اور تشخص کو نقصان پہنچانے کے لیے مذہبی تعلیمات کا سہارا لیا۔ جاگیر دارانہ نظام کو سہارا دینے کے لیے بہت سے اسلامی مفکرین نے بھی تفاسیر کو من پسند انداز سے بیان کیا تا کہ عورت ذہنی غلامی کے لیے خود کو تیار کر لے۔ ہمارے ہاں بھی علماء کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ عورت کو سیاست میں نہیں آنا چاہیے اور نہ انہیں سربراہ مملکت بنانا چاہیے۔ عورت کو تربیت بھی خوب صورت ہونے اور اپنی خواہشات اور ہر چیز پر قربانی دینے کی دی جاتی ہے۔ اس کو ہمیشہ اپنے سے جڑے رشتوں کی مدد سے ہی پہچانا جاتا ہے جیسے بیوی، بہن، بیٹی، بہو تو پھر اس کی اپنی ذات کہاں ہے؟ کیا اس کی اپنی کوئی اہمیت یا ذات نہیں ہے؟ کیا اس کا اپنا بھی کوئی نام یا پہچان ہے جس کو باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کے ناموں میں چھپا دیا جاتا ہے فلاں کی دختر، بیگم، والدہ وغیرہ اس سب کا قصوروار پدر سری معاشرہ ہے ان ناموں کو چھپانے کی وجہ عورت کے ساتھ منسوب غیرت کا تصور ہے جس کا سارا بوجھ عورت اٹھاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں مرد متحرک ہیں تو عورتیں جمود کا شکار ہیں جو اپنی انفرادیت کو منوانے سے قاصر ہیں۔ ڈاکٹر عتیق اللہ کے مطابق:

> "معاشرے میں مرد جہاں سرگرم اور اپنے وجود کی خود تصدیق ہے خود نگر و خود نگر ہے عورت محض ایک دست نگر ہے جسے نہ تو اپنی شخصیت خود بننے کا حق ہے اور نہ انفرادیت کی تشکیل و تکمیل میں وہ آزاد ہے۔"(۱۱)

عورت کے لیے سب سے بڑا مسلہ عورت ہونے میں ہی مضمر ہے جب کہ مرد کا مرد (مردانگی نہ ہونے کے باوجود) ایک نوع کی ڈھال ہے۔ عورت کا صرف تولیدی کردار ہی سامنے آتا ہے۔ اچھی بری عورتوں کے معیار بھی مردوں نے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ عورت شعوری لاشعوری طور پر مرد کی خوشنودی کے لیے سعی کناں میں رہتی ہے۔ عورت کو دی جانے والی خصوصیات بھی مردوں کی طرف سے تفویض کی جاتی ہیں۔ معاشرے میں مرد فاعل ہے وہ طاقت ور، حاکم اور اقتدار کا حق دار ہے جب کہ عورت مفعول ہے جس پر مرد اپنی مرضی چلا سکتا ہے۔ وہ معاشرے کے مرد کی ضروریات پوری کرتی ہے اس لیے کمزور، بزدل، جذباتی اور محکوم ہے۔ عورت کا شعور ذات مرد کی پیداوار ہے۔ عورت اپنی شناخت کے سلسلے میں مرد کی پابندیوں کی تابع ہے برصغیر کے صنفی امتیازات کو بیان

کرتے ہوئے فاطمہ حسن لکھتی ہیں: "یہاں کے اقدار وروایات مردانہ سماج کے طابع ہیں، اس طرح صنفی امتیاز کی واضح صورت حال نمایاں ہوتی ہے جو مرد کی قائدانہ برتری نے پیدا کی ہے۔"(۱۲)

جہیز کی وجہ سے بھی عورت کو معاشرے پر بوجھ سمجھا جاتا ہے اسی لیے اس کی پیدائش پر خوشی کی بجائے سوگ منایا جاتا ہے۔ لڑکی کے باپ کی نظریں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں پہلے عربوں میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا تو اب ذہنی اور سماجی طور پر دفن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی، اس لیے عورت کی پرورش کے سلسلے میں فطری قوانین کو مد نظر رکھنے کی بجائے پدرانہ نظام کی برتری کو مد نظر رکھا گیا ہے گھریلو اور علمی تعلیم میں فرق رکھا جاتا ہے لڑکی کی ماں اور دوسری بزرگ عورتیں لڑکی کو سسرال سے اتنا ڈراتی ہیں کہ وہ محبوبہ سے لے کر باندی تک ہر کردار خوشی خوشی سرانجام دیتی ہے اس کے لیے اس کو رشتوں کے غیر مرئی زیورات پہنائے جاتے ہیں وہ ماں، بہن، بیوی بیٹی جو کچھ مرضی ہو وہ مرد کی ماتحت ہے۔ عورت کی ذات مسائل روایات اور اقدار سے جڑ گئی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "عورت اور تاریخ" میں لکھتے ہیں: "عورت کی اپنی ذات اور وجود برقرار رہتا ہے مگر چھپا ہوا، کئی تہوں کے نیچے، وہ مرد کی بنائی ہوئی روایات واقدار اور اداروں کے درمیان کھوئی ہوئی اور گم شدہ ذات ہے۔"(۱۳) ہمارے معاشرے میں عورت سے دوستی کا تصور مفقود ہے دوستی یک طرفہ نہیں ہوتی دوطرفہ ہوتی ہے جس میں برابری کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ عورت کی کوئی انفرادی اور خود مختار زندگی نہیں ہے۔ وہ باپ، بھائی بیٹے اور سسر کے اختیار میں ہوتی ہے وہ اپنی شخصیت کو ترک کر کے طے شدہ مردانہ اصولوں کے تحت زندگی گزارے تو بہتر ورنہ وہ نتائج کی خود ذمہ دار ہو گی۔ عورت مرد کے سماج میں مرد کے خود ساختہ قواعد وضوابط کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ایسے سماج میں عورت کو حصول آزادی کے لیے دوسری انتہا تک جانا پڑتا ہے وہ تمام قواعد و ضوابط جو مرد نے شرم وحیا اور عزت وعصمت کی صورت میں ایک آئیڈیل عورت کے لیے بنائے ہیں انہیں توڑ کر آزادی کا اعلان کرتی ہے تو معاشرے کی نظر میں بدکردار کہلاتی ہے کیوں کہ ہمارے روایتی اور مشرقی معاشرے میں صرف طوائف ہی آزاد اور خود مختار نظر آتی ہے۔ عورت کے بارے میں جسم ذات، روح، وجود اور شخصیت کے بارے میں سنجیدہ اور ہمہ گیر خیالات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے سائمن دی بوار نے کہا تھا عورت ہوتی نہیں بلکہ بنا دی جاتی ہے۔ عورت کو یا تو تاریخ میں رکھا ہی نہیں جاتا یا پھر حاشیے میں جگہ دی جاتی ہے۔ ہمارا خاندانی نظام مرکزیت، آمریت اور مردانہ آمریت کا شکار ہے کیوں کہ مرد نے طاقت اور اختیار اپنے پاس رکھا ہے۔ جنسی پابندیوں نے ہمارے اندر اخلاقی گراوٹ پیدا کر دی ہے۔ جنسی گھٹن کا ہماری تہذیب کی بربادی میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ہماری اخلاقی عمارت منافقت کے عارضی ستونوں پر کھڑی ہے۔

اس سب کے باوجود عورت نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی بلکہ مستقل مزاجی سے مردوں میں اپنی پہچان بنائی اور یہ ثابت کروایا کہ مرد اور عورت ہونے سے بھی زیادہ ضروری انسان ہونا ہے اور عورت ایک انسان ہے جس کی اپنی خواہشات، احساسات اور نظریات ہیں۔ عورت اپنی انفرادی آزادی اور خود مختاری کو حاصل کرنے کے لیے آج وہ زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے۔ عورت نے اپنے ذاتی شعور کو بڑھانے کی تگ و دو کی ہے۔ اگرچہ ہر نظام نے عورت کو پسپا کرنے کی بھرپور کوشش کی خواہ وہ جاگیر دارانہ نظام ہو یا سرمایہ دارانہ نظام۔ سائمن دی بوار نے ہمارے معاشرتی ڈھانچے میں عورت کو دیئے جانے والے مقام کی مخالفت کی اور عورت کی ذات کے تشخص کے لیے فلسفہ وجودیت کو لازمی قرار دیا جس کے مطابق وہ اپنی زندگی کے فیصلے ایک عام فرد کی طرح خود کر سکتی ہے اسی نظریے کی حامی بہت سی ادبی ادباء بھی ہیں۔

صوفی بزرگوں نے شعور ذات کو تصوف جبکہ علامہ اقبال نے خودی کا نام دیا۔ میڈ کے نظریے کے مطابق اس کا اظہار صغیہ واحد متکلم "میں" بطور فاعلی کیفیت اور "مجھ" بطور انفعالی کیفیت سے کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "میں" کو ذات کا داخلی پہلو اور "مجھ" کو معاشرتی پہلو قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ مجھ ایسی کیفیت ہے جو میں کو دوسروں کے آئینے میں دیکھ کر قائم کی جاتی ہے، جبکہ "انا" میں اس کا تعلق اپنی ذات سے ہے، جو دوسروں کے نقطہ نظر سے بے پرواہے جبکہ مجھ کو ہر وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ دوسرے میرے متعلق کیا کہتے ہیں۔ کولے اپنے تصور "خود شناسی" میں کہتا ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اپنے جذبات کے برملا اظہار کی اجازت نہیں دیتا۔ بڑا ہو کر بچوں کو اپنا ہر فعل معاشرے کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت سرانجام دینا ہوتا ہے تاکہ اس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ یہ احساس دوسرے اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کولے اسے آئینہ شناسی کہتے ہوئے اس کی وضاحت تین حصوں میں کرتا ہے۔

ا۔ دوسروں کا ہماری شخصیت کے بارے میں تصور

۲۔ دوسروں کی ہماری شخصیت کے متعلق قیاس آرائی

۳۔ جذبہ افتخار یا احساس شرمندگی

عورت کے شعور ذات کے حوالے سے اس کی اپنی ذات کم اور معاشرے کے نظریات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کیوں کہ ماؤں کو بچیوں کی ذات کم اور خاندان کی عزت زیادہ عزیز ہوتی ہے وہ ماں کو بھی اطاعت گزار دیکھتی ہیں اس لیے ان کے سامنے کسی مضبوط عورت کا کردار نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر وہ اپنے رویے تشکیل دیں۔ لڑکیوں کو اطاعت گزری سیکھائی جاتی ہے جب کہ لڑکے اس سے آزاد ہیں ان کی تربیت لڑکیوں سے مختلف کی جاتی ہے لڑکی

کے پیچھے کوئی جارہا ہو تب بھی والدین کے دل میں خوف طاری ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے ؟ مغرب کی عورت اپنا وقت اپنی ذات پر صرف کرتی ہے جبکہ مشرقی عورت اپنا ہر کام گھر والوں کی مرضی سے تشکیل دیتی ہے۔

تانیثیت کی تیسری لہر میں عورت کی ایک نئی شبیہ ابھر کر سامنے آئی کہ وہ طاقت ور اور جنسی لحاظ سے خود مختار ہو گئی۔ اس میں عورت کی معاشی، سیاسی اور سماجی خود مختاری کے ساتھ ساتھ انفرادیت پر بھی توجہ دی گئی۔ جس سے عورت کا تشخص سامنے آیا۔ کچھ عورتیں متضاد تشخص کی بھی حامل تھیں۔ جیسے طوائفہ ،بیوی، نیک لڑکی، لسبین اور سیکس سمبل کی حیثیت سے پہچانی جاتی تھیں۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے دوسروں کے نام کا سہارا لیا کیوں کہ اس کو پس پردہ رکھا گیا اس لیے ہی عورت تاریخ میں غائب ہے۔ بڑے بڑے مصنفین نے اس کو عام اور معمولی کرداروں کی صورت میں پیش کیا۔ اس پورے عمل میں عورت اپنی پہچان کی تلاش میں ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے تحت عورت کی حیثیت پس کر رہ گئی انیسویں صدی تک برصغیر میں عورت کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی البتہ مشنری سکولوں نے جدید ماحول سے آنے والی خواتین کو متعارف کروایا۔ ان کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی صلاحیت پیدا کی۔ سائمن دی بوار نے فلسفہ وجودیت کو تانیثیت کا مرکز بنایا جس کے تحت مرد عورت کچھ نہیں دونوں انسان ہیں ان دونوں کو آگے بڑھنے کے مواقع ملنے چاہیں اور وہ اپنے فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں اور اس کی خود ذمہ داری بھی خود قبول کرے۔ پوری نسائی تاریخ عورت کی نسوانیت اور مرد کی مردانگی پر مشتمل ہے جبکہ تانیثیت اس کو ایک آزاد فرد کا درجہ دیتی ہے

خود شناسی کے لیے فکر اور ذکر دونوں کی ضرورت پڑتی ہے جس طرح ہر ذرے میں نظام شمشی کارفرما ہے۔ اس طرح ہر ہستی کے جذبات واحساسات کا مدوجزر بھی یکساں نہیں ہے۔ انسانیت کی قدر مشترکہ سب انسانوں میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے آپ بیتی ہر انسان کو آئینہ دکھاتی ہے اور اپنی ذات سے متعارف کرواتی ہے۔ عورت کو آزادی اور مساوات دینے سے نہ صرف عورت آزاد ہو گی بلکہ یہ معاشرے کو نئی توانائی دے گی عورت کی صلاحیتیں جو ایک چار دیواری کی حد تک مقید ہیں وہ کھل کر سامنے آئیں گی اور پورے معاشرے کو ایک نئی زندگی دیں گی۔

خواتین کی موجودگی کا احساس ابتدائی دور میں ہی ہو جاتا ہے اگرچہ ان کا انداز محدود ہی سہی۔ خود شناسی کا یہ اظہار "بیتی کہانی" کی شہر بانو کو بھی آیا جو اس نے مس فلیچر کے کہنے پر لکھی۔ ان دونوں میں علمی روابط تھے۔ اس "بیتی کہانی" میں پیدائش سے لے کر چالیس سال کی عمر تک کے حالات وواقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ شہر بانو ایک عام سی گھریلو خاتون ہے جس کا تعلق نواب گھرانے سے تھا اس کی شادی بھی نواب خاندان میں ہوئی۔ اس

خاندان کی چمک دمک سے لے کر کھوکھلے پن تک کے حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس اپ بیتی میں ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد میں خواتین کی حالت زار کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آپ بیتی کو ابواب کی بجائے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ پیدائش اور شادی کے، دوسرا حصہ خاندان کی تاریخ اور ۱۸۵۷ء کے حالات پر، جبکہ تیسرا حصہ ازدواجی زندگی کے متعلق ہے۔ بچپن میں طے کی جانے والی شادی کی دھوم دھام اور دولت کی نمائش نے لوگوں کے اندر یہ خوش فہمی پیدا کر دی کہ یہ لڑکی بہت خوش قسمت ہے مگر اچھی قسمت کا تعلق مزاج کی ہم آہنگی، اتفاق اور آپس میں پیار محبت پر منحصر ہے۔ کسی امیر شخص سے شادی ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ عورت خوش قسمت ہے بلکہ اس کا اندازہ تو اس کی حالت زار سے لگایا جانا چاہیے اس آپ بیتی کا انجام ہماری فرسودہ رسم ورواج اور کاہلی کی وجہ سے بہت ہی المناک ہوتا ہے۔ آپ بیتی انکشاف ذات کا بھی ذریعہ ہے اس لیے ڈاکٹر تحسین فراقی کے مطابق ایک سچی آپ بیتی انکشاف ذات کا عمل ہوتی ہے۔ شہر بانو اپنی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "بو امس فلیچر میری کہانی پڑھ کر تم کیا نفع پاؤ گی، رنج وغم کھاؤ گی، اپنا جی دکھاؤ گی اور کچھ حظ نہ اٹھاؤ گی۔ اگر ضد ہی کرتی ہو تو ایلو میں اپنی سر گذشت ابتدا سے انتہاء تک لکھے دیتی ہوں۔ ذرا خیال سے پڑھنا، گھبرا نہ جانا۔"(۱۴)

ہمارے معاشرے میں عورت کی پہچان مرد کے نام سے منسوب ہے جس میں باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا شامل ہیں۔ کیا عورت کی بحیثیت انسان اپنی کوئی پہچان نہیں۔ انھی رشتوں سے اپنی پہچان اور شناخت مستعار لیتی ہے تو پھر اس کی اپنی انفرادی شخصیت کہاں ہے؟ اس آپ بیتی کو لکھنے کے بعد مصنفہ کو اپنی ذات اور دکھوں کا اندازہ ہوا جو اپنی تلاش میں نکلی تھی۔ شہر بانو پڑھی لکھی ایک گھریلو خاتون تھیں۔ جس کو شادی کے بعد پے در پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ایک شہر بانو کی کہانی نہیں بلکہ برصغیر کی ہر عورت کی کہانی ہے جو معاشرے کی روایات کی نظر ہو کر بہتر معیار زندگی سے محروم رہتی ہیں جو کہ ان کا حق ہے وہ بھی چھین لیا جاتا ہے۔ ایک نواب اور بادشاہ کی بیٹی جس کو سب رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کس طرح لاچار اور توڑ پھوڑ کا شکار ہے۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کا تعلق بھی بنگال کے ایک نواب خاندان سے تھا جہاں پر پردے کی سخت پابندی کی جاتی تھی۔ لڑکیوں کو واجبی سی تعلیم کے ساتھ گھر داری سکھائی جاتی تھی۔ لڑکوں کو اعلی تعلیم دی جاتی۔ ان کی دادی نے اپنا زیور بیچ کر اپنے چاروں بیٹوں کو اعلی تعلیم دلوائی۔ ان کی پھپھو خجستہ اختر بانو کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا انہوں نے نہ صرف خود تعلیم حاصل کی بلکہ عورتوں کے لیے دو اسکول بھی کھولے۔ کلکتہ یونی ورسٹی کی ممتحن مقرر ہوئی۔ متعدد کتابیں اور مضامین لکھے بیگم

شائستہ اکرام اللہ کے والد ڈاکٹر تھے اور کلکتہ یونی ورسٹی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ قرۃالعین حیدر کا سوانحی ناول "کارِ جہاں دراز ہے" کا عنوان علامہ اقبال کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کار جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر!(۱۵)

اس سوانحی ناول میں ہندوستان کی چھٹی صدی سے لے کر دو ہزار تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے اس کو پڑھ بغیر ہندوستان کی عورت، اس کی زندگی اور اصلاح نسواں تحریک اور اس کے پس منظر کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ قرۃالعین حیدر کا تعلق ایک پڑھے لکھے اور روشن خیال گھرانے سے تھا ان کی والدہ اور والد اصلاح نسواں کے حامی تھے۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم بڑے خوش اخلاق اور سادہ مزاج تھے ان کی والدہ نذر سجاد کو بیگم آف بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنا سیکریٹری بنانے کی خواہش ظاہر کی جس کو ان کے نانا نذر باقر نے مودبانہ انداز سے رد کر دیا۔ اپنا نام قرۃالعین رکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "میرے خالو میر افضل علی نے نیلو فر منسوخ فرما کر زریں تاج طاہرہ کے اسم گرمی پر قرۃالعین نام رکھا۔"(۱۶) قرۃالعین طاہرہ ایران میں تحریک نسواں کی بہت بڑی حامی تھیں اسی نسبت سے قرۃالعین حیدر کا نام رکھا گیا۔ قرۃالعین حیدر مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار تھیں۔ انہوں نے بہت سی ادبی کتابوں کے تراجم بھی کیے۔ مشرقی اور مغربی علوم پر عبور حاصل تھا، انہوں نے مذہب، فلسفہ، تاریخ، ادبیات اور مغربی مصنفین کا عمیق مطالعہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے ایم۔اے انگریزی اور جدید ادب انگریزی کا کورس کیمبرج یونی ورسٹی سے پڑھا۔ ان کو سیر و سیاحت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کے ان کو آرٹ اور موسیقی سے دل چسپی تھی۔ وہ اپنی کتابوں کے سرورق خود تیار کرتی تھی۔ انگریزی زبان میں شاعری بھی کی۔ روشن خیال خاتون تھیں۔ آزادی کے بعد پاکستان آ گئی۔ قیام پاکستان کے دوران محکمہ اطلاعات و نشریات میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر کام کرتی رہی۔ پی آئی اے میں بھی انفارمیشن افسر رہی۔ چند سیاسی وجوہات کی وجہ سے پاکستان چھوڑ گئی۔

پاکستان سے جانے کے بعد انگلستان گئی وہاں سے بھارت قیام کیا ساہتیہ اکادمی کی اردو ایڈوائزری بورڈ کی رکن رہی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وزٹنگ پروفیسر رہی۔ فلم پبلیکیشن میں بھی کام کیا۔ یہ ہمارے عہد نو کی جدید فکشن نگار ہیں جن کو تاریخ سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کا ادبی دور اردو ادب کا زریں دور ہے جس میں ایک تہذیب دم توڑتی ہے تو دوسری جنم لیتی ہے۔ انہوں نے اپنے تاریخی شعور کے ذریعے سماج کو نئی فکر اور احساسات عطا کیے۔ ان کو اردو ادب کی ورجینا وولف بھی کہا جاتا تھا کیوں کہ انہوں نے ورجینا وولف کے نظریات کو اپنی آپ بیتی میں بیان

کیاہے جو ان کی دلچسپی کا اظہار ہے۔انہوں نے اردو ادب میں پہلی بار سٹریم آف کونشیسنس کی تکنیک کا استعمال کیا۔اس تکنیک کے تحت کہانی ایک ہی وقت میں مختلف سمت میں چلتی ہے۔دراصل انہوں نے رائف رسل کے کہنے پر لائف اینڈ ٹائم جیسی چیز کو اپنے ناولوں میں متعارف کروایا"کار جہاں دراز ہے" ایک سوانحی اور عمرانی داستان ہے جس میں ۱۱۳ خاندانوں کے عہد کی سرگزشت ملتی ہے۔اس لیے اس کو فیملی ساگا بھی کہا جاتا ہے۔اس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

> "آپ بیتی لکھنے کا معاملہ اتم کتھا ظاہر ہے۔اپنی پیدائش سے شروع کی جاتی ہے۔چند سطور یا پیراگراف یا صفحات خاندان کے متعلق۔میں نے اس کے لیے تیرہ سو سال کھنگالے اور اس بھی قبل ابراہیم اور باب عشتار تک، کیوں کہ مجھے تاریخ سے ازحد دل چسپی ہے۔"(۱۷)

اسی تاریخی دل چسپی کے تحت لکھے جانے والے "کار جہاں دراز ہے" میں تقریباً عورت کی پوری نسائی تاریخ پنہاں ہے۔مختلف ادوار میں عورت کی کیفیت، تعلیم نسواں کی تحریک کا آغاز وارتقاء، اس تحریک میں آنے والی مشکلات کا تذکرہ ملتا ہے۔وہ طوائف الملوکی اور حرم سرا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ طوائف الملوکی میر خانی گردی کے دور میں بڑھی تھی، جس میں دوسروں کا علاقہ چھین کر دشمن کے بیوی بچوں کو لہو میں پلوا کر گڑھی پر اپنا پرچم لہرایا جاتا تھا۔جنگ میں قید ہو جانے والی عورتیں دشمن کے بچوں کو جنم دیتیں اور پالتیتھیں۔اٹھارویں صدی میں دولت نہ ہونے کی وجہ سے حرم رکھنے کا رواج کم پڑ گیا تھا۔

اس کی تین جلدیں ہیں۔پہلی جلد آباواجداد پر، دوسری اپنی داستان حیات پر اور تیسری جلد میں دوست احباب کے خاکے قلم بند کیے گئے ہیں۔ان کا انداز منفرد اور دستاویزی ہے، جس میں مختلف حوالے، حواشی اور اقتباسات شامل ہیں۔اس سوانحی ناول میں قرۃ العین حیدر کی ذات بول رہی ہے جس میں وہ شعور ذات کی انتہا کو چھو رہی ہیں۔وہ کہتی ہیں مسلمان خواب کے سہارے رہے نئی دنیا ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔انہوں نے تنہا انگلینڈ کا سفر کیا۔ایک دفعہ والدہ کی بیماری اور دو دفعہ سیر وسیاحت کے لیے۔صالحہ عابد حسین کی آپ بیتی "سلسلہ روز شب "کا نام علامہ اقبال کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب، اصل حیات و ممات(۱۸)

صالحہ عابد حسین اردو ادب کی نامور مصنفہ ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس تھی۔انہوں نے میر انیس کے مرثیوں کو ترتیب دیا۔ان کی ناول نگاری زیادہ مشہور ہوئی جس کی وجہ سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ان کا تعلق

ادبی گھرانے سے تھا۔ وہ خواجہ غلام ثقلین کی بیٹی اور نامور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی کی نواسی تھی۔ انہیں ادب اور تعلیمی میدان میں پدم سری ایوارڈ ملا۔ "سلسلہ روزوشب "صرف صالحہ عابد حسین کی کہانی نہیں بلکہ برصغیر کی ہر عورت کی کہانی ہے جو ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات سے متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے صغرا مہدی نے کہا: "سلسلہ روزوشب "ایک خاتون کی زندگی کا احوال ہی نہیں بلکہ اس میں ایک دور کی کہانی ہے جس میں ساٹھ سال پر پھیلے ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور مذہبی حالات سے ہمیں آگاہی ہوتی ہے۔"(۱۹) اس آپ بیتی کو لکھنے میں بیس سال کا عرصہ لگا، اس لیے صالحہ عابد نے کہا: "سلسلہ ءروزوشب میری بیس سال کی محنت کا ثمرہ ہے۔"(۲۰) اس آپ بیتی کو لکھتے ہوئے وہ بڑی عاجزی سے اپنے آپ کو متعارف کرواتی ہیں:

> "سلسلہ ءروزوشب ایک سیدھی سادھی سوانح عمری ہے۔ ایک ویسی ہی سیدھی اور بے بناوٹ شخصیت کی، میں نے اپنے امکان بھر نہایت صداقت اور صفائی سے اپنے حالات ،خیالات اور زندگی پیش کر دی ہے۔ حتی المقدور مبالغہ ، تعلی ،غلط بیانی وغیرہ سے کہیں کام نہیں لیا۔"(۲۱)

سلسلہ ءروزوشب کو اردو کی بہترین آپ بیتیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو ان کی وفات کے چار سال بعد شائع ہوئی۔ ابھی صالحہ عابد حسین دو سال ہی کی تھی کہ ان کے والد محترم وفات پا گئے خواجہ غلام الثقلین پانی پت کے مشہور وکیل تھے۔ ان کی تربیت خاندان کے دوسرے افراد کے علاوہ والدہ نے ہی کی۔ بچپن میں وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح خوش شکل نہ تھی اس لیے ان کی پھوپی اماں نے خوش شکل نہ ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے کہا۔ "نہ باپ کی صباحت وشکوہ نہ ماں کی نزاکت وملاحت۔ پیٹ کی کھرچن، دیگ کی کھرچن کی طرح سلونی ہوتی ہے۔ شاید یہ کھرچن جل گئی ہے۔"(۲۲)

کوئی یہ نہیں دیکھتا جس کی ماں نو مہینے بیمار ہو اس کا بچہ کیسے پیٹ میں پلتا ہے؟ اس بچے کی شکل وصورت پر ماں کی بیماری کے اثرات پڑتے ہیں۔ بچہ شکل وصورت کے لحاظ سے جیسا بھی ہو ماں کو اس سے قدرتی پیار ہوتا ہے اس کو دیکھ کر ماں کی ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ یہ ہی حال صالحہ عابد حسین کا تھا ان کی والدہ نے اپنے نام سے ملتا جلتا نام مصداق فاطمہ رکھا جبکہ قلمی نام صالحہ تھا۔ ان کے آباواجداد کا سلسلہ ءنسب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالی عنہ سے ملتا تھا۔ ان کے دور میں لڑکیوں کو پڑھانا برا سمجھا جاتا تھا مگر ان کی والدہ چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی تعلیم حاصل کرے۔ صالحہ عابد حسین نے نہ صرف خود تعلیم حاصل کی بلکہ اپنی تعلیمی شمع سے دوسروں کے چراغ بھی روشن کرتی رہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

"میرے زمانے کی لڑکیوں کی کیفیت اور دل کی حسرت جن کو تعلیم کی لگن تھی، علم کی پیاس تھی لیکن یا تو مواقع نہ ملتے تھے یا اتنی دیر سے ملتے تھے کہ میٹرک اور بی اے تک کرنے کی خواہش حسرت ہی رہ جاتی تھی۔(۲۳)

ایسی ہی سوچ کا اظہار ورجینیا وولف نے کیا کہ لڑکیوں کو پڑھنے اور آگے بڑھنے کے مواقع کم دیئے جاتے ہیں ورنہ وہ بھی شکشپیر کی طرح نام کما سکتیں۔ ان کے والد بیمار ہوئے تو انہوں نے اپنی جائیداد کا تخمینہ لگا کر وصیت نامہ لکھا اس وقت ان کی چھوٹی بیٹی بیمار اور کم عمر تھی۔ انہوں نے وصیت کی اگر یہ بچی زندہ رہی تو ماں کے حصوں کی وارث ہوگئی۔ ان کا گھرانہ علمی اور ادبی تھا اسی وجہ سے گھر میں بہت سی کتابیں تھیں مگر سب کو ان کتابوں کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی مصنفہ چوری چھپے ان کتابوں کو پڑھتی تھی مگر وہ ان کتابوں کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ پڑھتی ضرور تھی مگر اس عمر میں مکمل استفادہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس زمانے میں دو ناولوں نے ان پر گہرے اثرات ڈالے جن میں خالدہ ادیب خانم کا ناول "حاجرہ" اور دوسری کتاب کا نام "بدنصیب" تھا۔ اپنے بھائیوں کے ڈرامہ کلب میں برقع اوڑھ کر مجاہد کی بہن کا کردار ادا کیا جس میں بھائی نے بہن کو سلام پر قربان کر دیا۔ تعلیم نسواں پر ایک تقریر لکھی۔ رسالوں میں ان کی کہانیاں صالحہ خاتون ہمشیرہ خواجہ غلام السیدین کے نام سے چھپتی تھیں۔

وہ اپنے دور کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتی ہیں کہ میری ایک خامی عورتوں کی ادیب ہونا بھی ہے ہماری ہاں اکثر مرد عورت شاعرہ اور ادیب پر چراغ پا ہوتے ہیں جبکہ ادیب ادیب ہوتا ہے اس میں مرد عورتوں کی تخصیص کیسی؟ عورتوں کے جلسے اور پروگرام میں جانا اپنی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

اپنے شوہر عابد حسین کے ساتھ مل کر "بزم خواتین" کی بنیاد رکھی۔ جامعہ کی لڑکیاں ان جلسوں میں نظمیں، مضامین اور تقاریر کرتی تھیں۔ ابتدا میں تعلیم بالغاں کی کوششیں ہوئیں اس دوران بہت سی انجمنیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ ان کی والدہ کے پاس قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد بھی آیا کرتی تھیں جو تعلیم نسواں کی بہت بڑی حامی تھیں۔ انہوں نے عورت کے قدیم کردار کو رد کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ عورت خود مختار زندگی گزر سکتی ہے انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اکیلی، تنہا اور مضبوط عورت کا تصور پیش کیا۔ ان کو بہت سی بیماریاں بھی رہیں نمونیہ، گردے میں پھوڑا شامل ہیں علی گڑھ کے ایک سرجن ڈاکٹر نے بیماریوں کی وجہ سے ان کی زندگی کو بلی کی طرح نو زندگیاں قرار دیا اور کہا یہ کبھی نہیں مرے گی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی بلکہ عزیزوں کی بیماریوں کے دوران تیمارداری بھی کرتی رہی۔ والدہ افضل علی کا ناول "گوڈر کا لال" میں ثریا کا کردار اہم تھا جو ناساز گار حالات میں بھی اعلی تعلیم حاصل کرتی ہے اور حاشیے کا کردار مہر جبین کا تھا جس کی طرح زندگی گزارنے کا موقع ثریا کو ملا۔ مہر جبین کی

طرح صالحہ عابد حسین نے بھی اپنے سوت کو اپنا محبوب بنالیا۔ مردوں کی طرح خود لکھتی رہیں اور یہ تخلیقی سلسلہ شادی کے بعد بھی جاری رہا۔ وہ لکھتی ہیں کہ خود شناسی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے لکھے کو پڑھ کر اس پر تنقید کرے اور اس کی خامیاں دور کرے۔ عورت کے اسی تجربے کو احساسات اور کیفیات کی سچی تصویر قرار دیتی ہیں۔ عصمت چغتائی کی آپ بیتی "کاغذی ہے پیرہن "کا عنوان مرزا اسد اللہ خان غالب کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا[۲۴]

عصمت چغتائی مشہور افسانہ نگار، ناول نگار اور فلم سکرپٹ رائٹر ہیں۔ ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے چار بہترین مصنفین میں ہوتا ہے جن میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور غلام عباس شامل ہیں۔ ان کا دور ترقی پسند تحریک کے آغاز کا دور تھا۔ عصمت چغتائی سے پہلے بھی کئی خواتین اردو ادب میں داخل ہو چکی تھیں مگر ان میں عصمت چغتائی کی طرح بے باکی اور نڈر پن نہ تھا۔ اس لیے قرۃ العین حیدر نے اسے "لیڈی چنگیز" کا لقب دیا۔ یہ اردو کی پہلی ادیبہ تھیں جن پر مقدمات بنے۔ ان کو رشید جہاں سے بھی زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ عصمت نے متوسط طبقے کے ماحول اور طرز زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ گھر میں زیادہ بہن بھائی ہونے کی وجہ سے مصنفہ کی ثانوی حیثیت تھی انہوں نے خواتین پر ہونے والے ذہنی، جسمانی، جنسی اور سماجی جبر و ظلم کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہ تھا۔ ان کے اندر علمی شوق بیدار کرنے میں ان کے بھائی مرزا عظیم بیگ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے بچپن میں ہی چیخوف جیسے بڑے مصنف کی تحریروں کو پڑھ لیا تھا۔ اور ان سے متاثر بھی تھیں۔ ان کے شوق اور ضد کو دیکھتے ہوئے والدین نے لکھنو میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ ان کی مشہور آپ بیتی "کاغذی ہے پیرہن" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس سے پہلے یہ آپ بیتی رسالہ "آج اور کل" میں اقساط کی شکل میں شائع ہوتی رہی۔ اس کی چودہ اقساط شائع ہوئی۔ ان کے مرنے کے بعد وارث علوی نے ان اقساط کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کروایا۔ ان کی یہ آپ بیتی نامکمل ہونے کے باوجود ادبی حلقوں میں بہت مشہور ہوئی۔ ادا جعفری کی آپ بیتی کا نام "جو رہی سو بے خبری رہی" سراج اورنگ آبادی کے شعر سے ماخوذ ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی

نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی[۲۵]

یہ دور جدید کی منفرد ادبی شخصیت ہیں۔ جن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔ ان کی شاعری میں روایت کی پاس داری بھی ہے اور جدیدیت کا منفرد انداز بھی۔ انہوں نے اردو شاعری میں عورت کو بحیثیت عورت پوری قوت اور رعنائی کے ساتھ متعارف کروایا۔ اس سے پہلے عورت کے جذبات، احساسات اور خیالات کو ڈھکے چھپے انداز سے بیان کیا جاتا تھا۔ انہوں نے نسائی جذبات و احساسات کی مختلف پرتوں کو کھولا ان کی شاعری صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ حیات و کائنات کے مسائل کو بھی اپنی بصیرت کی روشنی میں پرکھتی ہے۔ انھی خصوصیات کی بنا پر انہیں اردو شاعری کی خاتون اول بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز اردو نظم سے کیا، بعد میں غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ ادا جعفری جتنی اچھی شاعرہ ہیں اتنی ہی اچھی نثر نگار بھی ہیں۔ لازمی نہیں ایک اچھا شاعر اچھی نثر نگاری بھی کرتا ہو۔ ادا جعفری میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ وہ اپنی خود نوشت "جو رہی سو بے خبری رہی" میں اپنا تعارف ایک عام اور گھریلو لڑکی کے طور پر کرواتی ہیں جس سے مبالغہ آرائی کا شبہ کم پڑتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "یہ خود نوشت ایک عام سی لڑکی اور ایک روایتی عورت کی چھوٹی سی کہانی ہے، جس میں کوئی کہانی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ لڑکی اکیلی تھی اور بہت اکیلی اپنے دل کی تنہائی میں گرفتار اور وہ عورت چار دیواری دیواروں کے حصار میں رہ کر بھی اپنے وجود کی پنہائیوں میں سرگرداں رہی۔"[۲۶]

ادا جعفری اپنی تخلیقات کو اپنی پہچان قرار دیتی ہیں۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ "شہر درد" کو اپنے ہونے کا ثبوت قرار دیتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں: "میری شاعری نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ زیادہ تر نظمیں اور کبھی کبھی غزلیں بھی لکھتی۔"[۲۷] جمال احمد رضوی ان کی منجھلی بہن کے شوہر تھے انہوں نے مصنفہ کے ذوق شعر گوئی کے لیے ہر ممکن سہولیات فراہم کیں۔ ان کی رہنمائی سے اردو، فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔ ان کا دور نظم اور نثری نظم میں تازہ کاری کا دور تھا۔ آزاد اور معری نظم لکھنا روایتی اور لگے بندھے اصول وضوابط سے بغاوت کا اعلان تھا۔ مصنفہ کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اس لیے انہوں نے اپنی آپ بیتی میں ترقی پسند تحریک کی تاریخ بیان کی۔ ۱۹۴۷ء یہ ترقی پسند تحریک کا عروج کا زمانہ تھا۔ عورت کی مجبوری اور محرومی کو اپنی شاعری کا نام دیتی ہے۔ معاشرہ یہ ماننے پر مجبور ہوا کہ عورت تمام ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کر سکتی ہے۔ ہر عہد کی شاعری اپنی ترجیحات خود متعین کرتی ہے۔ ان کے دور میں شہر شہر، گاؤں گاؤں مذہب کے نام پر فسادات ہو رہے تھے۔ مذہب جس کا دوسرا نام انسانیت / محبت ہے وہ شکوہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اردو تذکروں میں اٹھارویں صدی کی شاعرات کے نام موجود نہیں تھے۔ مہ لقابائی پہلی شاعرہ ہے جس کا دیوان ترتیب دیا گیا۔ شاعری کے دوسرے دور میں کسی منفرد لہجے کی صدا سنائی نہیں دے رہی البتہ خواتین نے اپنے لب ولہجے اور نام سے اشعار لکھے کچھ شاعرات نے اپنے نام حروف تہجی

کے پردے میں چھپانا مناسب سمجھے تیسرے دور کا تعلق بیسویں صدی سے ہے۔اس دور میں تاریخ ساز رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اپنے شوہر کی وفات کے بعد کیا۔انہوں نے افسانہ نگاری، خاکہ نگاری اور ناول نگاری میں طبع آزمائی کی۔ان کی مشہور آپ بیتی "ہم سفر "۱۹۹۹ء میں مکتبہ دانیال کراچی سے چھپی۔اس سے پہلے رسالہ "افکار"میں قسط وار شائع ہوئی۔یہ آپ بیتی ڈاکٹر جمیل جالبی کے کہنے پر ستر سال کی عمر میں لکھی تھی۔وہ اپنی اس آپ بیتی کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ دہراتے ہوئے لکھتی ہیں:"

> تو پھر یہ کریں کہ جو آپ کے سامنے چلتی ہوئی فلم پر دیکھ رہی ہیں'بس قلم پکڑ کر سلسلے وار اس کو کاغذ پر لکھتی جائیں اور بیان اس طرح کریں جیسے مجھے سنا رہی ہیں۔"(۲۸)

اس آپ بیتی کا آغاز فہمیدہ ریاض نے کیا باقی وہ خود لکھتی گئی۔یہ ایک عام گھریلو قسم کی خاتون تھیں جن کی زندگی کے دو مصرف تھے بچوں کی تربیت اور شوہر کی خدمت۔ مشفق خواجہ نے ہم "سفر "کو "گرد راہ "کا تکملہ قرار دیا، کیونکہ جو باتیں "گرد راہ "میں لکھنے سے رہ گئی تھیں حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے ان کو "ہم سفر "میں جگہ دی گئی۔اس کتاب کا کچھ حصہ "افکار "میں بھی شائع ہوا تھا۔اس آپ بیتی میں خالدہ ادیب خانم کا بھی ذکر ہے جو ترکی کی مشہور ناول نگار، صحافی، شاعرہ اور سیاسی وسماجی رکن تھی۔شام کے ایک صوبے کی وزیر تھی۔ مصطفی کمال پاشا نے اسے وزیر تعلیم مقرر کیا تھا۔انہوں نے ترکی کی فوج میں بطور خاتون شمولیت اختیار کی۔۱۹۳۵ءمیں ہندوستان آئی تب مصنفہ سے بھی ملاقات ہوئی۔انہوں نے عورتوں کے مطالبات بھی پیش کیے۔ترکی میں پردے کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔مصنفہ کی خالدہ ادیب خانم سے دوبارہ ملاقات پیرس میں ہوئی۔

"ہم سفر" کے نام سے دوسری آپ بیتی زہرا منظور الہی کی ہے ان کی شادی پنجاب کے سابقہ وزیر اعلی شیخ منظورالہی سے ہوئی۔ ان کا تعلق لاہور کے بڑے خاندان سے ہے۔زہرہ منظورالہی ایک سماجی کارکن ہیں۔جو خواتین اور بصارت سے محروم لوگوں کے لیے فلاحی کام کرتی ہیں۔"عاطفت" کے نام سے ایک ادارہ چلا رہی ہیں۔ان کی مشہور تصانیف میں ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، سلگتی زندگی اور بے نور آنکھیں ہیں۔اس آپ بیتی میں لاہور کی پرانی تہذیب جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ کچھ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے خاکے بھی لکھے گئے ہیں۔

"ڈگر سے ہٹ کر"سعیدہ بانو احمد کی آپ بیتی ہے سعیدہ بانو احمد نیوز کاسٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ادیبہ بھی تھی۔۱۹۴۷ء میں بطور نیوز ریڈر مشہور ہوئیں۔خاندانی ڈاکٹر لہری نے اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب دی۔کتاب کی پروف ریڈنگ قرۃ العین حیدر جیسی مشہور مصنفہ نے کی۔کچھ عرصے کے بعد قرۃ العین نے اس کے بارے میں

لکھا"It is readable"(۲۹)سعیدہ بانو احمد کے دور میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان کی خوش قسمت تھی کہ ان کی پیدائش بھوپال میں ہوئی جہاں پر مدرسری نظام تھا۔ اس سرزمین پر چار نسلوں سے عورت حکومت کر رہی تھی۔ سلطان جہاں بیگم برقعہ اوڑھ کر بیٹھتی تھی اور تمام وزیر اور امیر ان کی سلطنت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ "نواب" کہلاتی تھی۔ سلطان جہاں بیگم نے اپنی فہم و فراست سے یہ بات ثابت کر دی کہ وہ کسی طور پر بھی مردوں سے کم تر نہیں۔ انہوں نے عورت کی بہبود کے لیے بہت سے کام کیے جس میں لڑکیوں کے لیے بہتر تعلیم کا انتظام کرنا بھی شامل ہے۔ یہاں پر عورت کو اس کے اصل نام سے پکارا جاتا تھا۔ سعیدہ بانو احمد کی والدہ کو جب کسی سرکاری تقریب کے لیے بلایا جاتا تھا تو ان کا نام سعیدہ ماجد حسین کی بجائے اشرف النسا لکھا جاتا تھا۔ ان کے ناموں سے پکارنے کی وجہ سے خواتین میں خود اعتمادی اور انفرادیت پیدا ہوتی تھی۔ سعیدہ بانو احمد کی بہن نے جب سلطانیہ گرلز ہائی سکول سے مڈل پاس کیا تو سلطان جہاں بیگم نے اپنے دربار میں تقریب منعقد کی۔ اس اعزاز میں سونے کے کڑے، دوشالے اور صافے دیئے گئے۔ انہوں نے خواتین کے لیے کلب قائم کیا جس میں پوری ریاست کی عورتیں ہفتے میں ایک دن اکھٹی ہوتی تھیں اور گھر سے باہر جا کر پکنک مناتی تھیں جس کو بھوپال میں "گوٹ" کہا جاتا تھا۔ "گوٹ پر جانے کے بڑے اہتمام ہوتے تھے کسی باغ یا شہر سے باہر، کسی گاؤں یا کسی شکار گاہ پر گوٹ منائی جاتی تھی۔"(۳۰)

سعیدہ بانو احمد کے والد محترم بھوپال ریاست کے شہزادوں کے اتالیق مقرر تھے اس لیے ان کی معاشی اور معاشرتی حالت کافی بہتر تھی۔ شاہی خاندان سے روابط کی وجہ سے معاشرے میں ان کے گھرانے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سعیدہ کی ایک بہن اور ایک بھائی تھا۔ ان کے والد خود بھی تعلیم یافتہ تھے اور اپنے بچوں کو بھی جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ سعیدہ بانو احمد نے ابتدائی تعلیم بھوپال کے سکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے والد نے بھوپال میں استعفی دے دیا اور لکھنو آ گئے۔ بھوپال اور لکھنو کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شمالی پنجاب کے اندر عورت چادر اور چار دیواری کی پابندیوں میں قید تھی۔ یہاں مسلم کرامت حسین سکول میں داخلہ لیا جس میں بورڈنگ کا بھی انتظام تھا۔ اس سکول میں لکھنو کے علاوہ پورے ملک سے لڑکیاں آتی تھیں۔ ہندو مسلم کی تمیز نہیں تھی شروع میں سعیدہ بانو احمد اپنی تعلیمی سرگرمیاں بہتر طور پر سرانجام نہ دے سکی کیوں کہ ان کو پڑھائی سے زیادہ کھیلوں میں دل چسپی تھی۔ کالج پرنسپل تبدیل ہوئی تو مسز رولو Rollo کی مہربان اور شفیق شخصیت نے سعیدہ بانو احمد کو پڑھائی کی طرف راغب کیا۔ تین دن تک مسلسل کام نہ کرنے پر بھی کچھ نہ کہا۔ سعیدہ بانو احمد لکھتی ہیں: "یا خدایا یہ کس قسم کی عورت ہیں۔ نہ بگڑیں نہ خفا ہوئیں، نہ مجھے حقارت سے دیکھا۔ شام کو بیڈ منٹن کورٹ میں میرے کھیل کی تعریفیں کیں۔"(۳۱) اس کے بعد سعیدہ بانو احمد نے شرمندہ ہوتے ہوئے دن رات دل لگا کر پڑھائی کی۔

بٹلر کے لکھنو کی معاشرت میں مرد عورت تیزی سے پستی کی طرف جا رہے تھے۔ تیز لڑکیوں نے پڑھنے لکھنے کے لیے آواز اٹھائی۔ مردوں میں بھی کچھ عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے۔ لکھنو کی خواتین بھی مغربی تہذیب سے متاثر ہونے لگیں اور ان میں بھی یہ احساس بیدار ہوا کاش ہم لوگ بھی انگریز عورتوں کی طرح آزاد گھوم سکیں۔ یہاں کی خواتین نے اس مقصد کے لیے متحد ہونا شروع کیا یوں یہاں پر ایک جماعت لکھنوو یمنز ایسوسی ایشن بنی۔ وہ سب پردے میں رہ کر اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ان خواتین کے بارے میں سعیدہ بانو احمد لکھتی ہیں: ”بتدریج پردہ غائب ہوا اور عورتیں مغربی تہذیب میں کھل مل گئیں اور انگریزوں سے بھی آگے نکل گئیں۔“(۳۲)

لکھنو کی گھٹن کا احساس سعیدہ بانو احمد کو زیادہ محسوس اس لیے نہیں ہوا کہ اس کا داخلہ آئی ٹی کالج میں ہوا جہاں پر سکول کی نسبت کم پابندیاں ہوتی ہیں۔ دوسری یہاں کی خواتین میں انگریز عورتوں کی طرف دیکھ کر کچھ بیداری پیدا ہوئی۔ ان کے والد محترم بہت آزاد خیال تھے انہوں نے کبھی بیٹیوں کے گھومنے پھرنے پر پابندی نہیں لگائی۔ اسی کالج میں بعد میں پریما کھنہ، عطیہ حسین شاردہ راؤ، سکینہ ظہیر، قرۃ العین حیدر اور وحیدہ بانو جیسی خواتین مستفید ہوئیں۔ جب ان کے والد کی طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے سعیدہ بانو احمد کی شادی ابن رضا عباس سے طے کر دی۔ جو اچھے خاندان سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ سول جج بھی تھے۔ کچی عمر کی وجہ سے سعیدہ بانو احمد نے اس رشتے سے انکار کر دیا مگر ان کی درخواست پر عمل درآمد نہ ہوا۔ ابن رضا عباس بچپن میں بیمار ہوئے تھے جس کی وجہ سے ان کی طبیعت کے اندر چڑچڑا پن آگیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ احساس کمتری کا شکار بھی تھے۔ سعیدہ بانو احمد کی ابن رضا عباس سے زیادہ اچھے ازدواجی تعلقات نہ رہے۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں لکھتی ہیں:

> میرے میاں کو میں بہت اچھی لگتی تھی اور بہت بری لگتی تھی۔ بری اس لیے کہ میرا اپنا وجود تھا جو میرا بنایا ہوا نہیں تھا میں اسے لے کر پیدا ہوئی تھی۔ اگر میرا شوہر میرے وجود کی انفرادیت کو اس طرح قبول کرتے کہ اس عورت میں کوئی اچھائیاں بھی ہو سکتی ہیں لاؤ انہیں دیکھیں تو میری علیحدگی خود گھل کر عباس رضا کی خوبیوں میں جذب ہونے لگتی۔“(۳۳)

شوہر کی وفات کے بعد سعیدہ بانو احمد نے ریڈیو میں کام کر کے اپنے دونوں بیٹوں کی پرورش کی۔ اس آپ بیتی میں ایک بیوہ عورت کے مسائل، بچوں کی پرورش اور معاشرتی رویوں کی عکاسی عام ملتی ہے۔ ان کی اپنی بہنیں بھی پاس آکر ان کے گھر میں سو نقص نکالتیں قلیل تنخواہ میں گھر کا کرایہ، بچوں کی فیس اور دوسری ضروریات کا پورا کرنا آسان کام نہ تھا۔ ایک بہن نے تو سعیدہ کے پلاٹ پر بھی ناجائز قبضہ کر لیا۔

عطیہ داؤد مشہور شاعرہ، مصنفہ اور حقوق نسواں کی نمائندہ ہیں۔ان کا تعلق نوشہرہ کے ایک پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔انہوں نے اپنی آپ بیتی میں دیہی زندگی کے مسائل کو بے باک انداز سے بیان کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پڑھ اور غیر ترقی یافتہ خواتین کیسے زندگی گزارتی ہیں۔ان کو کس قسم کے صنفی عدم مساوات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ اپنی شناخت اپنے گاؤں کی ہر لڑکی کی شناخت سے کرواتی ہیں:

"ایک پس ماندہ علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک نہایت غریب خاندان کی ننگے پاؤں چلنے والی، احساس یتیمی سے پروان چڑھنے والی اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ سے کرچی کرچی محبتوں کی متلاشی یہ بچی اب بھی ہر گاؤں کی ہر گلی میں آنسو بہارہی ہوگی۔"(۳۴)

عطیہ داؤد کا تعلق ایک غریب اور مذہبی گھرانے سے تھا اس کی بہنیں اپنی بیٹیوں کے پرانے کپڑے پہننے کے لیے بھیج دیا کرتی تھیں۔ ان کے خاندان کا تعلق "ملا" یعنی مذہبی پیشوا سے تھا۔ان کے والد نے پیشے سے بغاوت کی، اور گھر سے بھاگ کر قریبی شہر میں چلے گئے تھے۔وہ لکھتی ہیں: "محمد داؤد (میرے والد) نے اپنے خاندانی پیشے (امام مسجد) سے بغاوت کی، اور گھر سے بھاگ کر گاؤں کے ایک قریبی شہر ہالانی چلے گئے۔"(۳۵)

گاؤں میں پرائمری سکول کی خواہش پیدا ہوئی تو ان کے والد نے اپنی بیوی کو گھر میں پڑھا کر کمیٹی کا امتحان پاس کروایا۔ان کے والد ایک استاد ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔ان کی کوشش کی وجہ سے ان کی بیوی اور بڑی بیٹی بھی شعبہ تدریس سے منسلک ہوئیں۔ان کے بڑے بھائی انگلستان سے پی۔ایچ۔ڈی کرکے آئے تھے اسی لیے روشن خیال تھے۔انہوں نے اپنی بہن کو گاؤں کی قدامت پرست زندگی چھوڑ کر خودمختار زندگی گزارنے کو کہا دوسری طرف گھر میں علمی اور ادبی ماحول میسر ہونے کی وجہ سے مصنفہ اپنے بھائی کے صندوقچے سے کتابیں نکال کر پڑھتی تھی۔ گاؤں سے مڈل پاس کرنے کے بعد شہر سے باہر پڑھنے گئی تنہا شہر سے گاؤں تک کا سفر کرتی۔ ملازمت اور ادب میں اپنا نام پیدا کیا۔ مصنفہ نے ادب، ملازمت اور انسانی حقوق کی تنظیموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔انہوں نے اپنی خودمختار زندگی پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"مجھے نوکری بھی مل گئی اور پھر پارٹ ٹائم کام بھی کرنے لگی اب میری زندگی خوب صورت ہوگئی تھی۔میں خود معاشی جدوجہد کرتی تھی۔اپنی کمائی کھاتی تھی، میری ادبی شناخت بھی تھی اور لوگ بھی میری عزت کرتے تھے۔"(۳۶)

انسانی حقوق کی تنظیموں سے وابستہ ہوئیں جن میں خواتین محاذ عمل کی ایک سرگرم رکن تھی۔اس تحریک کے ذریعے ان کو تجربہ ہوا کہ کیسے عورتوں کی قانونی یا عملی طور پر مدد کی جاسکتی ہے۔شادی ہوجانے سے مزید معاشرتی تحفظ ملا جس سے ان کے خوابوں کی منزل مزید قریب تر ہوگئی۔مارکس کے نظریہ اقتصادی انقلاب سے لگتا تھا کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوں گے مگر اس کے حامیوں میں ظاہر اور باطن کا تضاد تھا جو لڑکیوں کو اچھی چائے بنا کر دینے کا کہتے تھے کیوں کہ ان کے خیال میں یہ لڑکیوں کا کام ہے اور وہ اسے بہتر طور پر کرسکتی ہیں یہ کہہ کر ان کا استحصال کرتے تھے۔یہی لوگ لڑکیوں کو گھر پر لا کر ان کو زنا پر مجبور کرتے تھے۔کوئی جسم سے روشن خیالی کا نام دے کر زنا کرتا ہے تو کوئی ماحول کا اچھے نہ ہونے کا کہہ کر روح کا زنا کرتا ہے۔انہوں نے شاعری کے علاوہ تراجم بھی کیے ان کے گھر پر ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔

ساجدہ زیدی ایک شاعرہ ،ادیبہ ،ڈرامہ نگار، نقاد اور محقق تھی۔آزاد نظم میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ان کی شاعری کے مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔مصنفہ نے خود کو بھی ایک مترجم کے طور پر متعارف کروایا، اور انھوں نے انگریزی، جرمن، فرانسیسی ڈراموں کے اردو میں تراجم کیے۔ان کے والد سید محمد مستحسن زیدی میرٹھ ایک ممتاز بیرسٹر تھے۔جن کے اپنے باغ اور کھیت تھے ساجدہ زیدی کا بچپن ان ہی پر فضا ہواؤں میں گزرا۔اسی زمانے میں ان کی والدہ صاحبہ دوطرح کی کہانیاں صرف رات کو سناتی تھی جن میں ادبی اور مذہبی قصے شامل تھے ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا ان کی والدہ محترمہ خود بھی شاعرہ تھی تمام عمر مرثیے، سلام ،قصیدے، حمد ،نعت اور مذہبی نظمیں لکھتی تھی۔وہ گھر داری کے ساتھ ساتھ مطالعہ میں بھی مصروف رہتی تھی۔ان کا گھرانہ ادبی اور مذہبی تھا اسی لیے ان کے والد اور بھائی کو غالب اور اقبال کے ہزاروں اشعار یاد تھے جن سے سن کر انہوں نے نہ صرف اشعار یاد کر لیے تھے بلکہ ان کو صحیح تلفظ، مخرج، بحور اوراوزان کی تفہیم بھی ازبر ہوگئی تھی۔ان کی آپ بیتی میں لندن کا بہت زیادہ ذکر ہے۔ان کا داخلہ لندن یونی ورسٹی انسٹیوٹ آف ایجوکیشن میں ہوا۔ان کے ماموں غلام السیدین (ماہر تعلیمات) تھے ان کے بہت سی ادبی شخصیات سے روابط تھے۔ان کے تایا پولیس کی نوکری کرتے تھے جو بعد میں ترک کر دی تھی جبکہ ان کے والد ایک کامیاب بیرسٹر تھے۔ان کا اپنا ایک زیدی فام تھا جہاں پر مختلف باغات اور جانور تھے۔ان کے والد کی وفات کے بعد ان کی جائیداد پر ان کے چچا نے ناجائز قبضہ کر لیا۔جس کے بعد ان کی والدہ نے اپنی چاروں بیٹیوں کے ساتھ پانی پت ہجرت کی۔ان کے بچپن پر اداسی ٹوٹ پڑی ماں جوانی میں بیوہ ہوگئی مگر ان کی طہارت میں زندگی بھر فرق نہ آیا۔چند مہینوں میں انہوں نے شوہر کی سوانح عمری قلم بند کر ڈالی۔اس کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹیوں کو اعلی تعلیم دلوانے کا تہیہ کر لیا۔اپنی والدہ کے تعلیمی اہتمام

کے بارے میں ساجدہ زیدی لکھتی ہیں: "تعلیم کا وہ اہتمام جو اماں نے آئندہ برسوں میں کیا، اس زمانے میں کے مسلم شرفاء میں صرف لڑکوں کے لیے کیا جاتا تھا۔"(۳۷)

ساجدہ زیدی نے حالی مسلم گرلز ہائی سکول میں داخلہ لیا جہاں سے مولانا الطاف حسین حالی نے اصلاح نسواں کی ابتدا کی ان کے بعد خاندان کے دوسرے لوگوں نے اس کام کو آگے بڑھایا جن میں حالی کے بیٹے، صالحہ عابد حسین، صغرا مہدی، ساجدہ زیدی اور ان کی بیٹی زویا زیدی کے نام سرفہرست ہیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم میرٹھ اور پانی پت میں حاصل کی مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ انہوں نے بی۔ اے، بی۔ ایڈ فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ مصنفہ خوب صورت تھی مگر مغرور نہیں تھی۔ انیس سال کی عمر میں شادی ہو جانے کے باوجود تعلیمی سلسلہ منقطع نہ ہونے دیا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ہی معلمی کے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ جوان ہونے کے بعد اپنی ذات کا احساس ہوا جو علم اور عقل کی ہر منزل کے بعد بڑھتا چلا گیا۔ ان کے ہاں فلسفہ وجودیت ابھر کر سامنے آتا ہے ان کے خیال میں زندگی وہی ہے جو انسان اپنے عمل سے بنائے، ہر فیصلے کی ذمہ داری خود قبول کرے۔ ان کی یہ تخلیق شعور ذات کا ذریعہ بھی ہے۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں۔"اس عمل میں شعور ذات سے لے کر اجتماعی لاشعور تک سب ہی کا دخل تھا۔"(۳۸)

۱۹۶۴ء میں تعلیم کی غرض سے لندن گئی۔ ۱۹۶۶ء میں ایم۔ فل کا مقالہ مکمل کیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے وئیوا کے بعد پروفیسر فوس پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کرنا چاہتے تھے صرف معروضوں کی تعداد میں اضافے کی ضرورت تھی۔ وقت کی تنگی کے باعث مصنفہ اس پیش کش سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ ایم۔ فل مکمل کرنے کے بعد بحیثیت پروفیسر تعینات ہوئیں۔ عالمی ادب کے لحاظ سے ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، معاشیات و عمرانیات کا گہرا مطالعہ تھا اس کے علاوہ موسیقی، مصوری اور شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ اس دوران سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں خدمات سرانجام دیں۔ بیرونی ممالک کے اسفار کیے۔ ملکی اور غیر ملکی سیمیناروں میں شرکت کی۔ متعدد انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی سوانح عمری نامکمل تھی جو ان کی بیٹی زویا زیدی نے مکمل کی۔ جس میں زویا زیدی نے مقدمے میں ایک مضمون کا اضافہ بھی کیا جو خود بھی شاعرہ ہیں۔ ساجدہ زیدی نے اپنی سوانح عمری نوجوان لڑکیوں کے لیے لکھی جس سے وہ اپنی زندگی کی راہ متعین کر سکیں۔ وہ لکھتی ہیں: "یہ آپ بیتی نوجوان نسل اور خاص طور پر ان لڑکیوں کے لیے مشعل راہ ثابت گی، جو زندگی میں کچھ کر گزرنے کی تمنا رکھتی ہیں۔"(۳۹) دنیاوی لالچ اور حرص ان کی ذات کا حصہ نہ تھی اور نہ ہی انہوں نے اعلیٰ اقتدار اور عہدہ حاصل کرنے کے لیے نچلی سطح کے ہتھ کنڈے استعمال کیے۔ انہوں نے زندگی کی مشکلات کا مقابلہ بڑی جرات اور حوصلے سے کیا۔ زندگی کے مشکل سے مشکل مراحل میں

دل برداشتہ نہ ہوئی۔ ان کے خیال میں روایت زد مشرقی عورت ہو یا ماڈرن جنسی آزادی کی مغربی علمبردار عورت ہو کہیں بھی آزاد نہیں ہے۔

ش۔ فرخ نڈر صحافی، شاعرہ، ادیبہ اور حقوق نسواں کی حامی تھی ان کا اصل نام شوکت فرخ تھا۔ ان کے والد محمد علی ایک آزاد خیال انسان تھے انہوں نے ان کی والدہ کو شادی کے بعد ہوسٹل میں رہ کر مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی۔ وہ ایک ہائی سکول کی استانی بن گئی۔ ش۔ فرخ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں حاصل کی جہاں پر لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ش۔ فرخ اکیلی ان لڑکوں کے درمیان پڑھ رہی تھی۔ ان کے گاؤں کا آزادانہ ماحول تھا جہاں پر پردے کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ سینما گھر فلم دیکھنے بھی جاتی تھیں دنیا کو بدلنے کے منصوبے بناتی تھی۔ کبھی عورتوں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف، کبھی دنیا میں امن قائم کرنے پر سوچتی تھی ان کے خیال میں دنیا میں بہتری کی کوششیں رک جائیں تو خرابی بڑھ جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے زیادہ تر گھر سے باہر ہوسٹل میں قیام کیا۔ میٹرک کے بعد کتاب بینی کا شوق پیدا ہوا جس کی آرزو ان کے بھائی عاشق نے لائبریری سے کتابیں لا کر مکمل کی۔ ان کے گھر میں بھی قدیم شعرا کے دیوان موجود تھے۔ میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج فار وومن میں داخل کروایا گیا۔ جہاں پر ان کے مطالعہ کے شوق میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ لکھتی ہیں: ”جیب میں پیسے ہوں نہ ہوں ہفتے میں ایک آدھ بار فیروز سنز اور انار کلی میں کتابوں کی دکان کا چکر لگانا ضروری تھا۔“(۴۰) مغربی مصنفین کے ناول اور افسانے شوق سے پڑھتی تھی انہوں نے اسی وجہ سے ڈی ایچ لارنس کے ”لیڈی چیٹرلیز لورور“ کی حمایت کی اور کہا عصر حاضر کے ناول نگار جنسی مشین چلاتے ہیں جبکہ ان کے ناول میں دو افراد کے درمیان محبت میں جذبات کی سچائی کا احساس ملتا ہے۔ یونی ورسٹی سپورٹس میں شرکت کرنا قابل فخر سمجھتی تھی۔ وہ والی بال ٹیم کی کپتان تھی۔ شعر و شاعری بھی کرتی تھی۔ پریکٹیکل کے لیے تین ہفتوں کے اسٹڈی ٹور پر کوئٹہ گئی جہاں پر کوئی صنفی تفریق نہ تھی لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے جغرافیہ میں ایم۔ اے کیا۔ ساہی وال اور کراچی کے وومن کالجز میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ کالج کے مشاعرے میں اپنی نظم سنا کر کشور ناہید جیسی شاعرہ سے داد وصول کی۔ شادی کے بعد صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوئیں۔ ملازمت کے دوران آنے والے نشیب و فراز میں کشور ناہید کے قیمتی مشوروں سے فیض یاب ہوئیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کراچی میں رپورٹنگ کی۔ ان کی قیام گاہ پر چند نامعلوم افراد نے اکیلی عورت سمجھ کر قاتلانہ حملہ کیا۔ مشہور شاعرہ پروین شاکر سے قریبی مراسم تھے وہ اپنی ہر کتاب ش۔ فرخ کو خود دینے آتی تھیں۔ صحافت کی ملازمت کے دوران ان کی ملاقات ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی بیوی نصرت بھٹو سے بھی ہوئی۔ اپنی

خود کلامی کو خوابوں میں منتقل کرنے کے لیے ”جینے کا جرم“ جیسی اہم آپ بیتی لکھی۔ وہ لکھتی ہیں: ”مختلف آب و ہوا میں پنپنے والے یہ پیڑ پودے میں نے انجانے میں ایک جگہ جمع کر لیے جیسے زندگی کے تضادات گزرتے ہوئے برسوں میں گھلتے رہتے ہیں۔“[۴۱] ابیٹ آباد کی ایک ورک شاپ میں عورتوں کے عالمی سطح پر مسائل زیر بحث آئے۔ اڑسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

افضل توصیف کا تعلق پنجاب کے جاگیر دار گھرانے ہوشیار پور سے تھا۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ والد کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئیں۔ سبی کے مڈل اسکول میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ اسی اسکول میں اول آئی اور وظیفہ حاصل کیا۔ انہوں نے ایم اے انگریزی زبان میں کیا۔ مطالعہ کا شوق بھی پال رکھا تھا۔ جس کی لگن کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ: ”عین جوانی میں بھی جب ساتھی اور ہم جماعت لڑکیاں نئے پرنٹ کی قمیض خریدا کرتی تھیں۔ میں نئی کتاب خرید کر پڑھ لیتی تھی اور کتابیں جمع کرتی۔“[۴۲] تعلیم مکمل کرنے کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ذریعے لاہور سلیکشن ہوئی۔ یونی ورسٹی آف ہوم اکنامکس میں لیکچرار مقرر ہوئیں۔ ریٹائرمنٹ تک کالج آف ایجوکیشن میں انگریزی پڑھاتی رہیں۔ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر سعیدہ کرامت علی نے ادب لکھنے اور چھپوانے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔ پنجابی زبان کی ادیب، شاعرہ، کالم نگار اور صحافی تھیں۔ اردو ادب میں تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں جن کو عوام میں بہت مقبولیت ملی وہ بیسویں صدی کی پروفیسر ، لکھاری اور صحافی تھیں۔ انہوں نے عالمی ادب کا عمیق مطالعہ کیا جس میں شکیسپیر، موپاساں ، ٹالسٹائی، بالزاک، سارتر، کواکی اور سٹالن شامل ہیں۔ انہیں بے ضمیر لوگ سخت ناپسند تھے ان کے سودے بازی کو وہ گوبر سے بھی حقیر سمجھتی ہیں کیوں کہ گوبر تو غریبوں کے لیے ایندھن کے کام آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں کوئی سودے بازی نہیں ہوتی بلکہ وہ عزم اور استقلال کا استعارہ ہیں۔ انہوں نے فوجی آمریت کے خلاف لکھا جس پر انہیں اکثر ہراساں بھی کیا گیا۔ ایوب خان اور ضیا الحق کے دور حکومت میں بے گھر بھی ہوئی۔ ان کی ایک کتاب بلوچ کاز کے زوال پر تھی جس کے نتیجے میں ان کو نظر بند بھی کیا گیا۔ جنرل ضیا الحق کے دور میں انہیں مراعات اور پرائیڈ آف پرفارمنس دیا گیا جس کو اس بہادر مصنفہ نے لینے سے انکار کر دیا۔ امرتا پریتم جیسی مصنفہ نے انہیں ”سچی دھی پنجاب دی“ کا خطاب ہی نہیں دیا بلکہ افضل توصیف کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب بھی لکھی۔ وہ اپنے خطاب کے بارے میں لکھتی ہیں: ”تیس سال بعد دنیائے ادب کی بہت اونچی ہستی امرتا پریتم سے مجھے ایک عظیم خطاب دلوانے کا باعث بنا۔ ”پنجاب کی بیٹی“ مجھے فخر ہے کہ میں نے پنجاب کو لکھا۔“[۴۳] اپنی زندگی کو اپنی محنت سے بننے والی افضل توصیف کسی مردانہ برتری کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"یہ غلط ہے یا میں سمجھتی ہوں کہ مرد عورت کا ادھورا پن پورا کرتا ہے سو میں اپنی روٹی خود کمائی۔ اپنا نام خود رکھا۔ سارے کام کیے میرا ساتھ میرے بہادر دل نے دیا۔ میرے کام ہاتھ بھی کام آئے۔ آج میری آنکھوں پہ عینک لگ گئی ہے مگر نویں نکور سپنے آج بھی کوئی نہ کوئی آس کا دیا جلا ہی دیتے ہیں۔"(۴۴)

اپنی ذات کا شعور ہر تخلیق کار کو ہوتا ہے مگر ان کا انداز بیان مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں: "میری اپنی کمٹمنٹ بہت بڑی ہے۔ میں نری لکھاری ہی نہیں ہوں، ایک ٹیچر بھی ہوں، اور ایک عورت بھی، جس کے پاس اپنی ذات کا شعور کم نہیں ہے۔"(۴۵) انہوں نے ورجینا وولف کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے اپنے لیے ایک ایسا کمرا تلاش کیا جہاں پر کسی کی دخل اندازی نہ ہو۔ اپنے پودے، اپنی الماری اور کتابیں ہوں مگر اس کمرے میں بھی آئے دن چوریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آخر کار بڑی تگ ودو کے بعد ایک سرکاری مکان ملا جس میں ان کی پہلی کتاب "درد کی دہلیز" شائع ہوئی۔

ہر عورت میں اپنا گھر بنانے کا خواب ہوتا ہے جس میں بچے ہوں اپنے ہوں یا دوسروں کے۔ خواہ وہ مادر سری نظام کی آزاد عورت ہو یا جاگیر دارانہ نظام کی چادر اور چار دیواری میں قید عورت ہو۔ آج کے دور کی فیشن ایبل خاتون ہی کیوں نہ ہو۔ گھر کی چار دیواری سب کی ضرورت ہے۔ میں دوسری دنیا کی عورت نہ بن سکی تو تیسری دنیا کی تیسری عورت بن گئی۔ جو اپنا گھر بنانے کے لیے کسی مرد کی محتاج نہیں ہے وہ خود ہی سب کچھ کرے گی جس کے گرو کارل مارکس، لینن، ماوزے تنگ اور ہوچی موہنہ ہیں۔ ماں کے روپ میں عورت ایک سایہ دار درخت ہوتی ہے جس کی چھاؤں صرف اپنے بچوں کے لیے مخصوص نہیں ہوتی البتہ وہ اولین اہمیت اپنے بچوں کو دیتی ہے۔ کیوں کہ سوچوں اور خوابوں کا ولی عہد کوئی بھی ہو سکتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ گھر میں پیدا ہو۔ ایسا ہی ایک خواب افضل توصیف کا بھی تھا جو مکمل نہ ہوا اس نے ساری زندگی کرایے کے گھروں میں گزار دی۔ عورت کے تحفظ کے لیے سماج میں تبدیلی لانا ضروری ہے ورنہ ایک فرد کے تبدیل ہونے سے سماج تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ تیسری دنیا کی عورت کے بارے میں لکھتی ہیں:

میری آنکھوں کے سامنے تیسری دنیا کی ایک عورت کمانڈو بن گئی ایک ہاتھ میں بچہ دوسرے میں بندوق سنبھال کر لشکروں سے لڑنے لگی، یہ وہی عورت تھی جو بچہ گود میں لے کر چکی پیسا کرتی تھی۔ اب دھرتی کو چھڑانا ضروری ہو گیا تھا کیوں کہ سامراج یہاں بم بندوقیں بونے لگا تھا۔"(۴۶)

آپ بیتی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ انسان کوئی درخت یا پرندے نہیں جن کے بارے میں ریسرچ ہو چکی ہو یا چند تصویریں لگا کر بات کو مکمل کیا جائے۔ آپ بیتی لکھنے والا کوئی بھی ہو اپنی

زندگی کی تمام جہتیں نہیں ڈھونڈ سکتا کیوں کہ زندگی رکتی نہیں چلتی رہتی ہے۔ حمیدہ سالم نے اپنی اس آپ بیتی کا نام اپنے بڑے بھائی مجاز کی غزل کے اس مصرعے سے لیا:

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدہ گریاں بھول گئے[(۴۷)]

حمیدہ سالم اترپردیش میں پیدا ہوئی۔ ان کی گاؤں، قصبہ اور شہر میں پرورش ہوئی۔ ان کے والد اپنے قصبے کے پہلے گریجویٹ تھے۔ حمیدہ اور اس کی بہنیں ہمیشہ پوزیشن لیتی تھی۔ حمیدہ کا داخلہ گولڈ میڈلسٹ کی بدولت اس کے کالج میں ہو گیا۔ علیگڑھ یونی ورسٹی کی پہلی اکنامکس میں پوسٹ گریجویٹ تھی۔ لندن یونی ورسٹی سے ڈپلومہ اور ایم۔اے اکنامکس میں کیا۔ کرامت حسین کالج، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ملیہ میں درس وتدرس کے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ ان کا باقاعدہ طور پر تعلق تو ادب سے نہیں ہے البتہ انہوں نے اپنے دور کے ادبی ماحول کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس لیے ڈاکٹر فوزیہ خانم اپنی کتاب" آپ بیتیاں ٹیڑھی پسلیوں کی "میں حمیدہ سالم کے بارے میں لکھتی ہیں:

"حمیدہ کی آپ بیتی "شورش دوراں" کسی ادیب و فنکار کی نہیں بلکہ ایک عام گھریلو اور درس وتدرس سے وابستہ خاتون کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں ایک عام عورت کی سوچ اور نفسیات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔"[(۴۸)]

ان کی آپ بیتی سے جاگیردارانہ نظام میں عورت کی حیثیت اور سماجی کردار سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ان کی بہن صفیہ اختر کی ازدواجی اور ادبی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کا تعلق اردو ادب کی طویل ترین ترقی پسند تحریک سے تھا۔ انہوں نے ملکی اور غیر ملکی اسفار کیے۔ مجاز الحق شاعر کی چھوٹی بہن تھی۔ ان کے دور میں تعلیم نسواں کا زیادہ تر رجحان عام تھا۔ قرۃ العین حیدر کی ہم عصر تھیں۔ ان کے دور میں کرامت حسین اور علی گڑھ سکول میں شیخ عبد اللہ تعلیم نسواں کے روح رواں تھے۔ شیخ عبد اللہ ڈنڈے کے سہارے چل کر لڑکیوں کے والدین کو ان کی تعلیم کے لیے راضی کرتے اور ان کو سمجھاتے کہ سکول میں پڑھ کر لڑکیاں خراب نہیں ہوتیں۔ اس وقت شیخ محمد عبد اللہ نے لڑکیوں کے لیے وہی کردار ادا کیا جو سرسید نے لڑکوں کی تعلیم کے لیے سرانجام دیا۔ ان کی بیوی اعلی بی نے اس نیک کام میں شوہر کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے اخلاقی، دینی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ اسکول اور بورڈنگ کی ذمہ داریاں بھی اٹھائے ہوئے تھیں۔ خود ان کی اپنی پانچ خوب صورت، پڑھی لکھی اور بے پردہ بیٹیاں تھیں۔ جن میں رشید جہاں کمیونسٹ خیالات کی حامل تھی اور ادب برائے زندگی کی علمبردار تھی۔ "انگارے" رسالے میں ان کی کہانیوں نے شعلے بھڑکا دیئے، دوسری بیٹی لندن سے

تعلیم یافتہ تھی، تیسری بیٹی ممتاز عبداللہ لکھنو سے لڑکوں کے ساتھ ایم۔اے کر کے آئی تھی باقی کی دونوں خورشید عبداللہ اور برجیس عبداللہ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اس دور میں پڑھی لکھی خواتین آٹے میں نمک کے برابر تھی تمام پرنسپل انگریز تھیں اگر کوئی خاتون پڑھی لکھی تھیں بھی تو ایسے طبقے سے تھی جہاں ملازمت کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان کے والد رودلی قصبے کے پہلے گریجویٹ ہی نہیں تھے بلکہ ان کو حافظ کے بہت سے اشعار ازبر تھے لڑکیوں میں صفیہ پہلی گریجویٹ تھیں علی گڑھ یونی ورسٹی کا یہ سنہرا دور تھا جس میں رشید احمد صدیقی جیسے ادیب، اسرا الحق مجاز جیسے شاعر، سردار جعفری، اختر ایمان اور سبط حسن جیسے روشن خیال لوگوں کی صحبت میسر آئی۔ حمیدہ سالم نے باضابطہ تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی۔ مصنفہ کے تعلیمی ادوار میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک پہلا دور اور دوسرا دور ۱۹۴۲ سے ۱۹۴۵ء تک کا دور آٹی کالج میں گزرا۔ جس طرح عصمت چغتائی نے اپنے بھائی کا خاکہ "دوزخی" لکھا اسی طرح حمیدہ سالم نے بھی اپنے بھائی کا خاکہ "جگن بھیا" کے نام سے لکھا وہ اپنے بھائی سے بہت متاثر تھیں اپنی کتاب کا انتساب بھی اپنے بھائی کے نام لکھا۔ وہ جنسی تفریق کی قائل نہ تھی عورتوں کا درجہ بڑھانے کے لیے مسائل کی تہہ تک جانا ضروری تھا۔ ان کے ماموں چوہدری محمد علی نے جنسی مسائل پر ایک کتاب لکھی جس کا استعمال سیکس ایجوکیشن کے سلسلے میں ہوتا رہا ہے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی اور گھریلو ماحول کی وجہ سے حمیدہ سالم خود بھی حقوق نسواں کی حامی تھیں وہ اپنی آپ بیتی "شورش دوراں" میں حقوق نسواں کی حمایت کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "عورت کے لیے اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق سے واقفیت ضروری ہے اور حقوق حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے میں اعتماد اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"[۴۹] حمیدہ سالم کے ساتھ ساتھ لکھنو اور علی گڑھ تحریک کی خواتین بھی تعلیم نسواں کی حامی ہوگئی تھیں بعد میں انہی خواتین کا جوش وخروش تحریک آزادی میں بھی دیکھنے والا تھا۔ خواتین نے تحریک آزادی میں مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لیا اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے اپنی بہن صفیہ اختر کے رومانوی خطوط "زیر لب" اور "حرف آشنا" کو دوبارہ مرتب کیا۔

نفیس بانو شمع شاعرہ، افسانہ نگار اور ناول نگار تھی ان کی آپ بیتی "جنت سے نکالی ہوئی حوا" اور "وقت مجھے لکھ رہا ہے" جاگیردارانہ خاندان کی ایک ایسی خاتون کی آپ بیتیاں ہیں جو آزادی کے بعد پیدا ہوئی اس وقت جاگیردارانہ نظام آخری سانس لے رہا تھا۔ ان کی دوسری آپ بیتی پہلی والی کا ہی تکملہ ہے اس میں چند نئے واقعات کے ساتھ ساتھ اشعار کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ ان کے گھر میں دولت کی فراوانی تھی۔ دادا چالیس گاؤں کے زمیندار تھے۔ بڑی منتوں سے مانگی ہوئی اولاد تھی برسوں بعد اس خاندان نے بچے کی شکل دیکھی۔ ان کی پیدائش پر خوب خوشیاں منائی گئیں۔ تین دن تک غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا جاتا رہا مصنفہ لکھتی ہیں کہ میرے حصے کی ساری

خوشیاں اسی دن منائی گئی تھیں۔ ابھی چار سال ہی کی تھی کہ مصیبتوں کا پہاڑ گر گیا۔ ان کے دادا اور دادی کا انتقال ہو گیا۔ والد ایک فوجی افسر تھے۔ انہوں نے ایک خوب صورت حسینہ کے پیچھے لگ کر دوسری شادی ہی نہیں کی بلکہ تین بچے اور ایک بیوی کو گھر سے باہر نکال دیا۔ ان کی والدہ کی دوسری شادی کر دی گئی ایک بیٹی ساتھ لے گئی ایک بیٹا اور بیٹی کو والدین کے پاس چھوڑ گئی۔ ماں کی جدائی میں چھوٹا بھائی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ بھی ہر وقت ماں کو یاد کرتی رہتی تھی۔ ایک دن زبردستی ماں کے پاس جانپور چلی گئی۔ سوتیلا باپ ان کو بوجھ سمجھتا تھا۔ وہ نفیس کی وجہ سے ان کی والدہ سے جھگڑا کرتا رہتا تھا۔ لڑائی کے وقت ان کی والدہ کمرے سے باہر نکال دیتی۔ ان کا باپ ان کی والدہ کو طعنے دیتا کہ اس نے شادی ان بچوں کو پالنے کے لیے نہیں کی صرف ایک بچی کی ذمہ داری لی ہے دوسری کیوں آتی ہے؟ ایک دن نفیس سے تنگ آکر سوتیلے باپ نے تالاب میں چھوڑ دیا تاکہ یہ ڈوب جائے اور ان کے پیسے بچ جائیں۔ اسی وقت ایک اجنبی نے ڈوبتے دیکھ کر نفیس بانو شمع کی جان بچائی۔ ان کی والدہ کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو بہت دکھی ہوئی اور اسی عالم میں بے ہوش ہو گئی اور واقعے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے نفیس بانو شمع کو واپس ننھیال کے گھر پہنچا دیا اس لی ان کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ جہاں پر وہ اپنے بہن بھائی والدہ اور والد کی کمی کو محسوس کرتی رہی۔ تیرہ سال کی عمر میں ایک شرابی آدمی سے شادی ہوئی تو اس نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے بیوی میں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ زبردستی گھر بسانے کے چکروں میں اکیس سال کی عمر میں تین بچوں کی ماں ضرور بنی۔ گھٹن زدہ زندگی سے نجات پانے کے لیے تین دفعہ خودکشی کی مگر بچ گئیں تو ڈاکٹر نے اسے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "غبار خاطر" تحفے میں دی، جس کا صفحہ نمبر ۳۷ کھلا ہوا تھا۔ نفیس بانو نے مولانا ابوالکلام آزاد کے فلسفے زندگی کو پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ سب سے آسان کام مرنا ہے جبکہ مشکل ترین کام جینا ہے۔ اس فلسفے نے نفیس بانو شمع کی مشکل آسان کر دی اور وہ ان مشکلات کے ساتھ جینا سیکھ گئی مگر شوہر نے پھر بھی اس کہانی کا انجام طلاق کی صورت میں ہی کیا۔ طلاق یافتہ عورت کے لیے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنا مشکل کام ہے نفیس بانو شمع نے اپنے دکھوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ادب کی طرف رجوع کیا اور خود کو ایک شاعرہ اور ادیبہ کے طور پر متعارف کروایا۔ اپنا تخلیقی سفر افسانے سے شروع کیا اور بعد میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوئیں۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی "جنت سے نکالی ہوئی حوا" امرتا پریتم سے متاثر ہو کر لکھی۔ جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا۔ جنت سے نکالی ہوئی حوا لکھنے کی تحریک مجھے امرتا پریتم کی آپ بیتی رسیدی ٹکٹ سے ملی۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں نسوانی طرز کی لکھی ہوئی آپ بیتیاں ہیں۔ جس میں مصنفہ کی اپنی حیات کے ساتھ ساتھ معاشرے کی دوسری عورتوں کی زندگی بھی عیاں ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں عورتوں کی تخلیق صلاحیتوں کو ماننے سے انکار کیا جاتا ہے کبھی ان کے ناموں کو باپ بھائی

کے نام سے ظاہر کر کے کبھی نامکمل نام لکھ کر ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔پدرسری معاشرے میں عورت کو مردوں کے برابر مقام نہ دیا گیا۔ان کی صلاحیتوں کو مشکوک سمجھا گیا حالانکہ اردو ادب میں رشید جہاں، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی اور بشری رحمن جیسی بے شمار خواتین خود کو باصلاحیت اور ہنر مند ثابت کر چکی ہیں۔یہی اصل فنکارہ ہیں۔انھی عظیم فنکاروں میں ایک نام نفیس بانو شمع کا بھی ہے۔جس نے اپنی زندگی کے دکھوں کا علاج ادب کے ذریعے تلاش کیا۔اس آپ بیتی میں مصنفہ کے حالات زندگی سے زیادہ معاشرے کی دوسری دکھی خواتین کی داستانیں بھی رقم ہیں اس لیے اسے حدیث دیگراں کہا جاتا ہے جس کے پچاس ذیلی ابواب ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

> ”عورت ہر جگہ معتوب ہو رہی ہے کہیں اس سے برہنہ رقص کروایا جارہا ہے، کہیں کوٹھے کی زینت بنادیا جاتا ہے۔کبھی زندہ جلانے کی کوشش ہوتی ہے تو کبھی طلاق کے تین پتھر مار کر سنگسار کر دیا جاتا ہے۔ہمارے اردگرد کی عورت کے لیے کئی صلیبیں نصب ہیں۔“(۵۰)

مردوں کے متعلق عورتوں کے نظریات بھی پیش کیے جس میں نفیس بانو کو ہر عورت اپنی ہی پرچھائی نظر آئی جو پدرسری معاشرے کی روایات میں اپنا آپ کھو چکی ہے۔گھریلو ناچاقی کی وجہ سے مصنفہ کا رجحان ادب اور تصوف کی طرف ہو گیا۔اردوادب کا مطالعہ کرتے ہوئے منٹو کی کہانیوں میں عورت کے کرب کو محسوس کیا جس میں ”کالی شلوار“ اور ”کھول دو“ شامل ہیں جن پر فحاشی کا مقدمہ بھی بنا مگر منٹو نے جس بے باکی اور نڈرپن سے عورت کے دکھ کو بیان کیا۔اس وقت ادبی حلقوں میں ادبیہ کو بازاری شے سمجھا جاتا ہے۔

نثار عزیز بٹ ۱۹۲۷ء میں خیبر پختون خوا میں پیدا ہوئی۔ان کے دادا نے پچاس ایکڑ زمین خرید کر میاں گڑھی بخش کے نام سے گاؤں آباد کیا۔یہ زمین لوئر سوات کی نہر آنے سے سیر اب ہوتی تھی بعد میں انہوں نے جائیداد اپنی اولاد کے لیے وقف کر دی۔وہ اردو، فارسی اور عربی زبان کے عالم تھے۔ان کے والد میاں عبدالعزیز نائب تحصیل دار بھرتی ہوئے۔ان کے والد نے اسلامیہ کالج پشاور سے بی اے کیا اور ایک کتابچہ تحریر کیا جس میں لکھا کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔نثار عزیز بٹ کو بھی لکھنے کی تحریک ورثے میں ملی۔انہوں نے لکھنے کا آغاز ایک مضمون سے کیا مگر جلد ہی ایک عمدہ ناول نگار کے طور پر سامنے آئی اور چار ناول نگری نگری پھرا مسافر، نے چراغے نے گلے، کاروان وجود اور دریا کے سنگ ہیں۔ناول سخت گیر صنف ہے اس میں ایسا مواد کم ہوتا ہے جس کا تعلق مصنف کی ذاتی زندگی سے ہو، ناول لکھتے ہوئے مصنف آزاد نہیں رہ سکتا۔ذاتی تجربے کو بیان کرنے کے لیے گئے دنوں کا سراغ کے نام سے خودنوشت لکھی جس کا عنوان ناصر کاظمی کے اس شعر سے لیا گیا۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ [۵۱]

آپ بیتی لکھنے کی سب سے بڑی وجہ اظہار ذات ہوتی ہے جس کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ نثار عزیز بٹ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی۔ سات برس کی عمر میں والدہ اور جوانی میں والد اور جوان بھائی شہید ہو گیا۔ والدہ کی وفات سے ان کی زندگی میں ایک خلش سی پیدا ہو گی۔ وہ اس المناک واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ماں کے منظر سے غائب ہوتے ہی۔۔۔۔۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ مدتوں میں نے مر جانے کے بعد معاف نہ کیا۔"[۵۲]

ان کو اپنے چھوٹے بھائی سر تاج عزیز سے بہت پیار تھا وہ بڑی محبت سے انہیں تاجی کہتی تھی۔ والد سرکاری ملازم تھے اس لیے ان کے آئے دن تبادلے ہوتے رہتے تھے جس کی وجہ سے رہائش بھی تبدیل کرنی پڑتی تھی۔ بچپن اور جوانی میں ٹی بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا تھی۔ لاہور کے کالج میں داخلہ لیا اور وہاں پر بنگال میڈیکل فنڈ کے لیے چندہ جمع کیا۔ کاکاخیل جیسے پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ایم۔ ایس۔ سی ریاضی میں کی اور صوبے میں اول آنے پر گولڈ میڈل کی حق دار قرار پائی۔ کنئیرڈ کالج میں نو بارا سٹیج پر انعام لینے گئی جن میں چار انعام اور پانچ میرٹ سرٹیفکیٹ تھے۔ کالج کی پرنسپل نے لیڈی عبد القادر نے اس موقع پر کہا: "سب مسلمان لڑکیاں تمہاری طرح ہوں تو قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔"[۵۳] خوددار خاتون تھی محتاجی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں والدہ کی کتابیں ہاتھ لگنے سے ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ ادب سے لگاؤ اور مغربی ادب کا مطالعہ کرتی رہی۔ پندرہ سال کی عمر میں ایک انگریزی ناول "The First Lady Brendon" پڑھا اس کے بعد دن رات کے کسی ایک حصے میں ناولز کا مطالعہ ضرور کرتی تھی۔ ملکی اور غیر ملکی اسفار اور کانفرنسوں میں شوہر کی معاونت حاصل رہی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو عورتوں کے بارے میں ایک پروگرام میں شرکت کی۔ نقوش میں کہانی چھپنے کے لیے دی تو حاجرہ مسرور نے اعتراضات لکھ کر واپس کر دی یوں حاجرہ اور خدیجہ سے دوستی ہو گئی۔ قرۃ العین حیدر کی ہم عصر تھی اس لیے ان کے مشہور و معروف ناول "آگ کا دریا" پر مدلل تبصرہ لکھا جو پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔ اصغر بٹ سے شادی ہوئی جو ریڈیو پاکستان پشاور میں کام کرتے تھے ادا جعفری اور نور الحسن سے قریبی مراسم تھے۔ ان کے گھر میں کوشک کے نام سے ادبی محفل ہوتی تھی جس کا نام مختار مسعود نے بدل کر "سلسلہ" رکھ دیا یوں بہت سی ادبی شخصیات کے اعزاز میں محفلیں اپنے گھر میں منعقد کرتی رہی۔ اگست ۱۹۹۵ء میں صدارتی تمغہ سے نوازا گیا۔ ۲۰۱۳ء میں مجلس

فروغ ادب دوہانے بھی لائف اچیومنٹ ایورڈ عطا کیا۔ شعور ذات کے حوالے سے ان کو اچھا بننے کی آروز نہیں وہ تو صرف اظہار رائے کی آزادی چاہتی ہیں جس میں سوچنا اور محسوس کرنا شامل ہو۔

زہرا داؤدی ایک باغی خاتون کی داستان ہے جو بہار یہ خاندان کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ ایم۔اے معاشیات ،ساسیات پٹنہ یونی ورسٹی سے اور ایل۔ایل۔بی مظفر پور یونی ورسٹی سے کیا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ ڈیمو کریٹک وویمن ایسوسیشن سندھ کی صدر رہی۔ وہ صحافی ،معلمہ ،وکیل اور بائیں باوز کی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہی۔ اس وقت تحریک آزادی اور تحریک نسواں میں مرد عورت دونوں شریک تھے آزادی اور تحریک نجات کی عورتیں اپنے شوہروں اور بھائیوں کو ظالم نہیں سمجھتی تھی۔ زہرا داؤدی جہیز کے مطابق جہیز کی رسم صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ امریکہ میں بھی تھیامریکہ نے یہ رسم ختم کردی مگر مشرقی ممالک میں ایک نفسیاتی معمہ بن گئی جس کا شکار متوسط طبقے کی لڑکیاں اور والدین ہیں اس لیے وہ جہیز کے خلاف تھی لیکن ہندوستان میں جہیز کی رسم ختم نہ ہونے کی وجہ خود یہاں کی عورتیں ہیں وہ خود جہیز لینا چاہتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں: ”اچھی خاصی عمر تک عورتیں جہیز کے انتظار میں کنواری بیٹھی رہتی ہیں“[۵۴] صنعتی دور سے پہلے عورتوں کو ان کا حق وراثت نہیں دیا جاتا تھا اس لیے وہ جہیز اکھٹا کرتی تھیں۔ اب یورپی ممالک میں جہیز یادگار رہ گیا اور مشرقی ممالک میں وبال جان بن گیا۔ ان نظریات کی وجہ سے وہ حقوق نسواں کی بھی حامی رہی۔ انہوں نے کئی ممالک کے اسفار بھی کیے اوراس دوران زندگی اور سماج کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کی آپ بیتی دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ گرداب کی شناوری اور دوسرا حصہ منزل گریزاں کے نام سے شائع ہوا۔

مشہور مصنفہ اور حقوق نسواں کی حامی صغرا مہدی کی آپ بیتی "حکایت ہستی "کے نام سے دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی ڈاکٹر شمع افیروز کی فرمائش پر لکھی گئی اس سے پہلے یہ رسالہ "بیسویں صدی "میں "ماضی کے جھرکوں کے نام" سے قسط وار شائع ہوئی تھی۔ اس آپ بیتی کے آٹھ ابواب ہیں۔ اس کا نام شاد عظیم آبادی کے اس شعر سے لیا گیا:

سنی حکایت ہستی تو درمیان سے سنی
نہ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم[۵۵]

ان کا نام امامت فاطمہ عرف چھبو تھاان کی ممانی نے چھبو کی بجائے صغرا مہدی رکھا۔ بھوپال کے ایک قصبے باڑی میں پیدا ہوئی۔ واجبی شکل وصورت کی مالک تھی رنگ کالا، منہ پر چیچک کے داغ، دبلی پتلی اور احساس کم تری کا شکار تھی ایسے لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے زندگی میں زیادہ تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔ نوسال کی عمر میں

اپنے والد کے ساتھ آبائی شہر داعی پور میں آگئی۔ یہ سات بہن بھائی تھے پانچ بہنیں اور دو بھائی تھے۔ والد پولیس میں معمولی انسپکٹر تھے۔ عابد حسین ان کی والدہ کے بھائی تھے جن کا آپس میں بہت پیار تھا دونوں میاں بیوی نے صغرا مہدی کے گھر چکر لگایا تو ان کی ممانی نے گفتگو کے دوران لاشعوری طور پر صغرا کے اندر شعور ذات بیدار کیا وہ گھر میں داخل ہوتے ہی کہنے لگی:

"ارے یہ چھبو ہے، کتنی بڑی ہوگئی ہے کیسی اچھی نکلی ہے یہ کہہ کر ممانی جان نے مجھے لپٹا لیا۔ ان کے گلے سے لگ کر ان کی محبت کی گرمی نے مجھے جو سرور بخشا اس سے ذرا دیر گڑبڑا گئی یہ میری خیالی دنیا ہے یا حقیقی دنیا۔"(۵۶)

ان کی ممانی کے ان الفاظ نے صغرا مہدی کے اندر شعور ذات پیدا کیا ان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسی دن پیدا ہوئی ہوں۔ گھر میں مصنفہ کی حیثیت ثانوی تھی۔ ان کی ممانی خدا ترس خاتون تھی۔ والدین کا بوجھ کم کرنے کے لیے ممانی نے ان کی دو بیٹیوں کو تعلیم کی غرض سے اپنے گھر لے جانے کا مشورہ دیا۔ ابتدائی تعلیم وہاں سے حاصل کرنے کے بعد اپنے ماموں عابد حسین کے پاس آگئی۔ جہاں پر ان دونوں بہنوں کو علمی ماحول میسر آیا۔ لیکن یہ ان کے لیے والدین سے جدائی کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ غم اور خوشی کے ملتے جلتے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں: "اس خبر سے مجھے ایک طرف تو خوشی ہوئی کہ میں سکول پڑھوں گی، ممانی جان کے پاس رہوں گی۔"(۵۷)

ان کی بہن بنو بھی ننھیال میں رہتی تھی۔ ان کے دادا سید مہدی حسن شاہ جہاں کے زمانے میں بھوپال آئے اور یہاں کے ناظم مقرر ہوئے۔ ان کے دادا خود بھی شاعر تھے انہوں نے شاہ نامہ فردوسی کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے والد سب انسپکٹر تھے ان کو عام بچوں کی طرح کھیلوں سے دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ اکثر گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر خود سے ہم کلام ہوتی۔ انہوں نے فکشن کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی ادب میں بھی کمال فن کے مظاہرے کیے۔ جب ان کے ماموں اور ممانی جرمنی گئے تو ان دونوں بہنوں کے رہنے کا انتظام پہلے اپنی رشتے دار ساجدہ زیدی کے گھر کیا پھر ان کے بچے چھوٹے ہونے کی بناء پر وہاں سے ہوسٹل میں بھجوا دیا اور نصیحت کی کہ ساجدہ زیدی سے پیسے نہ لیں اگر کوئی تحفہ دیں تو رکھ لینا صغرا مہدی کو بھی اپنی ممانی سے بہت پیار تھا وہ جانے انجانے میں ان کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی ان کو بڑی اماں کہہ کر پکارتی تھی۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی کا انتساب بھی اپنی والدہ، ممانی، صفیہ بہن اور بھانجی کے نام لکھا۔ ان کی ممانی گھر کے چھوٹے موٹے کام کروانے کے ساتھ ساتھ ان کو پڑھاتی بھی تھی۔ ان کی بہن بنو نے قرآن شریف پڑھ لیا تھا اس کے علاوہ اردو کی چوتھی کتاب اور بہشتی زیور کی طرح خواتین کے لیے لکھی گئی دوسری کتاب "تحفۃ العوام" کا کافی حصہ پڑھ لیا تھا جس میں اہل تشیع کے لیے عبادات کے طور

طریقے لکھے گئے تھے اس میں بھی عورت کو خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری کی پند و نصیحت کی گئی ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے ان ہی دنوں میں خواتین کے لیے ایک ڈرامہ "بنیادی حقوق" لکھا جس کا موضوع لڑکی کی مرضی کے بغیر شادی کے نقصانات اور لڑکی کو پسند کی شادی کا حق دینا تھا۔ اس ڈرامے میں صغرا مہدی اس کی بہن، ممانی اور کئی اور لڑکیوں نے حصہ لیا۔ گوپی ناتھ امن کی بیگم کا کردار مصنفہ نے ادا کیا جو ان کے ماموں جان کو بہت پسند آیا اور اس پر انعام بھی ملا۔ ان کی ممانی صالحہ عابد حسین نے "ہم جولی کلب" کے نام سے نوعمر لڑکیوں کے لیے ایک انجمن بنائی جس میں ادبی پروگرام ہوتے تھے۔ اسی کلب کے توسط سے صغرا کی کہانی "آتش خاموش" کو پہلا انعام ملا۔ اس مقابلے کی جج صالحہ عابد، انیس قدوائی، رضیہ سجاد ظہیر تھیں۔ آٹھویں جماعت میں ان کی کہانی "ہمت پھل" کو دس روپے انعام ملا۔ صغرا کے والد کو پھیپھڑوں کا کینسر تھا اور وہ ۱۹۵۵ء میں وفات پا گئے۔ اس وقت صغرا مہدی اور اس کی بہن نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ ماموں کے گھر صغرا کو ادبی اور علمی ماحول میسر تھا۔ ان کی آپ بیتی میں بہت سی اہم باتیں صالحہ عابد حسین کی زندگی کے بارے میں تھیں جو ان کی آپ بیتی میں لکھنے سے رہ گئی تھیں۔ جب صغرا مہدی کی سب ہی دوستوں کی شادی ہو گئی تو ان کے ماموں ان کی شادی کے لیے پریشان تھے تو انہوں نے اپنے ماموں کو آگاہ کیا کہ وہ ابھی اپنا مستقبل بنانا چاہتی ہے شادی نہیں کرنا چاہتی تو ماموں نے سمجھایا کہ تنہا زندگی گزارنا بہت مشکل ہے اگر یہ چاہتی ہیں تو ابھی سے اس کی تیاری کریں اپنے اوپر اعتماد رکھیں اگر وہ خوش رہی تو شادی کے لیے مجبور نہیں کریں گے مگر وہ شادی کے دروازے بند نہ کرنا۔ صغرا مہدی نے تسلی دی کہ اگر کوئی ہم خیال شخص مل گیا تو وہ شادی کر لے گی۔ صغرا مہدی کو لکھنے کا بہت شوق تھا۔ زندگی میں بہت سے صدمات سے بھی واسطہ پڑا اس کا بھائی مختار گنگا میں ڈوب کر مر گیا جس کا صدمہ ان کی والدہ برداشت نہ کرتے ہوئے دماغ کی رگ پھٹنے سے اس جہاں فانی سے کوچ کر گئی۔ ۱۹۷۵ء میں صغرا مہدی نے اپنے بھائی کی شادی پر ٹرین سے سفر کر کے پاکستان آئی تار نہ ملنے کی وجہ سے کوئی لینے بھی نہ آیا رات نو بجے وہاں پہنچیں یہ واقعہ سن کر ان کے ماموں بہت خوش ہوئے کہ ان کی بیٹی بہادر ہو گئی ہے۔ ماموں کی خواہش پر ایم۔ فل دہلی یونی ورسٹی سے اور پی۔ ایچ۔ ڈی جامعہ ملیہ سے مکمل کی۔ سیدین کی بیٹی سیدہ برطانیہ سے آکر ہندوستان کی عورتوں کے لیے خدمات سرانجام دیتی رہی جن میں صغرا مہدی بھی شامل تھیں۔ صغرا مہدی کو حقوق نسواں کی حمایت کا سبق اپنی ممانی صالحہ عابد کی زندگی سے بھی ملا جن کو صغرا مہدی اپنا آئیڈیل تصور کرتی تھی ممانی نے بھی ایک استاد، ماں اور دوست کا کردار ادا کیا۔ صغرا مہدی کی زندگی کے یہ سب موضوعات پہلے ان کے افسانوں اور ناولوں کا حصہ تھے اب ان کی عملی صورت الحال کے لیے کوشاں ہیں۔ انہوں نے دشمنی کے قابل سمجھنے والے رشتوں کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ بھاوج کو بہن کیوں کہیں بھاوج ہی

سمجھیں مگر ان سے بہن اور دوست کے تعلقات استوار کریں، بہو کو بیٹی کیوں سمجھیں بہو سمجھ کر ہی بیٹی جیسا سلوک کریں اسی طرح ساس کو ماں کیوں سمجھیں مگر اپنی ماں کی طرح کیوں نہ اس کا خیال رکھیں۔ صغرا مہدی نے ملازمت بھی کی اور سیمینارز میں شرکت کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے لکھاریوں سے ملاقات بھی ہوتی رہی۔ ماموں ممانی کی وفات کے بعد ان کی زندگی میں تنہائی نے ڈیرے ڈال لیے لیکن انہوں نے اکیلے ہونے کے باوجود اکیلے پن کے تصور کو ختم کرنے کی کوشش کی نہ اس خیال کو خود پر مسلط ہونے دیا کہ لوگ ترس کھائیں۔ اپنی حدود قیود کا خیال رکھتے ہوئے ہر عمر کے مردوں سے دوستیاں بھی کیں۔ عذرا عباس اردو نظم اور غزل کی مشہور شاعرہ ہیں ان کا تعلق کراچی سے ہے جنھوں نے جامعہ کراچی سے ایم۔ اے اردو کیا اور کراچی کے گورنمنٹ کالج میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ ان کے رفیق حیات بھی مصنف ہیں۔ بعد میں انگلستان چلی گئیں اور وہاں پر ہی مقیم ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں تانیثی فکر پنہاں ہے اس کے علاوہ انہوں ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں نام کمایا۔ ان کی آپ بیتی میرا بچپن کا انگریزی زبان میں ترجمہ ثمینہ رحمن نے KICKING UP THE DUST کے نام سے کیا عذرا عباس نے کئی لوگوں سے اثرات قبول کیے ان کے ہاں عصمت چغتائی کی بغاوت اور لب ولہجہ پایا جاتا ہے۔

یہ کتھا کشور ناہید نے اٹلی میں بیٹھ کر لکھی۔ جس میں اپنی بہوؤں کا ذکر کرتے ہوئے بدلتے ہوئے معاشرے کا عندیہ دیا۔ یہ یو۔ پی کے ایک قصبے بلند شہر کے مسلم، زیدی، سید اور مولوی گھرانے کی داستان ہے۔ یہ پسماندہ اور قدامت پرست علاقہ تھا۔ ان کے خاندان کے خاص طور پر ننھیال کے زیادہ تر لوگ سرسید کے پیروکار تھے جہاں پر لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کی جاتی تھی اسی سوچ کے حامل ان کے نانا بھی تھے۔ کشور ناہید اتر پردیش کے قصبے بلند شہر میں ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئی۔ یہ اپنے والدین کی پانچویں اولاد تھی۔ ان کے والد سید ابن حسن آٹھویں جماعت پاس تھے کوٹ آف وارڈ میں ملازم ہوئے بعد میں راج گھاٹ نروا کے منیجر رہے ان کو شاعری سے بھی گہرا شغف تھا۔ ان کے والد نے چار شادیاں کی تھیں پہلی تین بیویاں زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی البتہ ان کی اولاد زندہ تھی۔ کشور کی والدہ جمیلہ خاتون کی بھی دوسری شادی تھی۔ ان کی والدہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا چاہتی تھی جبکہ ان کے والد نے مخالفت کی اور اضافی خرچہ دینے سے انکار کر دیا۔ پانچ برس کی عمر میں کشور ناہید گھریلو ماحول میں مصروف ہو گئی۔ مزید تعلیم کے لیے اس نے بہت احتجاج کیا نویں جماعت تک ان کا نام کشور جہاں لکھا جاتا تھا۔ رسالوں میں ان کا قلمی نام کشور ناہید تھا ان کی دوسری بہنیں بھی اپنے نام بدل کر لکھتی تھیں تاکہ معاشرتی مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس دور میں خواتین اپنے اصلی ناموں کی بجائے باپ، بھائی، شوہر یا مختلف مخففات کا استعمال کرتی تھیں۔ نویں جماعت میں ان کو ریڈیو میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی تو ان کی والدہ نے رو رو کر برا حال کر لیا کہ سید زادی کی آواز نامحرم افراد سنیں

گے۔ پھر ان کی چھوٹی بہن کو بچوں کے پروگرام میں شرکت کرنے کی اجازت ملی جس کا اسکرپٹ کشور ناہید لکھتی تھی۔اسی دور میں بچوں کے ادبی صفحے میں مضمون اور کہانیاں لکھتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے والد نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور وہ بلند شہر میں مسلم لیگ کے سیکرٹری رہے ستمبر ۱۹۴۹ء میں ان کا خاندان پاکستان آ گیا۔ کشور ناہید نے اپنی زندگی کے اہم فیصلوں میں خاندانی روایت سے انحراف کیا۔اس نے علی گڑھ یونی ورسٹی میں میں داخلہ لیا۔ یہ اس کی زندگی اور آگے بڑھنے کا ایک نیا موقع تھا اس دوران وہ تقریروں، ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کرتی۔ کشور ناہید کا منہ بولا بھائی تھا جس کو شعر لکھنے اور ادب سے لگاؤ تھا وہ ہی کشور ناہید کو ادبی رسائل لاکر دیتا تھا جس میں اے حمید، منٹو، عصمت اور کرشن کے متعلق مضامین چھپتے تھے پھر سکول اور کالج کی لائبریری سے انگریزی کتابیں لاکر پڑھنے لگی۔ بچپن میں ان کے گھر میں رسالہ "عصمت" بھی آتا تھا۔ میٹرک کے بعد شاعری اور لکھنے کی طرف رجحان پیدا ہوا۔ کالج کے مشاعرے میں ٹرافی ملی۔ اس زمانے میں ایک اخبار کی طرف سے رپورٹر بننے کی آفر ہوئی جس میں سائیکل کے ساتھ ۷۵ روپے ماہانہ تنخواہ بھی تھی مگر گھر میں قیامت آگئی۔ اس میں جانے کی اجازت تو نہ ملی البتہ ریڈیو پر یونی ورسٹی پروگرام کرنے کی اجازت ضرور مل گئی۔ اس نے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سید خاندان سے باہر اپنی پسند کی شادی کی۔ کشور ناہید کی بڑی بہنیں میٹرک کے بعد سید خاندان میں رشتے نہ ہونے کی وجہ سے بوڑھی ہو رہی تھیں۔ کشور ناہید نے ملازمت بھی کی اور حقوق نسواں کے لیے بھی کوشاں رہیں۔ یہاں سے ہی کشور نے اندر ہی اندر سے ذات در ذات تقسیم ہونے کا ہنر سیکھا اس لیے وہ کہتی ہیں: ”میں اکیلی نہیں میرے اندر کئی عورتیں قید ہیں۔“(۵۸) کشور ناہید نے شاعری میں بڑا نام کمایا ان کی شاعری کے انگریزی اور مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے۔ ان کی تصانیف میں باقی ماندہ خواب۔ لب گویا، زبان خلق سے زبان حال تک، آجاؤ افریقہ ،سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ، زیتون، خیالی شخص سے مقابلہ ،سوختہ سامانی اور لیلی کے خطوط وغیرہ شامل ہیں۔ ان کو تخلیقی خدمت کے پیش نظر یونیسکو ادب برائے اطفال ایوارڈ، کولمبیا یونی ورسٹی بہترین مترجم ،منڈیلا ایوارڈ، ستارہ ء امتیاز اور آدم جی ادبی ایوارڈ ملا۔

انیس ہارون حساس اور فرض شناس شخصیت کی مالک ہیں۔ جو ۱۹۴۶ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئی ان کا گھرانہ ہجرت کر کے (پیر الہی بخش کالونی)حیدر آباد سندھ پاکستان میں آگیا تھا۔ دینی تعلیمات نانا سے حاصل کیں۔ ان کے والد کا تعلق حیدر آباد دکن کے نواب گھرانے سے تھا ہجرت کے بعد پاکستان میں آکر ملازمت کی۔ ان کے خاندان پر ہجرت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ان کی والدہ نے کبھی خود گھر کا کام نہیں کیا تھا پاکستان آکر ان کو چولہے میں لکڑیاں بھی خود جلانی پڑتی تھیں وہ اکثر ماضی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتی تھی انیس ہارون اپنی والدہ کے

بارے میں لکھتی ہیں: ''رشتے ٹوٹنے کا احساس وہی کر سکتا ہے جو خود اس سے گزر چکا ہو۔''[۵۹] ان کی شخصیت میں سنجید گی اور شوخی پائی جاتی تھی۔ چوتھی جماعت سے سکول جانا شروع کیا۔ اقبال بحیثیت شاعر پر ل۔ ایس کی کتابیں، رضیہ بٹ کے ناول اور تقریری مقابلوں کا شوق تھا۔ اس وقت ان کو اساتذہ گھر میں پڑھانے آتے تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد حیدر آباد کے مشہور کالج ''زبیدہ کالج'' میں داخلہ لیا۔ یہاں پر انیس ہارون کی دوستی فہمیدہ ریاض سے ہوئی جن کے والد بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔ فہمیدہ کے ساتھ انیس ہارون کی علمی اور سیاسی بحثیں ہوتی تھیں۔ کالج سے ہی انیس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ان میں لیڈر شپ کا شوق موجود تھا تو یہ کالج کی نائب صدر بن گئی۔ تقریری مقابلے میں حصے لینے کے لیے پورے ملک کے کالجز میں جاتی اور انعام جیت کر لاتی۔ اپنے اوپر اعتماد کرنے کی وجہ سے خود فیصلہ کرتی۔ گریجویشن کے بعد کراچی یونی ورسٹی سے انٹر نیشنل ریلیشنز کے شعبے میں داخلہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو میں لاء کالج میں داخلہ لیا اور ایل۔ ایل۔ بی میں پہلی پوزیشن لی۔ اس کے بعد عملی زندگی میں سیاست اور صحافت کو اپنایا۔ ماہر نفسیات ڈاکٹر ہارون سے پسند کی شادی کی۔ والدین کی وفات کے بعد اپنے بہن بھائیوں، سسرال اور گھریلو ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہوئی۔ ان کی آپ بیتی میں مشہور تانیثی شاعرہ فہمیدہ ریاض کی زندگی کے اہم پہلوؤں کی بھی عکاسی ہوتی ہے کیوں کہ وہ مصنفہ کی قریبی دوست تھی۔ عورت فاونڈیشن میں خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم عمل رہی۔ ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسز میں شمولیت حاصل کی۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں میں مصروف رہی۔ ان کی زندگی کا اہم پہلو عورت فاونڈیشن کے ساتھ منسلک ہونا ہے جس کو عورت محاذ عمل (ویف) کا نام دیا۔ ضیاء الحق حکومت کے خلاف خواتین نے مل کر ایک پلیٹ فارم بنایا جس میں اپوا، پاکستان ویمنز لائرز ایسوسی ایشن، جمہوریت پسند خواتین، شرکت گاہ اور دوسری خواتین شامل ہوئیں۔ اس کی پہلی میٹنگ تیس خواتین پر مشتمل تھی۔

ضیاءالحق حکومت کے خلاف پہلی مزاحمت عورتوں کی تھی جس کو عوام کے روشن خیال حلقوں نے سراہا۔ حمزہ علی نے ویف کو جمہوری جدوجہد کا ہر اول دستہ کہا۔ بھٹو دور میں خواتین کو آگے بڑھنے کے مواقع ملے تھے وہ تمام راستے عورتوں کے لیے بند کر دیئے گئے۔ ۱۹۸۳ء میں اسی تحریک کے ذریعے قانون شہادت کیس کے خلاف اپنی قرارداد پیش کی۔ پولیس کی ایک بھاری نفری خواتین پر ٹوٹ پڑی۔ سڑکوں پر بالوں سے گھسیٹا گیا آنسو گیس کے شیل پھینکے حبیب جالب کا سر پھاڑ دیا گیا عورتوں کو جیل میں نظر بند کر دیا گیا رات کو کسی دباؤ کے تحت چھوڑ دیا گیا۔ اسی دن کی مناسبت سے آج بھی بارہ فروری کو خواتین کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ بے نظیر نے اپنی حکومت میں تفریقی قوانین تو ختم نہ کروا سکی البتہ خواتین کے نام سے بہت سے ادارے کھولے۔ قانونی اصلاحات

کے لیے کمیٹیاں بنائیں۔ مشرف نے اپنے دور حکومت میں خواتین کو نمائندگی دی۔ قانون شہادت کیس تو ختم نہ کرواسکے البتہ اس قانون میں ترامیم ضرور کردیں جس سے بھی بہت فرق پڑا۔ کاروکاری کو قتل عمد قرار دیا۔ زنا اور زنا بالجبر کو الگ کردیا۔ مصنفہ نے اس ادارے کے لیے بڑی دل جمی سے کام کیا خواتین کے حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

> ”خواتین کے حقوق کی جدوجہد معاشرتی ڈھانچے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جب تک اندر سے تبدیلی نہیں آئے گی عورت خود معاشی اور سیاسی طور پر مستحکم ہو کر اپنے حقوق کے لیے کھڑی نہیں ہوگی، کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئے گی۔“[۶۰]

۲۔ مردانہ سماج اور استحصالی رویے:

ہمارے خاندانی نظام پر پدرسری نظام کا تعلق تقریباً پانچ ہزار سال پرانا ہے۔ اینگلز نے معاشرے کے بدلنے کی وجہ معاشی تقاضوں کو قرار دیا۔ تقسیم وراثت کی وجہ سے یک زواجی کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ اسی وجہ سے خاندان میں شادیوں کا رواج عام ہوا۔ فرائیڈ کے مطابق خاندان کی قدیم ترین شکل باپ کی استبدادی حکمرانی ہے جس کے استحکام کو بڑھانے میں مذہب کا ہاتھ ہے دوسری طرف سے ہمارا معاشرہ طبقاتی معاشرہ ہے جہاں پر جاگیردارانہ نظام نے بھی عورت کو ذہنی طور پر غلام بنایا۔ اس کے اردگرد چار دیواری کا حصار کیا گیا جس میں اس کی اہمیت ایک شے یا چیز سے زیادہ نہ تھی۔ اس پر ہمیشہ ملکیت کی گئی اور اس ملکیت کو برقرار رکھنے کے لیے تاریخی ،مذہبی اور سیاسی حربوں کا استعمال کیا گیا۔ تاریخی کتابوں میں عورت کو نجس، جادوگر اور ناپاک کہا گیا، دوسری طرح مذہبی کتابوں کی تشریح اور تفسیر اس انداز سے کی گئی کہ عورت مرد کے ماتحت رہے انھی کتابوں میں سے ایک بہشتی زیور بھی ہے جو ۱۹۳۹ء کے قریب لکھی گئی۔ اس کتاب کے دس حصے ہیں اس کتاب کے مطالعے سے عورت مرد کی افضلیت کو تسلیم کرتی اور اپنی غلامی پر فخر محسوس کرتی ہے۔ اس کتاب میں عورت کو ایک اچھا غلام بننے کے طریقے اور گر بتائے گئے ہیں کہ کیسے وہ مذہبی مسائل اور امور خانہ داری کے ذریعے مرد کا دل جیت سکتی ہے۔ یہ کتاب لڑکیوں کو جہیز میں دی جاتی ہے تاکہ وہ ذہنی غلامی کے لیے خود کو تیار کر سکیں۔ اس کتاب کے مطابق حقوق صرف مرد کے حصے میں آتے ہیں اور عورت فرائض نبھاتے نبھاتے مر جاتی ہے۔ اسی کتاب میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحت مختلف کردار نوکر ،کسان ،مزدور ،مالک چوہدری وغیرہ کے ناموں سے تشکیل پاتے ہیں۔ یہ تقسیم طبقاتی اور پدرشاہی ہے جس میں عورت اور مرد کی تفریق کو ذہنی اور جسمانی تفریق میں بدل دیا گیا۔ عورتوں کے بارے میں من مانے تصورات گھڑے گئے ہیں۔ جس کو تقویت گھریلو علمی نظام نے دی ہے یہ نظام ہر گھر میں رائج ہے جو صنفی تفریق پر مشتمل ہے۔ اسی تفریق کے تحت افراد خانہ کی شخصیت تعمیر کی جاتی ہے جس سے کردار کی

شناخت تکمیل پاتی ہے۔اس نظام کا دارومدار تمام خیالات ،احساسات،جذبات اور نظریات ،طور طریقوں ،ہنر علوم اور رشتوں پر ہے۔ہر شخص اس نظام سے متاثر ہوتا ہے خاص طور پر عورت کیوں کہ وہ گھر کے اندر رہتی ہے اور اس طبقاتی تقسیم میں سب سے نچلے درجے پر ہے۔خاندان ،مذہب ،سیاست اور ریاست مختلف طریقوں سے عورت کا استحصال کرتے ہیں۔جس کے بارے میں حناجیلانی لکھتی ہیں:

"ریاست عورتوں کو کنٹرول کرنے میں خاندان کی مدد کرتی ہے اور ایسے قوانین بناتی ہے جو خاندان کے مردوں کو عورت کے خلاف مدد دیں ،دوسری طرف خاندان کے افراد عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاکر ریاست کی مدد لیتے ہیں اور ایسے رسم ورواج قائم رکھتے ہیں جن سے عورتوں پر قابو مکمل اور یقینی بنایا جاسکے۔"(۶۱)

گھر کو زنانہ اور مردانہ دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے مردوں کو فوقیت اور عورتوں کو کمتر اور ادنی سمجھا جاتا ہے۔مرد عورت کے فرق کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے کی تمیز بھی کی جاتی ہے پدرانہ نظام کے تحت مرد عورت پر فوقیت رکھتا ہے اور بڑا چھوٹے پر۔لڑکوں کی دنیا باہر کی دنیا ہے جب کہ لڑکی کی دنیا گھر تک محدود ہے جس کی چاردیواری کو وہ اپنی کل متاع حیات سمجھے۔ایک لڑکا ماں سے بدتمیزی کر سکتا ہے مگر لڑکی نہیں۔لڑکی کو شادی کی منڈی کے لیے تیار کیا جاتا ہے اس میں وہ تمام صفات ہونی چاہیں جو ایک وفادار ،اچھی بیوی اور ماں میں ہونی چاہیں۔یہ نظام پدرشاہی روایات کے مطابق مردانگی اور نسوانیت کی تعمیر کرتا ہے۔جس میں مرد اور عورت مختلف اور متضاد خانوں میں بٹ جاتے ہیں۔مثلا عورت جذباتی ،کم عقل ،بزدل اور نازک ہوگی جبکہ مرد ہمیشہ بہادر،ذہین ،عقل منداور فاتح ہوگا۔گھر میں مرد اور عورتوں کے کاموں کی تقسیم کی گئی ہے جو اگر مرد گھر کے کام میں خواتین کی مدد کریں تو ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔نجی اور عوامی جگہوں پر بھی یہ ہی ناہمواری قائم ہے۔عورتوں کو بس سٹینڈ ،پارک اور سڑکوں پر ہراساں کیا جاتا ہے۔گھر کی چاردیواری میں مقید کرنے کے بعد اسی گھر کے بارے میں اجنبیت بھی پیدا کی جاتی ہے یہ کہہ کر کہ بیٹی تو پرایا دھن ہے اسے اگلے گھر جانا ہے۔اس گھر کے بارے میں لڑکیوں کے ذہن میں ڈراور خوف پیدا کیا جاتا ہے۔رخصتی کے وقت والدین اپنی بیٹی کو نصیحت کرتے ہیں کہ سرخ جوڑے میں جارہی ہو کفن پہن کر نکلنا جس کا مطلب ہے کہ موت سے پہلے خاوند کا گھر نہ چھوڑنا۔عورت کی شناخت کو مرد کے ساتھ جوڑ دیا گیا اس لیے اس کی پہچان بہن ،بیٹی ،بیوی اور ماں کے رشتوں سے کروائی جاتی ہے۔اسی شناخت کے نہ ہونے پر کسی کنواری عورت کا جنازہ جائز نہیں۔یوں جاگیردارانہ نظام عورت کو گھر کی چاردیواری میں بند کرکے مکمل طور پر غلامی کی زندگی سے نوازتا ہے۔اگر کوئی لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ جائے تو دوسری لڑکیوں کی مائیں

نرالے انداز میں نصیحت کرتی ہیں خاص طور پر اس وقت جب لڑکی گھریلو کام میں مصروف ہوتی تو اس کی ماں بھاگنے والی لڑکی کو ملنے والی سزا کا تذکر کرتے ہوئے ڈراتی ہے کہ اس کے باپ اور بھائیوں نے اسے پکڑ کر دس دن تک قید رکھا اور مارا پیٹا یا قتل کر دیا۔اس قسم کے قصوں سے بچپن سے ہی لڑکیوں کے دل میں خوف بیٹھا دیا جاتا ہے کہ شادی کے معاملے میں لڑکی کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام عورت کو اشتہاری چیز کے طور پر متعارف کرواتا ہے۔ شیمپو اور صابن کے اشتہار میں عورت کو گڑیا کی طرح خوب صورت اور لمبے بالوں والی لڑکی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اپنے آپ کو خوب صورت بنانے کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے۔ وہ سمارٹ رہنے کے لیے کئی کئی دن بھوکی رہتی ہے۔ شوہر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے مزیدار کھانوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل جیت لینے کے طریقے بھی بتائے جاتے ہیں۔ان سارے اعمال کے پس پشت "بہشتی زیور" کا بہت اہم کردار ہے جس میں بیوی کو شوہر کو خوش کرنے کے طریقے سیکھائے جاتے ہیں۔اس کی اطاعت، فرماں برداری کرنے کا حکم اس حد تک دیا جاتا ہے کہ کوئی بھی عبادت شوہر کی اجازت کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔گھریلو تعلیمی نظام میں ایک طرف شوہر کی اطاعت کو لازمی قرار دیا گیا تو دوسری طرف اسی مجازی خدا کو بے وقوف بنانے کے گر بھی سیکھائے جاتے ہیں۔ یہ تضاد گھریلو زندگی میں ہی نہیں بلکہر طرف نظر آتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی بھی اپنی کتاب بہشتی زیور میں لکھتے ہیں:

> ”اگر وہ دن کو رات بتلائے تو تم بھی دن کو رات کہنے لگو۔۔۔اگر کوئی بات تمہارے خلاف بھی ہو تو اس وقت جانے دو۔ پھر کسی دوسرے وقت مناسب طریقے سے طے کر لینا۔اگر میاں کے یہاں تکلیف سے گزرے تو بھی کبھی زبان پر نہ لاؤ اور ہمیشہ خوشی ظاہر کرتی رہو کہ مرد کو رنج نہ پہنچے اور تمہارے اس نباہ سے اس کا دل بس تمہاری مٹھی میں ہو جائے۔“[۶۲]

مولانا عورت کو ہشیاری اور چالاکی سیکھاتے ہیں کہ کس طرح بے وقوف مرد کا دل اپنی مٹھی میں کر سکتی ہے لیکن عورتیں صدیوں سے مردوں کی ان کمزوریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ مرد کو ایک طرف وفادار بیوی، ماں کی ضرورت ہوتی ہے تو دوسری طرف خوب صورت دل کو لبھا دینے والی طوائف کی طرف بھی دیکھتا ہے دونوں کا تعلق جنس سے ہے۔ سرکاری نظام تعلیم جدید اور روشن خیال ہے جبکہ گھریلو نظام روایتی، قدیم اور فرسودہ ہے۔ سرکاری تعلیم کے مضامین میں برابری کا تصور ہے تو گھریلو تعلیمی نظام میں تفریق پائی جاتی ہے بڑوں کی شان میں گستاخی اور بدتمیزی کو برا ہی نہیں بلکہ گناہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے عورت کو جنسی اشتہا کی ایک شے سمجھ لیا جس کو ایک جنسی ماڈل بنا کر چیزوں کی قوت خرید کو بڑھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس لیے ہر چیز کے کمرشل میں

عورت کو ضرور دکھایا جاتا ہے خواہ وہ یوریا کی کھاد کا ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف خواتین کی خوب صورتی کو بڑھانے کے لیے شیمپو، کریم اور لوشن کے کمرشل بنائے جاتے ہیں گھریلو خواتین ان کی پیروی کرتے ہوئے خوب صورت بننے کے چکروں میں وہ شیمپو اور کریمیں استعمال کرتی ہیں۔ کسی بھی طبقے کی عورت کو اپنی زندگی پر بہت کم اختیار ہے۔ خود مختار عورتوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر سکتی ہیں۔ ان میں سے اکثریت مردوں کی ماتحت ہے عورتوں کو اپنی تقدیر پر کنٹرول نہیں ہوتا کافی عورتیں حالات کا مقابلہ بھی کرتی ہیں اور خود اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہیں۔ بہت سی عورتوں کو طاقت کا کوئی اور ذریعہ نظر نہیں آتا تو وہ جادو ٹونے کے ذریعے اپنے حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر، بیٹے، بیماری اور تنگ دستی سے نجات پانے کے لیے مذہبی اور غیر مذہبی محفلوں میں تعویز دھاگے والوں کے پاس جاتی ہیں۔ ان کے اندر ہر قسم کی توہمات پرستی بھی پائی جاتی ہے ایسے نسخے اور ٹونے ٹوٹکے مردوں سے چھپا کر کیے جاتے ہیں۔ کئی عورتیں گھروں سے باہر آزادی سے گھومنے کے لیے مزاروں کا رخ کرتی ہیں جو اکثر ان کا استحصال بھی کرتے ہیں۔ گھریلو تعلیمی نظام میں جنوں اور بھوتوں کا اعلیٰ مقام ہے۔ آج کے جدید دور کا مقابلہ کرنے کے لیے مرد اور عورت دونوں کو ملازمت کرنی پڑتی ہے جس میں ملازمت پیشہ عورت دوہرے استحصال کا شکار ہوتی ہے ایک طرف گھر تو دوسری طرف ملازمت کی ذمہ داریاں۔ یوں سماجی اور معاشرتی سطح پر عورت کے ساتھ بے شمار زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوتی ہیں، خانگی تشدد، جنسی استحصال، ریپ اور ریپ کے بعد قتل۔ بعض ممالک میں جبری اموات بھی ہوتی ہیں عورتوں کو سماجی ناہمواری اور جنیڈر تفریق کے کرب سے بھی گزرنا پڑتا ہے اس لیے جو حقوق مردوں کو حاصل ہیں وہ عورتوں کو حاصل نہیں ہیں۔ اپنی کسم پرسی اور کم تری کا اظہار عورتوں نے اپنی آپ بیتیوں میں مختلف انداز میں بیان کیا ہے جس کا عکس مندرجہ بالا پیراگراف کی شکل میں ملتا ہے۔

شہر بانو کی اس آپ بیتی "بیتی کہانی" میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کے حالات وواقعات درج کیے گئے ہیں۔ شہر بانو کا تعلق ایک امیر اور نواب خاندان سے تھا۔ اس کا باپ اور سسر دونوں اپنی اپنی ریاستوں کے نواب تھے۔ نوابوں کے ہاں زیادہ شادیوں کا رواج عام تھا۔ شہر بانو کے والد نواب اکبر علی کی ملکیت میں بارہ بیویاں، تین بیٹے اور بارہ ہی بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے چار بیویوں کا انتقال ہو گیا اور آٹھ سلامت ہیں جن کو ریاست کی طرف سے پچاس پچاس روپیہ ماہ وار وظیفہ ملتا تھا۔ بارہ شادیاں کرنا کس مذہب میں جائز ہے؟۔ صرف دولت کی بنیاد پر بارہ شادیاں کرنا تو عیاشی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کی پیدائش بھی نواب خاندان میں ہوئی اور شادی بھی یہ بات خوش قسمتی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اس کی پیدائش پر خوشیاں منائی گئیں۔ دوسری طرف اسی وقت ان کی نسبت

نواب عبد الرحمن جھجر پاٹودی کے بیٹے سے طے کر دی گئی۔ اور پانچ سال کی عمر میں شادی کر دی گئی۔ یہ عمر بچوں کی کھلونوں کے ساتھ کھیلنے اور اسکول جانے کی ہوتی ہے۔ ان کو اس عمر میں شادی اور نکاح کا کچھ علم نہ تھا جس کا مصنفہ ذکر بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی بارات دادی کی گود میں سوار ہو کر اوپر سے دیکھی۔ اس دور میں کم عمری کی شادیوں کا رواج عام تھا اس لیے یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی گئی۔ اس کا سارا بچپن میکے اور سسرال کی طرف آنے جانے اور آنکھ مچولی کھیلنے میں گزرا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شہر بانو کی زندگی میں مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ۱۴/ ستمبر ۱۸۵۷ء میں کو انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور آگے بڑھتے ہوئے ۷/ اکتوبر کو ان کی ریاست پاٹودی میں پیش قدمی کی جہاں سے ان کے والد نے سسرالی خاندان کو ہجرت کا عندیہ دیا سب بے سروسامانی کے عالم میں دوڑ پڑے جن میں زیادہ تر خاتون خانہ تھیں۔ بچوں کو گود میں اٹھائے سواری نہ ملنے پر کئی کئی کلو میٹر کا سفر پیدل طے کرتی ہیں۔ ان کے بارے میں شہر بانو قیامت صغریٰ کا منظر بیان کرتی ہیں:

> "صرف تین تورتھیں تھیں۔ اور دو سو عورتیں، الٰہی اب کیا کریں۔ کس کو چھوڑیں، کس کو ساتھ لے کر چلیں آخر سواریاں رتھوں میں سمائیں وہ تو کھچ پچ ہو کر سوار ہوئیں۔ باقی ماما، اصیلیں اور بیبیاں بھی پیادہ پا چلیں۔ بال بچوں کو گودیوں میں اٹھائے ہوئے۔ گٹھڑی بغچی بغل میں دبائے ہوئے حیران سرگرداں' مرد کوئی ساتھ نہیں۔ بے سرا قافلہ۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن پیادہ پا کی حالت عجب بے کسی اور بے بسی کی تھی۔ پاؤں پر چھالے، لبوں پر نالے، چشم گریاں، آنسو رواں۔ کسی کا پائنچہ جھاڑ میں الجھا تو کسی کا دوپٹہ کھیت کی باڑ میں الجھا۔ کوئی چلتی تھی، کوئی تھکتی تھی، کوئی اٹھتی تھی، کوئی بیٹھتی تھی۔"(۶۳)

جھنجر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا دس بارہ روز قیام کے بعد پتہ چلا کہ باغیوں کی فوج پاٹودی میں نہیں آئی کسی نے افواہ اڑائی تھی۔ اس کے والد نے انگریزوں کی ایک میم کو ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر بحفاظت ان کے کیمپ میں پہنچا دیا تھا جس کے صلے میں انگریز سرکار نے ان کی جائیداد بحال رکھی۔ اس کے علاوہ باغیوں کا قتل عام ہی نہیں کیا بلکہ ان کی جائیدادیں بھی ضبط کر لیں۔ ان ہی باغیوں میں شہر بانو کا سسر نواب عبد الرحمن رئیس جھنجر بھی تھا جس کو نہ صرف گرفتار کیا گیا بلکہ تمام جائیداد بھی ضبط کر لی۔ شہر بانو اپنے سسر کے بارے میں لکھتی ہیں: "کوئی آدھے بجے ہوں گئے عین دوالی کی رات ۲۷ ماہ صفر کی تھی کہ نواب عبد الرحمن کی گرفتاری اور ریاست جھنجر کی بربادی کی وحشت ناک خبر سنی۔ ایسا صدمہ اور قلق ہوا کہ بیان کے قابل نہیں۔"(۶۴) پھر ان کی رہائی کے لیے ان تھک کوششیں ہوئیں مگر بے سود۔ نواب کو پھانسی ہوئی۔ ساری جائیداد ضبط ہوئی، نوکر چاکر تباہ ہو گئے۔ رشتے داروں کو جلاوطنی کا حکم دیا گیا۔

شوہر کو پھانسی ہونے کے بعد ساس نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ وہ جلاد بن کر بات بات پر ڈانٹنا شروع ہو گئی۔ بھائی کی شادی اور باپ کی وفات پر بھی میکے جانے کی اجازت نہ دی۔ بھائی محمد تقی کا انتقال ہوا تو شہر بانو دہلی آگئی آٹھ دس دن بعد خبر ملی کہ مصنفہ کی ساس بیمار ہے تو وہ مجبوراً لدھیانہ آگئی۔ تین مہینے ساس کی خدمت کی وہ پھر دوبارہ پرانی ڈگر پر آگئی۔ شہر بانو ان کے رویے سے تنگ آکر لکھتی ہیں:

"مگر مجھ سے وہی زکاوت 'روکھاپن' ناک میں دم آگیا۔ الٰہی کیا کروں۔ خاوند ہے تو اس کا عجب ڈھنگ ہے کہ کوئی پرواہی نہیں۔ ساس ہے تو اس کا یہ رنگ ہے کہ گویا خون کی پیاسی ہیں۔"(۶۵) شوہر بھی غیر ذمہ دار اور عیاش نکلا۔ اس نے باپ کے مرنے کے بعد ساری جمع پونجی دوستوں میں لوٹا دیا اور مقروض ہو گیا۔ وہ لکھتی ہیں:

> "چار پانچ کمینوں، گھر کے نمک حرام چیلوں اور باہر کے بدمعاشوں نے ایک سنگت بنا اور ان کو ورغلا لیا اور خوشامد کی باتیں بنا کر دمبازیوں پر چڑھا لیا۔ اب یہ صورت ہو گئی کہ آج پانسو روپیہ کی مرغی خرید لی اور کل دوسو روپیہ کا تیتر لے لیا۔ اسی طرح مرغ بازی اور تیتر بازی کے نقشے جم گئے اور لگی دولت اڑنے۔"(۶۶)

اصلاح کی بہت کوشش کی مگر ان کے کان پر توجوں تک نہیں رینگتی تھی۔ آخر مرزا ایوب بیگ پاٹو کی ریاست کے وفادار ملازم کو بلایا اور ساری حقیقت سے آگاہ کیا انہوں نے مشورہ دیا کہ تم دونوں لا بالغ ہو خاوند کے ساتھ رہنا ہے تو مال کی فکر چھوڑ دو۔ جب یہ مال ختم ہو جائے گا اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ بس صبر کرو دوسری طرف صاحب زادے نے ماں کے ساتھ بھی بے رخی اختیار کی اور لڑ کر اپنے چچا کے گھر چلا گیا مگر چال چلن وہی رہے۔ اور تو اور رمضان میں برف کھانے سے سر درد ہوا۔ جس سے شدید بخار ہوا۔ کسی علاج سے افاقہ نہ ہو سکا۔ آخر کار ۲۴ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا۔ اس کے جانے کے بعد زندگی کا دائرہ مزید تنگ ہو گیا۔ قرض خواہ کو اس کے ہونے سے حوصلہ تھا مرنے کے بعد انہوں نے قرض واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ اس کرب میں وہ لکھتی ہیں کہ: "عجب طرح کے جنجال میں تھی اور جان وبال میں تھی۔ ایسی ضرورت کا وقت اور گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ حیران سرگردان"(۶۷) کہیں سے سو روپے ادھار لے کر ان کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ رشتے داروں نے معاشرتی طور پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ گھر میں آمدن کم اور خرچ زیادہ ہو گیا۔ ساس کی سوکن نے بھی شوہر کی ضمانت کے ساتھ روپے کا مطالبہ کر دیا۔ قرض خواہوں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس کی منت سماجت کو کون سنتا ہے۔ انتہائی برے حالات میں ان کی ماں نے بھی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قرض کی واپسی کا تقاضا کیا جس سے شہر بانو کا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا۔

قرۃ العین حیدر کے بہترین ادبی شاہکار ''آگ کا دریا'' کو شروع میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں بدھسٹ اور ہندوانہ نظریہ تناسخ کی قائل قرار دیا گیا۔ انہوں نے ہندوستانی عورت کو چمپا اور سیتا کے حقیقی کردار میں دکھایا۔ وہ کہتی ہیں کہ ایک دن ادھیڑ عمر سانولی سی عورت ان کے گھر آئی اور ایک نوحہ پر سوز آواز میں سنایا۔ ان کی والدہ نذر سجاد حیدر نے اس کے متعلق جاننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں شادیاں نہیں ہوتیں۔ نذر سجاد نے اس کو جو پیسے دیئے اس کی کوکین کھا گئی۔ بعد میں پتہ چلا۔ یہ بریلی نامی طوائف تھی، جو آج کل گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ ڈاکٹر میر چندانی ایک نمایاں خاتون تھی جن پر مردوں کا کھلونا بنانے اور بے مہار جنسی تجربے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ چمپا کا کردار اجو باجی سے لیا ہے جنہوں نے لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ یہی چمپا قرۃ العین حیدر کے قدیم زمانے میں بوڑھے برہمن کی بیوی بننے پر مجبور ہوئی، عہد وسطی میں چمپاوتی بن کر ابوالمنصور کمال سے محبت کرتے ہوئے زندگی کو تنہا گزار دیتی ہے۔ لکھنو کے بازار میں جنسی شے بن کر اپنی پہچان کی متلاشی ہوتی ہے اور دور جدید میں چمپا احمد بن کر کامیابی کے سارے ظاہری وسائل سے بہرور ہوتی ہے۔ تعلیم کو اہمیت دیتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے اپنی آپ بیتی میں جج کرامت حسین کا ذکر محسن قوم کے طور پر کیا۔ جنہوں نے اپنے ذاتی خرچ سے مسلم گرلز اسکول قائم کیا۔ انہوں نے سکول کے ساتھ ساتھ بورڈنگ کا بھی اہتمام کیا تاکہ اسکول سے آتے جاتے کوئی لڑکی اغوا نہ ہو۔ اس کے باوجود مولویوں نے ان پر کفر کے فتوے عائد کئے اور اسکول کو بدنام کیا۔ شہر کے اوباش لڑکے اس اسکول کی عمارت کے نیچے کھڑے ہو کر تھیٹر کی غزلیں گایا کرتے تھے۔ قرۃ العین کے خیال میں عورتوں کو اپنے مسائل کا حل صرف ٹونے ٹوٹکوں میں نظر آتا ہے وہ اکثر کہتی رہتی تھیں ،فلاں نے فلاں کو تعویز ڈال دیئے۔ برہمن عورت اور شودر عورت سے پیدا ہونے والی اولاد چنڈال کہلاتی تھی۔ جو کمتر طبقہ تھا انھی طبقوں کے ساتھ جنسی تفریق نے جنم لیا۔ جو سہولتیں مردوں کو حاصل تھیں وہ عورتوں کو نہ مل سکیں۔ اس لیے عورت کو مرد کا غلام بنا کر رکھا جاتا تھا۔ مذہبی دستاویزات کے ذریعے عوام کو یقین دلایا جاتا تھا کہ عورت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ منواسمرتی میں عورت کی سماجی حیثیت پر طویل بحث کی گئی۔ اسی قسم کے خیالات ''مہابھارت'' بھارت میں بھی ملتے ہیں۔ خورشید انور اس بات کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''عورت کے متعلق اس قسم کے خیالات صرف قدیم ہندوستان یا ہندو مذہب کی کتابوں تک محدود نہیں، ہر ملک، ہر عہد، ہر مذہب میں عورت کو مرد سے کم تر تصور کیا گیا۔''[۶۸]

مسلم معاشرے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات اور خلفاء راشدین کے بعد عہد ملوکیت کا آغاز ہوا۔ فتوحات کی بدولت مسلمانوں کے گھر غلام مرد اور لونڈیوں سے بھر گئے۔ ملک کی سرحدیں پھیلتی گئیں اور

مفتوحین عورتیں لونڈیاں بن کر رہ گئیں۔لونڈیوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی اور نہ ہی ان سے تعلق بنانے کے لیے نکاح کی ضرورت تھی۔عباسی دور میں چار ہزار کنیزیں تھیں۔مویشیوں کی خرید و فروخت کرنے والوں نے لونڈیوں کی خرید و فروخت بھی شروع کر دی۔اس کاروبا کو کرنے والے نحاس کہلاتے تھے۔کنیزیں قیمتی تحفے کے طور پر پیش کی جاتیں۔پیشتر عباسی خلفاء ان ہی لونڈیوں کی اولاد تھے۔بادشاہوں نے اپنے محلات میں کئی عورتوں کو رکھنا شروع کر دیا۔ایرانی اور بازنطینی بادشاہوں نے باقاعدہ حرم کی بنیاد رکھی۔عربی زبان میں حرم زنان خانہ کو کہاجاتا ہے لغوی معنوں میں حرم کا لفظ گناہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اصطلاحی معنوں میں ایسی خطرناک سرحد جہاں مقدس قوانین اور لذتوں کا ٹکراؤ ہو۔ایسی جگہ جہاں مرد کسی مزاحمت اور مشکل کے بغیر لذتیں حاصل کریں۔حرم کا تعلق مشرقی اور مغربی دونوں ملکوں سے ہے۔حرم میں رہنے والی عورتوں کا تعلق بادشاہوں سے ہوتا تھاجو ان کی وفات کے بعد بھی آزاد نہ ہوتی تھیں۔خواجہ سرا ان پر کڑی نظر رکھتے تھے۔عثمانی خلفاء کا سب سے بڑا حرم تھا۔اگر کوئی کنیز کسی اور کے ساتھ جسمانی تعلق میں ملوث دیکھ لی جاتی تو ان کو سزا کے طور پر بوری میں بند کر کے فاسفورس میں ڈبو دیا جاتا۔سلطان کے مرنے کے بعد اس کے حرم کو محل میں منتقل کر دیا جاتا جسے "آنسوں کا محل" کہا جاتا تھا۔یہ رسم ہندوستان میں بھی منتقل ہوئی جہاں پر بادشاہوں کے علاوہ امراء کے بھی حرم اور زنانہ خانے ہوتے تھے۔زنانہ خانوں اور مردانہ خانوں میں بٹے ہوئے گھروں میں اور بھی فاصلے بڑھ گئے۔قرۃ العین حیدر بھی اٹھارویں صدی میں حرم سرا کا عندیہ بھی دیتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں:"اکثر کوٹھیوں میں آج بھی ایک "بی بی خانہ" احاطے میں ہوتا ہے۔لاحول ولا قوۃ"(۶۹)

حرم سرا کے بعد طوائف الملوکی ہمارے معاشرے کا دوسرا بڑا سماجی ادارہ ہے جس کے ساتھ چار رسمیں منسلک تھیں گانا، رقص، تہذیب اور جسم فروشی۔یہ ہماری تہذیب کا ایک ایسا حوالہ ہے جو معیاری انسان سازی کا درجہ رکھتی ہے مہذب خاندانوں کے بچے ان سے تربیت حاصل کرتے تھے۔یہ صرف اپنا جسم ہی نہیں فروخت کرتی بلکہ علم و فنون کو بھی ترویج دیتی تھی فنون لطیفہ سے تعلق نہ رکھنے والی خاتون طوائف کلچر کا حصہ نہیں بن سکتی تھیں۔رنڈی بازی اور طوائف کلچر میں یہی فرق ہے کہ رنڈی صرف جسم فروخت کرتی ہے جبکہ طوائف کلچر فنون لطیفہ کا پورا ادارہ ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ طوائف کا کردار صرف جسم فروشی پر آکر ختم ہو گیا۔سماجی تبدیلیوں نے ان ضم شدہ چار رسموں کو الگ الگ کر دیا۔گلوکارہ، رقاصا اور آرٹ ایک الگ شعبے بن گئے جن کا جسم فروشی سے کوئی تعلق نہیں رہا ان کا معاشرے میں ایک الگ مقام ہے۔طوائف شروع میں فلموں سے بھی وابستہ ہوئی۔طوائف کلچر قدیم زمانے میں آسودگی حاصل کرنے کا گھٹیا ترین ذریعہ تھا۔امیر اور طاقت ور لوگوں طوائف تک رسائی کرنے کو اپنا

حق سمجھتے تھے عام آدمی نے اس کو عیاشی اور بے حیائی کا نام دیا جو سماجی گالی بن گیا طوائف اور ان سے منسلک افراد کو برے القاب سے پکارا جانے لگا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی آپ بیتی "کار جہاں دراز" میں طوائف الملوکی کا ذکر کیا اور وہ معاشرے میں ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں کو بھی بھانپ رہی تھیں۔ وہ طوائف بنی کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ بائی راجپوتوں کی راجکماریوں اور رانیوں کا لقب تھا تنزل کے دور میں مغلیہ دربار کے اندر رقاصاؤں کا اثر بڑھا ان کو بائی کا خطاب ملا۔ بمبئی کے پارسیوں نے تھیٹر کمپنیاں کھولی تو نوجوان لڑکے زنانہ سوانگ بھر کے شہر شہر مخرب اخلاق ڈرامے دکھلاتے پھر رہے تھے مسلمان روساء کی عیش پرستی کا وہی حال ہے اب تھیٹر کمپنیوں بائیوں کی سرپرستی میں چل رہی تھیں جس میں شعر و شاعری، گل و بلبل کا شور جاری و ساری تھا۔

دوسری جگہ قرۃ العین حیدر کو طوائف کلچر ختم ہوتا نظر آتا ہے تو وہ اسے ماضی کی ایک تصویر بنا کر پیش کرتی ہیں۔ میر سعد اللہ نے اٹھارویں صدی میں طوائف الملوکی دیکھی نواب سید محمد علی نے اپنے نواسے سید معشوق علی خان کی پیدائش کے جشن میں گانے والی ایک نامی طوائف کو بطور انعام وہ پورا باغ عطا کر دیا تھا جس میں وہ دعوت منعقد کی تھی مراد آباد میں وہ باغ آج کل "طوائف کا باغ" کہلاتا ہے۔ وہ بدلتے ہوئے معاشرے کے متعلق لکھتی ہیں کہ سوسائٹی بہت MOBILE ہوتی جا رہی ہے۔ سب بدلتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کر رہے ہیں۔ پاکستان میں مغربی اور اسلامی تجدید کے درمیان نظریاتی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر روش ندیم ہمارے معاشرے میں طوائف کے بارے میں قائم مردانہ نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "مرد عورت کو طوائف بنانے والا بھی ہے اور اس کا گاہک بھی ہے، وہ طوائفیت کے کاروبار کا محافظ بھی ہے اور معاشی مفاد اٹھانے والا مالک بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مرد سماج میں اپنے ترتیب دیئے ہوئے ضابطہ ءاخلاق میں طوائف کو گھٹیا، نجس اور قابل نفرت بھی گردانتا ہے۔"(۷۰)

طوائف بن کر سامنے آنا بھی عورت کا ایک استحصالی کردار تھا اکثر شریف خاندانوں سے بدلا لینے کے لیے ان کی بچیاں اغوا کی جاتیں اور ان کو طوائف کے کوٹھے کی زینت بنا دیا جاتا جہاں سے ان کی گھر کی طرف واپسی ناممکن ہو جاتی معاشرہ ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ اکثر لڑکیاں غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس فعل کی مرتکب ہوتیں۔ دیہاتوں کے سخت ماحول سے نجات پانے کی پاداش میں بھی گھریلو لڑکیاں گاؤں سے شہر کا رخ اختیار کرتی ہیں اور اچھی نوکری کے سبز خواب دکھانے والے مرد ان کو جنسی دھندے میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ باقی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس پیشے سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ان طوائفوں کی زندگی کے اولین پانچ سال تو اچھے

گزرتے ہیں۔ایسی عورتیں اپنے بدن کو چست رکھنے کے لیے فاقہ کشی اور ورزشیں بھی کرتی ہیں تاکہ وہ چست اور خوب صورت نظر آئیں۔پانچ سال بعد ان کو جراثیم لگ جاتے ہیں ۳۵٪ کی حالت خراب ہونے پر آپریشن کرنا پڑتا ہے بیس میں سے ایک کو ٹی بی کا مرض لگ جاتا ہے باقی کی ساٹھ فی صد نشے اور شراب کی عادی بن جاتی ہیں طوائف الملوکی میر خانی گردی کے دور میں بڑھ گئی۔دوسروں کا علاقہ چھین کر دشمن کے بیوی بچوں کو پال کر گڑھی پر اپنا پرچم لہراتے تھے۔جنگ میں قید ہو جانے والی عورتیں دشمن کے بچوں کو جنم دیتی اور پالتی تھیں۔اٹھارویں صدی میں دولت نہ ہونے کی وجہ سے حرم رکھنے کا رواج کم پڑ گیا تھا۔

درباروں سے خواتین کا قدیم تعلق ہے جہاں جاکر ان کو لگتا ہے ان کی دلی مرادیں پوری ہوں گی گھروں کا گھٹن زدہ ماحول جس میں لڑکیاں باہر آکر سانس بھی نہیں لے سکتیں۔درباروں پر آکر آزادی سے سانس تو لے لیں گی اپنی خواہشوں کو پورا نہ ہوتے دیکھا کر ان کی امید کی آخری کرن بھی ڈوب جاتی ہے قرۃ العین حیدر ان کے ہر مرض کو آسیب کا نام دیتی ہے۔ایک طرف جینے کی کسک اور دوسری طرف مرنے کی تمنا ان درباروں کی تاریخ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔اکبری بیگم اپنی بڑی خالہ عمدہ بیگم کا ذکر کرتی ہیں جن کی عمر اسی سال تھی۔غدر کے دن ان کا نکاح ہوا رخصتی والے دن ان پر ایک جن عاشق ہو گیا رخصتی نہ ہونے کی وجہ سے بس مصلے پر بیٹھی اللہ اللہ کرتی رہتی تھیں ان پردہ نشین عورتوں میں بہت سے امراض جنسی گھٹن کی پیداوار تھے جو عام پائے جاتے تھے جن میں مالیخولیا،ہسٹریا اور تپ دق شامل ہیں۔عیسائی مذہب میں نن کا ایک کردار ہے جو معاشرے کی خدمت کرنے کی وجہ سے شادی نہیں کرتی اور اپنا سارا وقت عوام کی خدمت میں گزار دیتی ہیں۔قرۃ العین حیدر اپنی آپ بیتی میں نن کا ذکر کرتی ہیں جو دہرہ دون کی ایک نن طوفان میں خرگوشوں کی جان بچاتے ہوئے سردی لگنے سے مر گئی۔

نہٹوری خاندان جو مختلف برادریوں پر مشتمل تھا وہاں پر عورتوں کی جمعے والے دن باقاعدہ طور پر منڈی لگتی تھی۔جس میں عورتیں بیچی جاتی تھیں۔کمین اپنی پسند کی عورت خریدتے اور اچھی نہ نکلنے پر اشیاء خورونوش کی طرح دوبارہ فروخت کر دیتے تھے۔یہاں سے عورت شکل اور عمر کے لحاظ سے بیس سے پچاس ہزار میں مل جاتی تھی۔ان کے بارے میں قرۃ العین حیدر کہتی ہیں:"کمینوں میں کسی کی عورت مر جائے یا بھاگ جائے یا ناپسند ہو تو بازار میں اس کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔"(۱۷) قرۃ العین حیدر کا تعلق ادبی گھرانے سے تھا ان کے والد،والدہ اور پھوپھو اکبری بیگم بھی تخلیقی ذوق رکھتی تھی۔اس دور میں خواتین اپنی تخلیقات اپنے نام سے شائع نہیں کرواتی تھیں۔ان کی پھوپھو اکبری بیگم نے "گلدستہ محبت"،"شعلہ پنہاں"،"عفت نسواں" اور "گوڈر کا لال" جیسے شاہکار ناول لکھے۔انہوں نے اپنا پہلا ناول "گلدستہ محبت "عباسی مرتضی کے مردانہ نام سے چھپوایا کیوں کہ اس دور میں خواتین اپنے ناموں کو بھی

پردہ کرواتی تھیں جو اب نایاب ہو چکا ہے۔ ان کا "ناول گوڈر کا لال" بہت مشہور ہوا جو مڈل کلاس خواتین کی بائبل کہلانے لگا اور لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا اس ناول کے مداح تو بہت پیدا ہو گئے مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ "والدہ افضل علی" کون ہیں؟ اور اس ناول کے پس منظر اور کردار کہاں سے لیے گئے ہیں۔ ان کی والدہ بنت نذر باقر یا مس نذر باقر کے نام سے نام لکھے جس سے پورے حلقے میں شور مچ گیا کہ شریف مسلمان لڑکیوں کا اپنے نام کے ساتھ "مس" کا لقب لگانا مناسب بات ہے یا بے ہودہ؟۔۔۱۹۰۵ء میں اصلاح لباس کی تحریک شروع ہوئی کہ خواتین کو کھنچواں پاجامہ پہنیں یا شلوار۔۔۔؟ ہر پابندی کا تعلق عورت سے ہی رہا۔

میر نذر باقر کے ڈرائنگ روم میں موسیقی کے آلات، فوٹو گراف، تھیٹر کی چیزیں اور غزلوں کے ریکارڈ موجود تھا یہ پلیٹیں جن کو عام طور پر نیٹو تو اکہتے تھے صرف مردانہ دعوتوں کے موقعوں پر بجائے جاتے تھے۔ کنواری بالیوں کو تھٹیر کی چیزیں اور غزلیں سننے کی ممانعت تھی ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پڑھنے اور نعتیہ قوالیاں سننے کی اجازت تھی۔ ان کے پاس انگریزی موسیقی کے بھی ریکارڈز تھے جیسے انگریزی باجا"" انگریزی مزاح نگاری کی نقل وغیرہ یہ سب لڑکیوں کے لیے جائز تھے کیوں کہ انگریزی سننے سے زبان کو سمجھنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ مصنفہ کی اس بات سے مولانا اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور کی ایک جھلک نظر آتی ہے، جہاں پر اپنی مرضی سے کچھ چیزوں کو جائز اور کچھ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر لندن میں بطور صحافی منتقل ہوئی۔ حکومت سے یہ فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ ان کو تنخواہ کراچی کی صحافی کی حیثیت سے دی جائے یا نہ دی جائے۔ اس موقعے پر وہ لکھتی ہیں:

> "نہ میں چودھری صاحب سے اقربا پروری کے لیے کہوں گی نہ وہ اقربا پروری کریں گے۔ میرا معاملہ سراسر حق بجانب ہے۔ اگر اس جگہ کوئی لڑکا ہوتا اس کا باضابطہ فورا تقرر کر لیا گیا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ دنیا مردوں کے لیے بنی ہے اور لڑکیوں کی اس میں کوئی جگہ نہیں۔"(۷۲)

ان کی والدہ نذر سجاد کی اجازت کے بغیر ان کے ناول "آہ مظلوں" پر بمبی میں ایک خاموش فلم بنی۔ خود قرۃ العین حیدر کو ان کی مقبول ترین تخلیق آگ کا دریا پر رائلٹی کے نام سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔ وہ شاعرات اور شعرا میں پائی جانے والی اقدار کے فرق کی کو واضح کرتی ہیں۔ ان کے دور میں خواتین چق کے پیچھے نعتیہ کلام تو پیش کر سکتی تھیں مگر اسٹیج پر آکر غزل نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے شاعرات میں وہ اقدار نہیں تھیں جو شعرا کا خاصا تھیں۔

ائیر ہوسٹس لڑکیوں کی ضرورت پیش آئی تو قرۃ العین حیدر پشاور وویمنز کالج گئی تو وہاں کی پرنسپل سے اپنے آنے کی مدعا بیان کیا تو پرنسپل نے بتایا یہاں پر پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے کوئی عورت کیسے گھر سے کوسوں دور ملازمت کر سکتی ہے۔ بہت سی عورتیں اپنی صلاحیتوں کا مظاہر معاشرتی اور مذہبی پابندیوں کی وجہ سے نہیں کر پاتی۔

عورت کی کسمپرسی کی داستان کو مزید آگے بڑھتے ہوئے لکھتی ہیں: "زیادہ تر عورتوں پر چاقو پھینکے جاتے ہیں اور دیوار سے لگی دم سادھے کھڑی رہتی ہیں۔"(۴۳) اس دور میں عورت گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ ایک دفعہ قرۃ العین حیدر کو فلم کی شوٹنگ کے لیے لڑکیوں کی ضرورت پڑی تو کالج کی پرنسپل نے لڑکیاں اس شرط پر بھیجنے کا وعدہ کیا کہ فلم پاکستان میں نہیں چلائی جائے گی۔ لڑکیاں کھیتوں میں جھومر (ناچ) رہی تھیں کہ پانچ چھ دیہاتی ڈنڈا بردار مولویوں نے حملہ کر دیا وہ مارنے کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان میں نامعقول کلمات بھی ادا کر رہے تھے۔ وہاں پر موجود سب لوگوں کے طوطے اڑ گئے۔ سب وہاں سے سرپٹ بھاگے۔ اس کے بعد قرۃ العین حیدر مولویوں سے ڈرنے لگیں اور اس واقعے کے بعد سب خواتین جم خانے میں رقص کرتی ہیں تا کہ مولوی وہاں نہیں آ سکتے تھے۔ قرۃ العین حیدر ورجینا وولف سے بہت متاثر تھی۔ انہوں نے ورجینا وولف کے اس لیکچر کا ذکر کیا جو انہوں نے ۱۹۲۸ء میں کیمبرج یونی ورسٹی کی طالبات کو دیا۔ تب تانیثی تحریک کا ابتدائی دور تھا۔ جس میں ورجینا وولف نے خواتین کے ساتھ کیے جانے والے تین اہم ترین استحصالی رویوں کی طرف اشارہ کیا۔ خواتین کو بہار کے موسم میں مردانہ کالج کی گھاس پر چلنے کی اجازت بھی نہیں تھی، وہ صرف بجری پر چل سکتی تھیں۔ ۱۸۶۰ء میں جب ایک زنانہ کالج قائم کرنے کے لیے خواتین کی کمیٹی بنائی گئی جب چندہ جمع کرنے کی باری آئی تو ان کی امیر ہونے کے باوجود بھی جیبیں خالی تھیں جبکہ ان کے شوہروں کے پاس بینک میں کروڑوں پاؤنڈ تھے۔ ۴۸ سالوں میں ایک نئے ایکٹ کے ذریعے وہ اپنے پیسوں کی مالک بنیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری میں لاکھوں کتابیں مرد مصنفین کی لکھی ہوئی تھی جبکہ عورتوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ شاعری اور فکشن لکھتے ہوئے مصنفین کے دماغوں میں عورت سماجاتی تھی۔ تخلیقی لحاظ سے ان کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ وہ مزید لکھتی ہیں: "بے چاری جین آسٹن، اپنے مسودات بلاٹنگ پیپرز کے نیچے چھپا کر رکھتی تھی۔"(۴۴) شیخ سعدی رحمتہ علیہ نے اپنے بیٹوں کے نام نصیحت نامہ لکھا۔ جس میں عورتوں کے بارے میں عام روایتی تصورات پیش کیے گئے۔ وہ اپنے بیٹوں کے اعلی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے رب کائنات کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اب انہیں اپنے اچھے برے کی پہچان ہے۔ وہ اپنے ہر کام میں اپنے بھائیوں کے ساتھ اتفاق سے رہیں۔ جو کام خود پسندی اور عورتوں کے کہنے پر کریں گے اس کا انجام برا ہو گیا کیوں کہ ان کے خیال میں عورتیں خود غرض اور کم عقل ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں پر دھیان نہ دیا جائے۔ عورتوں پر رعب وداب رکھنا چاہیے۔ جب کہ اس دور میں تمام

ریفامرز خاندان کی بقا کی کوشش کر رہے تھے اس لیے قرۃ العین حیدر کہتی ہیں:"اس زمانے میں سارے ریفارمر بھی اسی تگ ودو میں لگے ہوئے تھے کہ عورتوں سے لڑ جھگڑ کر خاندان تباہ نہ کریں۔"(۷۵) قرۃ العین حیدر کا ورجینا وولف سے متاثر ہو کر اپنے ناول میں ان کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان کو پسند کرتی ہیں اسی وجہ سے لوگوں نے ان کو اردو کی ورجینا وولف کہا۔

صالحہ عابد حسین کے زمانے میں عورتیں ناولز اپنے نام سے نہیں لکھتی تھیں جس کی مثال "گوڈر کا لال" ناول تھا جو اکبری بیگم نے اپنے والد افضل علی کے نام سے لکھا تھا۔ بڑی بہن کی شادی پر چچا میاں ناراض ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی والدہ نے نوکرانی کی کفالت کرنے کے لیے اس کی بیٹی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کی عمدہ تربیت کی جب لڑکی بڑی ہوئی تو بزرگوں کی غیرت اور خاندانی رعب و دبدبہ غالب آگیا۔ انہوں نے شیری (شیریں) کا رشتہ ایک بڑی عمر کے دوہاجو اور کئی بچوں کے باپ سے کر دیا۔ جب کہ لڑکی شکل وصورت اور سیرت کے لحاظ سے کسی بڑے اور اچھے خاندان کی زینت بن سکتی تھی۔ والدین کے فیصلے کے آگے بیٹی نے بھی گھٹنے ٹیک دیئے۔ ان کے والدہ نے شیری کے جہیز اور شادی کے تمام اخراجات برداشت کیے۔ اس وجہ سے شیری ان کی منہ بولی بہن کہلاتی تھی۔ بچے بزرگوں کی پیروی کرتے ہیں۔ اس دور میں سات سال کی بچی کو آدھی عورت سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم کا رجحان نہ ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کی معلومات برائے نام تھی۔ ہندو لڑکیوں کو اسکول جانے اور پڑھنے کی اجازت نہ تھی اچھے گھرانے کے لوگ مولوی ماسٹر سے پڑھواتے تھے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا ایک حسرت بن گیا تھا۔ صالحہ عابد حسین کی شادی اپنے سے دس سال بڑے شخص سے ہوئی۔ صالحہ عابد حسین نے بھی اپنی ماں کی طرح خاندان اور باہر کی بہت سے لڑکیوں کی تعلیم اور شادی کے انتظامات کیے۔ نذر سجاد کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ اپنے شوہر سجاد حیدر یلدرم کی وفات کے بعد بی۔ پی کی مریضہ بن گئی تھی۔ صالحہ عابد حسین کی چھوٹی باجی بیمار ہوئی تو لوگوں نے شادی کا مشورہ دیا کیوں کہ اس دور میں ہر مرض کی دوا شادی کو سمجھا جاتا تھا۔ ان کی آپا سید بشیر الدین مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لائبریرین کی سالی تھی۔ نوعمری میں ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ وہ انتہائی خوب صورت تھی۔ گرلز اسکول میں اسلامیات پڑھاتی تھی۔ صالحہ عابد حسین کی نظر میں ایک عورت کا لکھنا ہی سب سے بڑا عیب ہے وہ اپنے دور کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتی ہیں کہ میری ایک خامی عورتوں کی ادیب ہونا بھی ہے ہمارے ہاں اکثر مرد عورت شاعرہ اور ادیب پر چراغ پا ہوتے ہیں جبکہ ادیب ادیب ہوتا ہے اس میں مرد عورتوں کی تخصیص کیسی؟ عورتوں کے جلسے اور پروگرام میں جانا اپنی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

صالحہ عابد حسین اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ان کے خاندان میں بیوہ عورتیں بہت زیادہ تھیں۔ اس لیے وہ اپنے ایک ناولٹ کے اقتباس میں ہندوستانی عورت کے بارے میں لکھتی ہیں:"ہندی عورت کے اس روپ کے نام جو مر مر کے جیتی اور جی جی کر مرتی ہے مگر ہار نہیں مانتی۔"(۷۶) خاندان کی لڑکی رضیہ کی شادی ڈاکٹر اور کنوارے لڑکے سے ہوئی جو معمولی اور واجبی شکل وصورت کا مالک تھا۔شادی کے تیرہ سال بعد شوہر نے بیوی کو بیمار پاکر دوسری شادی کرلی اور عمر بھر اس کے سینے پر مونگ دلوائی۔ان کے خاندان کی زیادہ تر لڑکیاں نفسیاتی الجھنوں اور ہسٹریا جیسی بیماریوں میں مبتلا تھیں۔

عصمت چغتائی کا شمار ترقی پسند تحریک کے نام ور مصنفین میں ہوتا ہے انہوں نے بڑی جرات اور بے باکی سے معاشرتی ناہمواریوں کو بیان کیا۔ان کے مطابق یہ دنیا مردوں کی بنائی ہوئی ہے اور عورت اس دنیا کا ایک ٹکڑا ہے جسے انہوں نے محبت اور نفرت کے اظہار کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے وہ عورت کو اپنے مزاج کے مطابق ٹھکراتا اور اپناتا ہے۔بچپن میں پیش آنے والے حالات وواقعات انسان کی آنے والی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔زیادہ بہن بھائی ہونے کی وجہ سے عصمت کو والدین کا پیار اور توجہ نہ مل سکی۔ان کی والدہ بچوں کی تعداد زیادہ ہونے پر اپنی صحت،گھر کی صفائی ستھرائی اور بچوں کی تربیت پر توجہ نہیں دے سکتی تھی۔وہ لکھتی ہیں:"

> ہم اتنے سارے بچے تھے کہ ہماری اماں کو ہماری صورت سے قے آتی تھی،ایک کے بعد ایک ہم ان کی کوکھ کوروندتے کچلتے چلے آئے تھے۔الٹیاں اور درد سہہ سہہ کر وہ ہمیں ایک سزا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔کم عمری میں ہی پھیل کر چبوترہ ہوگئی تھیں پینتیس برس کی عمر میں وہ نانی بھی بن گئیں اور سزا در سزا جھیلنے لگیں۔"(۷۷)

وہ بچپن کو زندگی کی حسین یادوں اور خوب صورت لمحات سے تعبیر نہیں کرتی بلکہ وہ اس کو محتاجی اور محرومی کا دور قرار دیتی ہیں جس میں بچے بڑوں کے محتاج ہوتے ہیں وہ جو چاہیں بچے کو بنا دیں۔اس میں بچے کا کوئی کردار نہیں ہوتا اس لیے وہ لکھتی ہیں:"بچپن نام ہے بہت سی مجبوریوں کا محرومیوں کا بڑے ہوکر ایک پوزشن بنتی ہے۔جو انصافیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتی ہے۔"(۷۸) جب کوئی نیا مہمان آتا اس کے لیے آگرہ سے انا منگوالی جاتی جو خود لاپرواہ اور ماں کی ممتا سے عاری تھی۔اپنے عاشق سے ملنے کی خاطر بچوں کو جہاں دل کرتا وہاں پھینک دیتی تھی۔بہنیں بڑی ہونے کی وجہ سے زیادہ تر کھیل کود بھائیوں کے ساتھ کرتی تھی اور انداز بھی لڑکوں والے اپنائے ہوئے تھے۔ماں کو ہر وقت اندیشہ رہتا کہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔اس لیے ان کی والدہ کا خیال تھا ایسی یہ مردانہ باتیں عورتوں کو زیب نہیں دیتی دوسری طرف عصمت چغتائی کو بھی عورتوں کی طرح سجنا سنوارنا اور بھڑکیلے قسم کے

لباس پہنا پسند نہ تھے۔ عصمت چغتائی کی پڑھائی میں ان کے بڑے بھائی مرزا عظیم بیگ بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ان کو ترجمہ کرنے کے لیے روز ایک تحریر دیتے۔ جب مصنفہ میٹرک میں پاس ہوئی اور بھائی فیل ہوا تو ماں کو بہت دکھ ہوا کہنی لگیں: "اے غارت ہو اس کمبخت کا پاس ہونا کس کام کا بلا سے فیل ہو جاتی۔ شمیم پاس ہو جاتا۔۔۔۔ انہہ لڑکی ذات کو کون ساڈگریاں لینی ہیں مرد ذات کی تو زندگی خراب ہے۔"(۷۹) خاندان کی پہلی لڑکی حشمت خانم نے مڈل پاس کیا اور لکھنو میں استانی کی نوکری کی۔ عصمت چغتائی کے والد نے اپنی ان دونوں بیٹیوں کو کرامت حسین بورڈنگ میں داخل کرادیا۔ اس بات پر خاندان والوں نے بائیکاٹ کر دیا اور کہا تم لڑکیوں کو کرسٹائن بنا رہے ہو ان کی شادیاں نہ ہو سکیں گی سب کو ساری عمر پالنا۔ ان اعتراضات کی وجہ سے عصمت چغتائی کے والد نے مجبورا دونوں بہنوں کو واپس بلالیا۔

اپنے معاشرے اور اردگرد کے ماحول میں عورت پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی کو دیکھ اس کا اظہار مختلف پیرائے میں کرتی ہیں۔ کبھی اپنی بہن کے بارے میں لکھتی ہے تو کبھی پھوپھی زاد بہن کے بارے میں معاشرتی رویوں پر اپنی کسمپرسی کا اظہار کرتی ہے۔ بڑی بہن کی شادی لڑکے کو دیکھے بغیر طے کر دی گئی کہ اس دور کے لحاظ سے لڑکی کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ پہلے ایک جگہ بات چلی تو لڑکا لفنگا اور قاتل تھا وہاں سے بات ختم ہوئی تو والدین نے پریشان ہو کر نئی جگہ بات چلائی۔ لڑکے کی صورت تک نہ دیکھی اور بات طے کر دی۔ شادی والے دن باپ نے جب لڑکا دیکھا تو ان کے پسینے چھوٹ گئے وہ لکھتی ہیں کہ: "صفدر میاں کو دیکھ کر ابا میاں کو پسینہ آگیا۔ جیسے دق کا مریض لمبے بانس، کچی داڑھی، ماتھے پر شکنیں، آنکھوں میں تھکان۔"(۸۰)

"ادھوری عورت" کے عنوان سے عصمت نے اپنی پھوپھی اور ان کی بیٹیوں کے حالات بیان کیے ہیں۔ جس میں مسرت نے اپنی مرضی سے شادی کی تو ان کی پھوپھی نے گھر سے باہر نکال دیا۔ عصمت کی والدہ نے ان دونوں کا ولیمہ کروایا۔ مسرت بیمار رہنے لگی تو اس کے شوہر نے بے وفائی کرتے ہوئے اپنی سالی حشمت سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ جب اس کی بیوی نے دیکھا تو وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگی۔ اور مرنے سے پہلے ماں سے وعدہ لیا کہ اس کے شوہر کی شادی حشمت سے نہ کریں۔ اس کے مرنے کے بعد انہوں نے حشمت کی شادی اپنی نند کے بیٹے سے کر دی جو عورتوں کی دلالی کرتا تھا حشمت کے دل میں اس کی دہشت بیٹھ گئی اور وہ اپنی کلائی کاٹنے پر مجبور ہو گی۔ ایک اور جگہ وہ کم عمری کی شادی کے بارے میں لکھتی ہیں ان کے نانا نے اپنی پانچ سالہ پوتی کی شادی نواب کے دو سالہ بیٹے سے طے کر دی کہ جائیداد خاندان سے باہر نہ جائے۔ رقیہ آپا لڑکی کو لے کر میکے چلی آئی اور کوشش کرنے لگی کہ طلاق ہو جائے تاکہ چھوٹی بی کے باپ کی جائیداد کا وہ حصہ لے سکے۔

پدرسری نظام کے تحت بائبل کا ترجمہ اور تشریح منمانی مرضی سے کی گئی۔ جس پر بحث کرتے ہوئے عصمت چغتائی عورت پر لگائے گئے الزام اور ثانوی حیثیت کو ذاتی حملے کے مترادف قرار دیتی ہیں۔ جس پر وہ غم وغصے کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ اس ترجمے میں اور عورت کے استحصال محکومیت کو مندرجہ ذیل نکات کے ذریعے بیان کیا گیا:

۱۔ عورت آدم کی دل جوئی کے لیے پیدا کی گئی ہے جو مرد کا کھلونا ہے۔

۲۔ قابیل کے ہاتھوں ہونے والے قتل کی ذمہ دار عورت ہے۔

۳۔ عورت فساد کی جڑ ہے۔ وغیرہ

لیلے احمد نے بھی عیسائی مذہب میں عورت کی محکومی کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا:

"سیاسی طور پر غالب عیسائیت اپنے ہمراہ نہ صرف مضمر حقیقی مساوات پسندی بلکہ یہودیت کے پدری خیالات بھی لائی' اور ان کے ساتھ عورتوں کی سماجی محکومی کا مذہبی پروانہ اور ان کی لازمی ثانویت کی توثیق بھی۔"(۸۱)

انگریزوں نے عورتوں کے بارے میں قانون سازی کی تو ہر فرقے کے رہنماؤں سے رائے لی ہمارے عالموں نے عورت کو خلع کا حق دینے کا ذکر نہیں کیا جبکہ اسلام میں خلع جائز ہے۔ ایک دن عصمت چغتائی کے نام ایک خط آیا بڑے بھائی نے وہ خط شوکت آپا کو دے دیا۔ شوکت آپا نے بلا کر کڑوی کسیلی باتیں سنائیں کہ یہ لڑکے گھیرتی ہے اور اس پر خون سوار ہے۔ وہ غصے میں مارنا چاہتی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ غصہ ضبط کر گئی ستی کی رسم کے بارے میں عصمت چغتائی لکھتی ہیں کہ ایک دن وہ کالج سے گھر آ رہی تھی تو ٹرین کے مرگھٹ کے پاس ایک پھاٹک دیکھا، جس پر لال رنگ کے ہاتھوں کے نشان تھے چیتا پر چڑھنے سے پہلے پتی کی لاش پر چلنے والی عورتیں سرخ رنگ میں ہاتھ ڈبو کر پھاٹک پر چھاپ دیتی تھیں۔ وہ لکھتی ہیں:

"کتنے ہاتھ تھے؟ بعض تو اتنے ننھے ننھے تھے کہ دودھ پیتی بچیوں کے ہوں جو اپنے شوہروں کی چیتا پر بھسم ہو گئیں۔ وہ ہاتھ اب بھی یاد آتے ہیں تو دماغ کی رگوں کو کھرچنے لگتے ہیں۔"(۸۲)

ریاست میں رنڈیوں کا کوئی مخصوص کوچہ نہ تھا۔ عموماً جب وہ جوان ہو جاتیں تو کسی عہدے دار یا جاگیر دار سے تعلق قائم ہو جاتا ان کے عہدے کی وجہ سے کسی کو انگشت نمائی کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ یہ اصول برسوں سے چلا تا آ رہا تھا۔ ستی کی رسم ختم ہونے کے بعد بھی بیوہ کی شادی کا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا۔ عصمت چغتائی کی

بچپن کی دوست منگو کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ جب اس کی پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو ساس بیٹی جننے کے جرم میں اسے خود بھی مارتی تھی اور اس کے میاں سے بھی پٹواتی تھی۔ اس کے چہرے کی رونق ختم ہو چکی تھی۔ باپ کے آگرہ تبادلہ ہونے کی وجہ عصمت چغتائی کو وہاں کی عورت کی بے بسی کھل کر سامنے آئی۔ آس پاس کی تمام عورتیں اپنے شوہروں اور نندوں کی ستائی ہوئی تھیں۔ وہ ان کو خوش کرنے کے لیے دن رات خدمت کرتیں اس سے بھی کام نہ چلتا تو تعویذ دھاگے کرواتی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر عصمت کو اپنے عورت ہونے پر گھن آتی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کرے گی۔ وہ لکھتی ہیں:

> "عورت کمزور ہو سکتی ہے ناقص عقل ہونا ضروری نہیں۔ میرے دل سے احساس کمتری نکل گیا۔ لڑکا ہونا ضروری نہیں، لڑکوں جیسی سمجھ بوجھ چاہیے۔ پھر تو میں نت سینا پھرونا اور سگھڑاپا طاق پر اور پڑھنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔"(۸۳)

جب عصمت چغتائی کے افسانہ "لحاف" پر مقدمہ بنا تو ان کو سماجی طور پر دبانے کی کوشش کی گئی جس سے ان کی ازدواجی زندگی میں مشکلات آئیں۔ بات طلاق تک پہنچ گئی تھی۔ وہ لکھتی ہیں: "جب میں نے لحاف لکھا تو بم پھٹ پڑا۔ ادبی اکھاڑے میں میرے پرزے اڑے کچھ لوگوں نے میری حمایت میں بھی قلم اٹھایا۔"(۸۴) عصمت چغتائی پڑھائی کرنے کے بعد اسکول انسپکٹر کی ملازمت ملی تو اس دوران اس نے مشاہدہ کیا کہ ملازمت پیشہ عورت کتنی مجبور ہے۔ کسی کو شوہر خرچہ نہیں دیتا۔ تو کسی کا شوہر نشہ کرتا ہے۔ کسی کے میاں کو نوکری نہیں ملتی تو کوئی بیوی کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اپنے حالات سے تنگ آ کر کچھ عورتیں بے ایمانی اور چوری بھی کرتی ہیں۔ ایک دفعہ وہ معائنہ کرنے ایک سکول میں گئی تو ان کو پتا چلا کہ ایک عورت جس کو بچہ پیدا ہوا ہے اس نے حاضری غلط لگا دی محض اس لیے کہ اگر وہ بچے کی پیدائش کی چھٹیاں لے لیتی تو اسے ڈیڑھ ماہ کی سالانہ چھٹیاں نہ ملتیں۔ عصمت نے اسے کہا جاؤ گھر جا کر آرام کرو میں لکھ دوں گی کہ تم ڈیوٹی پر حاضر تھی اور تمہارا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ وہاں سے واُپس آ کر عصمت نے استعفی دے دیا، وہ لکھتی ہیں: "میں عورتوں پر مظالم نہیں دیکھ سکتی۔"(۸۵)

ادا جعفری نے گھٹن زدہ اور روایت پرست ماحول میں آنکھ کھولی جہاں پر عورتوں کے گھر سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ کبھی کبھی مزاروں اور عرسوں پر مردوں سے چوری چھپے ملازموں کے ساتھ جاتی تھیں یہ مزار ہی ان کے لیے تفریح کا سماں تھے جہاں پر وہ کھلے آسمان تلے سانس لے سکتی تھیں۔ اس جگہ لڑکیوں اور عورتوں کے لیے بہت خطرات تھے کہا جا رہا تھا کہ یہاں پر بد قسمت خواتین جنات کے زیر اثر ہیں۔ ادا جعفری کی نانی کے شوہر نے دو شادیاں کیں مگر دونوں گھٹن زدہ ماحول کی وجہ سے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کو شوہر کے گھر ایک اجنبی کی طرح رہنا

راس نہیں آیا۔ ان کے گھر نوکرانی رحمتی کا شوہر بہت لالچی تھا۔ پیسے ختم ہونے پر وہ بیوی کو مار مار کر نکال دیتا۔ کبھی آنکھ کے اوپر نیل ہوتا تو کبھی منہ سوجا ہوتا۔ دو تین مہینے اپنے گھر کی کوئی خبر نہیں لیتی پیسے جمع ہونے کے بعد واپس چلی جاتی۔ غیر شادی شدہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی البتہ وراثت میں ان کا حق تھا۔ خالہ کی شادی نہیں ہوئی تھی بال سفید ہو گئے تھے اس کے باوجود ان کا شمار لڑکیوں میں کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے تفریح کا سامان صرف شادی بیاہ کی تقریبات تھیں جن کے قصے سنا سنا کر وہ دوسری لڑکیوں کو احساس کمتری کا شکار کرتی تھیں۔ یہ حال صرف ٹونک والے پھاٹک کا ہی نہیں بلکہ برصغیر کے ہر گھرانے کی خواتین کا تھا۔ جو خاندان خود کو جتنا معتبر سمجھتا تھا اتنی ہی زیادہ پابندیاں لگاتا تھا زر، زمین اور زن تینوں کی حقیقت ایک ہی تھی۔ روایت شکن قسم کے مرد خود اپنے لیے فیصلے نہیں کرتے تھے جو عورتوں کے سانس لینے کے آداب بھی مقرر کرتے تھے۔ نثار عزیز بٹ میں کشش کی بڑی وجہ ان کا شگفتہ مزاج ہے جبکہ وہ طویل اور تھکا دینے والی بیماری سے ابھی ابھی صحت یاب ہوئی تھی۔ جسمانی طور پر تو وہ قطعی صحت مند نہیں تھی۔ اس نے اسپتال کے قیام کے دوران ایک ناول لکھا تھا۔ ادا جعفری کے خیال میں تخلیقی ادب نے عورتوں سے زیادہ ہی خراج طلب کیا ہے جیسے ورجینیا وولف، سلویا پلاتھ اور سارہ شگفتہ۔ صدیوں کے زمانے میں لاتعداد بے نام خواتین کہیں نہ کہیں موجود ہیں جو غبار وقت میں اپنی پہچان تلاش کرتی ہی رہ گئیں۔ کہیں پر انہوں نے اپنے ناموں کو حروف تہجی کی شکل میں چھپانا چاہا جن میں ز۔ خ۔ ش جو اپنے دور کی قابل قدر شاعرہ تھی ان کی غزلوں کا مرتب شدہ دیوان شائع نہیں ہونے دیا گیا۔ ان ہی دکھوں کی مالا کو اپنے وجود میں محسوس کرتی ہیں جس میں اپنی ذات کہیں دور پائی جاتی ہے جس کی تلاش ایک عام عورت کے اختیار میں نہیں ہے: ''اپنے آپ سے متعارف ہونا مجھ جیسی ایک محدود علاقے میں عمر بسر کرنے والی کے اختیار میں کہاں۔''(۸۶) ادا جعفری کی شادی کے بعد زندگی نے رخ بدلا اور ان کی آپ بیتی ایک سفر نامے کی شکل اختیار کرتی ہے جس میں ادا جعفری ثقافتی معاشرت کا گہرا مطالعہ بیان کرتی ہیں۔ طاقت کا مظاہرہ انسانی برتری کی علامت ہے جس سے طبقاتی کشمکش امیر، غریب، ظلم اور مظلوم کے رشتے تخلیق پاتے ہیں ایسے ہی ایک طبقہ استحصالی رویوں کا شکار ہوتا ہے۔ وہ ہزار سال پرانی کلوزیم کی تاریخ کو بیان ہیں جب وہاں پر حکمران اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے اور تفریح طبع کے لیے نہتے قیدیوں اور بھوکے شیروں کی لڑائی کا اہتمام کرواتے تھے اور اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

ادا جعفری انگلینڈ کی دو شاعرات کا ذکر کرتی ہے جن سے سماج نے جینے کا حق چھین لیا۔ جن میں پہلی ایملی ڈکنسن اور دوسری سلویا پاتھ ہے۔ ایک کی رہائی کے لیے موت کو اس کے پاس آنا پڑا دوسری خود چل کر موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ ایملی کی ماں نے اپنی بیماری سے ڈرتے ہوئے اس کو خالہ کے پاس بھیج دیا۔ خالہ نے اس کو بڑی توجہ

دی جب یہ واپس آئی تو بیمار والدہ توجہ نہ دے سکی جس سے ایملی احساس محرومی کا شکار ہو کر بیمار ہو گئی۔ بیماری کی وجہ سے اپنی تعلیم وقفے وقفے سے جاری رکھی۔یوں دوستوں سے بھی بچھڑ گئی۔ماں کے انتقال کے بعد باپ نے دوسری شادی کر لی۔وہ ایک بڑی عمر کے شادی شدہ مرد سے محبت کرنے لگی جو خود بھی اس کی محبت سے آگاہ نہیں تھا۔ایملی نے اس کی وجہ سے شادی کا فیصلہ نہ کیا اور وہ اپنی شاعری میں اس تخلیقی محبوب کو تلاش کرتی رہی۔ایملی ڈکنسن کے دور میں امریکہ میں غیر شادی شدہ عورتوں کو چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ایملی ڈکنسن نے سب سے ملنا چھوڑ دیا۔اس تنہائی نے اس کو الگ دنیا میں رہنے پر مجبور کر دیا۔الفاظ اس کے غم گسار اور ہمراز تھے۔یہی غم اس کی موت کا باعث بنا۔موت کے بعد ایملی کی الماری سے دو ہزار سے زیادہ نظمیں ملیں۔ادا جعفری کو ایملی کی شکل میں ایک مشرقی اور باحیا لڑکی کا روپ نظر آیا جو اپنے جذبات کا اظہار کسی سے نہیں کرتی۔وہ لکھتی ہیں:”سو برس پہلے کی امریکی خاتون مجھے پرانے وقتوں کی کوئی مشرقی لڑکی نظر آئی شرمیلی شرمیلی 'گھبرائی گھبرائی' بے یقین بے نوا۔“(۸۷)

سلویا پاتھ بوسٹن سے تعلق رکھتی تھی اس کا باپ ایک بارعب پروفیسر تھا جس سے اس کی ماں ڈرتی تھی وہ اس لیے اپنے شوہر کی فرماں بردار تھی۔ سلویا پاتھ کو اپنی ماں سے محبت اور نفرت دونوں قسم کے جذبات محسوس ہوتے تھے۔نو سال کی عمر میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔شوہر کی وفات کے بعد سلویا پاتھ کی ماں ملازمت کر کے بچوں کو پالتی تھی۔اس نے ویلز میں ایک سستا گھر لے لیا۔سلویا پاتھ کے سارے پرانے دوست چھوٹ گئے۔باپ کی موت نے بچپن چھین لیا تو دوستوں کی دوری نے سکون۔اس نے اس غم سے نجات پانے کے لیے شاعری کا سہارا لیا اور اپنی تمام مایوسیوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے وابستہ کر لیا۔یہ وہ لڑکی تھی جس نے اپنی تمام امیدوں کا مدعا اپنی شاعری کو قرار دیا۔ایک خط میں وہ لکھتی ہیں:”ایک لڑکی جو خدا بننا چاہتی تھی۔اسی وجہ سے اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوئی۔“(۸۸)اس نے شہرت حاصل کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی قوتوں کو داؤ پر لگایا۔اکیس سال کی عمر میں خودکشی کی مگر بچ گئی۔اس بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد وہ جنسی تجربات سے آشنا ہونا چاہتی تھی۔اس کی سب دوستوں کی شادیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن اسے ابھی تک کوئی پیش کش نہ آئی۔ہر مرد اس کی ذہانت اور بے باکی سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتا۔اس دوران وہ اسکالر شپ پر کیمبرج یونی ورسٹی چلی گئی۔وہاں اس کی شادی ایڈورڈ ہیوٹیڈ سے ہو گئی وہ بھی شاعر تھا۔اس کے ساتھ اس نے مثالی بیوی کا کردار ادا کیا۔سارے گھر کی ذمہ داریاں خود اٹھائیں۔اس کے شوہر نے بھی اس کی مدد کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی وہ کوئی ملازمت کرتا تھا۔وہ دو بچوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ شوہر کے مسودات بھی ٹائپ کر کے دیتی تھی۔ تھکن سے چور ہو کر وہ بیمار رہنے لگی۔شوہر کی بے وفائی کا علم ہونے کے بعد اس کی قوت برداشت ختم ہو گئی۔اس نے تنگ آ کر طلاق کا مطالبہ کر دیا۔وہ دو چھوٹے

بچوں کے ساتھ اکیلی رہنے لگی۔ شکست کے گھاؤ نے زندگی کو نچوڑ کر ختم کر دیا۔ ادا جعفری کے مطابق عورت کا دکھ مشرق اور مغرب کے خانوں میں بٹا ہوا نہیں ہے بلکہ وہ ہر جگہ مجبور اور لاچار ہے۔ وہ اپنے ملک کی لاچار عورت کے بارے میں لکھتی ہے کہ: ”میرے دیس میں تو مدتوں 'پہلی سانس لینے سے قبل بھی عورت زندگی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوتی رہتی ہے۔“(۸۹)

قیام پاکستان کے وقت بھی سب سے زیادہ استحصال کا شکار عورت ہوئی۔ ان کی عزتوں کو ان کے والدین کے سامنے تار تار کیا گیا۔ زندہ لوٹ کر آنے والی خواتین کو گھر والوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ ادا جعفری اپنی ایک دوست رابعہ کی داستان قلم بند کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ان کی دوست رابعہ کی یونی ورسٹی فسادات کی وجہ سے بند ہو گئی تو تمام لڑکیاں اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے پڑوسیوں کے گھر میں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ ایک دن وہ آٹھ دس لڑکیاں ایک عمر رسیدہ عورت کے ساتھ گھر واپس جارہی تھیں کہ گلی میں ایک ہجوم نے انھیں گھیر لیا پھر روتی چلاتی لڑکیوں کو خنجر کی نوک پر تقسیم کیا جانے لگا۔ چادروں کی دھجیاں پاؤں تلے روندی جارہی تھیں۔ اچانک ایک آواز اس کو سنائی دی جو جانی پہچانی تھی۔ ان لڑکوں میں ایک اس کا ہم جماعت تھا اس نے اپنی ہم جماعت کو پہچان لیا اور اپنے دوستوں کو موقع پرست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کہا یہ لڑکی میری یونی ورسٹی کی ہے اسے میرے حوالے کر دو۔ آج ہی تو موقع ملا ہے۔ وہ سکھ لڑکا اسے اپنے دوست کے گھر لے گیا۔ اس نے اپنے دوست سے بات کی اور لڑکی کو کمرے میں لے گیا اور لڑکی کو کہا وہ ڈرے نہیں وہ محفوظ ہے خود دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ رابعہ کی حفاظت کے لیے اس لڑکے کی موجودگی اس کمرے میں ضروری تھی ورنہ اس کا دوست بگڑ جاتا۔ اور باہر کی فضا غیر محفوظ تھی۔ وہ لڑکا مال غنیمت میں لائی ہوئی رابعہ کی حفاظت کر رہا تھا۔ صبح وہ لڑکا رابعہ کو گھر پہنچانے کا کہہ رہا تھا تو اس نے سوچا ایک رات گھر سے باہر گزار کر وہ زمانے کی چبھتی ہوئی نظروں کا کیسے مقابلہ کرے گی۔ رابعہ اس لڑکے کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا کہ وہ پھر اسے اپنے گھر لے جائے وہ اسے اپنوں کی نگاہوں میں بے آبرو ہونے سے بچالو۔ ڈاکٹر شاداب سید ادا جعفری کے بارے میں لکھتے ہیں: ”وہ باقاعدہ طور پر تانیثی تحریک سے وابستہ نہ تھیں مگر عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم و استحصال پر ان کا دل کڑھتا تھا۔ جس نے انہیں ہمیشہ بے چین رکھا۔“(۹۰)

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کے دور میں لڑکیوں کے ناول پڑھنے پر پابندی تھی والدین نے اپنی ترجیحات مقرر کر رکھی تھیں کہ کون سا رسالہ اور کون سی کتاب پڑھنے کو دی جائے۔ کبھی کبھی صفیہ مجاز کی بہن چوری چھپے ”نگار“ رسالہ یا ناول لے آتی ایک دن میں پڑھ کر واپس کر دیتی۔ رسالہ "نگار" میں ہی "زبان بے زبانی" افسانہ تھا جو اختر حسین رائے پوری کا تھا یہ افسانہ ہی مصنفہ کی اختر حسین رائے پوری کی اختر سے ملاقات، مراسم

بڑھانے اور شادی کا باعث بنا۔ حمیدہ اختر حسین کی شادی مولوی عبدالحق کے کہنے پر ہوئی۔ شادی والے دن مولوی عبدالحق سب سے آگے تھے اور سب باراتیوں کے ساتھ مل کر یہ گیت گا رہے تھے:

لائق دولہا لایوں ہیں

ان پڑھ لڑکی لے لیں گے

بھئی لے لیں گے۔ بھئی لے لیں گے (۹۱)

بینڈ والوں بھی اسی گیت کی دھن بجانے لگے۔ لڑکی کے گھر والوں اور بزرگوں کی گردنیں جھک گئیں۔ اس گیت میں انہوں نے صنفی تفریق کی بناء پر دولہے کو لائق اور دلہن کو ان پڑھ جاہل کا لقب دیا۔ جب کہ ان کے تمام بہن بھائی اعلی تعلیم یافتہ تھے اس گیت کو کسی بھی شخصیت پر نفسیاتی حملہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی بناء پر فرد اپنی شکست تسلیم کرتا ہے۔ اس وجہ سے ساری زندگی وہ شوہر کو برتر اور خود کو کم تر تصور کرتی رہی۔ اس نے اپنی خود ساختہ جہالت کو ذہن پر سوار کرر کھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ شوہر کی ہر بات مانتی اور اس کے رعب میں رہتی۔ ان کی اطاعت شعاری کو مجبوری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے ظاہر اور باطن کے تضاد کو محسوس کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "میری فطرت یوں بدلی اختر کے سامنے کچھ اور پیٹھ پیچھے اصل اپنی فطرت پر۔"(۹۲)

مولوی عبدالحق کے ساتھ مصنفہ کھیلتی تھی۔ جب مولوی عبدالحق جیت جاتے تو تالیاں بجانے لگتے اور اگر ہارنے پر مصنفہ نہ روتی تو مولوی عبدالحق کہتے کہ ": کہاوت ہے کہ عورت بڑی ڈھیٹ ہوتی ہے۔"(۹۳) یوں مولوی عبدالحق شعوری اور لاشعوری طور پر حمیدہ اختر حسین رائے پوری کو اپنے کم عقل اور ان پڑھ اور ڈھیٹ ہونے کا برابر احساس دلاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ اختر حسین اور مولوی عبدالحق کی مصروفیات کی وجہ سے حمیدہ اختر حسین رائے پوری کو اپنے جاننے والے منیر صاحب کے گھر چھوڑ آئے۔ منیر صاحب حمیدہ اختر حسین رائے پوری کو اپنی پھوپھی جان سے ملوانے لے گئے۔ ان کے گھر ایک حبشی لونڈی تھی اس کے بچے کو ان کی پھوپھی جان نے گود لے لیا تھا جو خود تو لاولد اور طلاق یافتہ تھی۔ اس حبشی بچے کو اس کی پھوپھی جان کھڑی زبردستی دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھیں وہ بچہ بے تحاشہ رو رہا تھا۔ اس کی حبشی ماں کے سر پر استرا پھیرا ہوا تھا۔ ان کی پھوپھو پاشی نے منڈی پیٹ میں ڈالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ وہ زبردستی بچے کو پیٹ کے اوپر ٹھونسنے لگی۔ تو اس نے بچے کے ہاتھوں سے چھین کر گز بھر دور قالین کے اوپر اچھال دیا۔ پاشی کا غصہ عروج کو پہنچ گیا پاشی نے لاتوں اور مکوں سے اس کو مارنا شروع کیا۔ پھر ہنٹر نما چیز سے بے دردی سے مارنے لگیں۔ اس کی چیخیں زمین آسمان کو ہلا رہی تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر مصنفہ ہچکیوں سے رونے لگی کہ وہ لاچار اور مجبور لڑکی کو اکثر اس طرح پٹیا کرتی ہوں گی۔ منیر بانو اور آمنہ

ممتاز نے مل کر لڑکیوں کے لیے اسکول بنایا۔ ایک تاریک علاقے کو روشن کرنے کے لیے اپنی جوانی اس کی بھینٹ چڑھا دی۔ عذرا بٹ اور زہرہ سہگل نے اداکاری میں اپنا نام روشن کیا۔ ہاجرہ احمد نے اپنی زندگی کمیونزم کے نام کر دی۔ ممتاز چچا کی سب بیٹیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خالدہ ادیب خانم کی شادی ایک بڑی عمر کے رئیس خاندان میں ہوئی۔ ترکی میں بھی ہندوستان کی طرح ہر لڑکی کو والدین کے فیصلے کے آگے سر خم کرنا پڑتا تھا۔ خالدہ ادیب خانم نے بھی یہی سب کچھ کیا۔ دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کی طرح کا فرق تھا۔

سعیدہ بانو احمد کی معاشرت میں مردوں اور عورتوں کی دنیا الگ الگ تھی مردوں کے لیے الگ مکان ہوتے تھے جن میں لڑکے اور رشتے دار رہتے تھے۔ عورتیں اور مرد صرف چند گھنٹوں کے لیے اکٹھے رہتے تھے۔ گھریلو فضا میں کھچاؤ پیدا ہونے کا امکان کم تھا۔ بدلتی معاشرتی اقدار میں بھی عورتیں زیادہ تر تماش بین ہی رہی ہیں۔ مردوں کے بنائے ہوئے معاشرے کو سعیدہ بانو احمد بار بار تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔ جہاں پر پدر سری نظام نے عورت کو ہر طرف سے کچل کر رکھ دیا ہے۔ معاشرے کے بنائے گئے رسم ورواج میں بڑی چال سے استحصال کا شکار کیا گیا ہے۔ مثلاً عورت کا پڑھنا لکھنا اس لیے معیوب سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے محبوب کو محبت بھرے خط نہ لکھ سکیں۔ گھر کی چار دیواری میں بند رہے۔ چوبیس گھنٹے عورتوں کو فضول کاموں میں مصروف رکھا جاتا تاکہ وہ دو گھڑی آرام بھی نہ کر سکے: مہمانوں کی خاطر مدارت کے علاوہ کام دار بھاری کڑھائیوں والے سوٹ، لذیذ کھانوں کے پکوان موتی پلاؤ، بریانی، قورمہ وغیرہ۔ عورتیں گھر کے کاموں میں مصروف رہیں اور مرد باہر رنگ رلیاں کریں۔ اسی حالت میں عورت خوش بھی رہتی ہے تو کبھی اپنے نصیبوں کو روتی بھی ہے یوں عورت مکمل طور پر مرد کی دسترس میں رہتی ہے اور سر اٹھا کر باہر بھی نہیں دیکھ سکتی، اور تو اور جاہل عورتیں مردوں کی ایک دھمکی سے سہم جاتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ: "کھو کھلی باتوں پر معاشرت کی ایسی بنیاد رکھی گئی ہے کہ عورتیں دم نہیں مار سکتی تھیں۔"(۹۴)

ایک دفعہ سعیدہ بانو احمد کو سرخ رنگ کی ساڑھی پہنے کا بہت شوق ہوا۔ انہوں نے اپنی امی سے فرمائش کر کے ایک سرخ رنگ کی ساڑھی لی۔ اس دور میں کنواری لڑکیوں کا سرخ رنگ کے کپڑے، ناک کی کیل اور پاؤں پر مہندی لگانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جب وہ ساڑھی پہن کر ہوٹل میں گئی جہاں پر ان کی بڑی بہن بھی آئی ہوئی تھی۔ اس نے سعیدہ بانو کو سرخ ساڑھی میں دیکھ کر ڈانٹنا شروع کر دیا وہ کہنے لگی: "بڑی بے شرم ہو۔ لال ساڑھی پہن کر آئی ہو۔"(۹۵)

جب مصنفہ کی نسبت طے ہوئی تو انہوں نے اپنے والد صاحب کو چار صفحوں کا خط لکھا جس کی رسید نہ ملی اس خط میں انہوں نے لکھا کہ: "وہ آگے بڑھنا چاہتی ہیں، پیانو سیکھنا چاہتی ہیں اور شادی کے لیے بالکل تیار نہیں مگر اس

خط کے کوئی اثرات نہ ہوئے یہ بھی یقین سے نہیں لکھا کہ خط ان کو وصول بھی ہوا تھا یا نہیں۔ان کی شادی ابن رضا سے ہوئی۔ابن رضا کے بھائی صبح ہوتے ہی اپنی معشوقہ کے گھر چلے جاتے اور سارا دن وہاں گزرتے ان کی تمام معشوقائیں ان کے دوستوں کی بیویاں اور سرکاری عہدوں پر مشتمل ہم عصروں کی شریک حیات ہوتی تھیں۔یہ عشق تین چار سال چل کر اختتام پذیر ہوتا۔معشوقہ کے دوپٹوں کو عطر بھی لگایا جاتا بیوی ان تمام حالات سے واقف ہو کر بھی زبان سے یہ جملہ کہتی:"جو ہمرے میاں کا اچھا لگت ہے او ہم کا اچھا لگت ہے۔"(۹۶) شاید وہ میاں کا اظہار تشکر ادا کر رہی تھی جو اس نے اپنے گھر میں معشوقہ کے ساتھ جگہ دے رکھی تھی۔۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہر ٹرین کو لوٹا جارہا تھا ملک کے چاروں طرف خوف و حراس پھیلا ہوا تھا۔شفیع احمد قدوائی اپنی ڈیوٹی پر جمے رہے ان کو بارہا مطلع کیا گیا کہ ان کی جان کو خطرہ ہے مگر وہ ڈٹے رہے وہاں پر ہی شہید ہوئے ان کی بیوی انیس قدوائی نے اپنے شوہر کو سپرد خاک کیا۔پہلے یہ عام رواج تھا کہ لڑکے لڑکیوں کی نسبتیں ان کے خالہ زاد، پھوپھی زاد، چچازاد سے طے کر دی جاتی تھیں جن کی بڑے ہو کر شادی رچائی جاتی تھی ایسی نسبتوں کا توڑنا بہت معیوب اور خاندان کی ناک کٹوانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔اپنی منگیتر کو کسی اور کے نام سے منسوب ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔یہ وہ ہی کزن ہوتے تھے جن کو بچپن میں بھائی اور جوانی میں جانو کہا جاتا ہے۔تایا/ چچا کے بچوں سے شادیوں کی صورت میں زیادہ تروراثتی بیماریاں اولاد میں منتقل ہو کر خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہیں۔اکثر بچے جسمانی اور ذہنی کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ابن رضا اپنی بوجھل طبیعت کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے گئے تو گھر والوں کی نظر میں مجرم بہو قرار پائی۔بیگم رضا مختلف سوال کرتیں اور روتی جاتیں دونوں بھائیوں، جٹھانیوں اور دوسرے رشتے داروں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی ان کی بہن نے بڑے غصے سے پوچھا بتاتی کیوں نہیں ہو کیا ہوا؟ مصنفہ کی خاموشی نے ان کے غصے کو مزید بھڑکا دیا۔بھابھی کے انتقال کے بعد ان کے تینوں بچوں کی خود کفالت کی۔

مرد ہمیشہ عورت کو ایک عاجز دیوی کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے۔جو بے بس ہو کر صرف تماشا دیکھے۔اس معاشرت کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہے کہ عورت مرد کی محکوم اور مجبور ہو کر رہے عطیہ داؤد نے اپنی آپ بیتی "آئینے کے سامنے" میں نہ صرف اپنی بلکہ اپنے اردگرد کی خواتین کی استحصالی اور محکومی کی روداد بیان کی ہے۔ان کی چچازاد بہن کی جو عطیہ داؤد سے چھوٹی تھی اس کی شادی ان کے والد سے ہوئی۔چھوٹی عمر میں لڑکیوں کی نسبت طے کر دی جاتی۔جن لڑکیوں کی نسبت طے ہو جاتی بچے کھیلوں کے دوران ان کے منگیتروں کا نام لے کر چھیڑتے تھے اور اس حد تک تنگ کرتے کہ وہ رونا شروع کر دیتی۔عطیہ داؤد کی دوست کی کزن فیملی پلاننگ کے

کلینک میں کام کرتی تھی ایک دن فلم دیکھنے کے لیے اس کو لینے گئی تو کسی رشتے دار نے عطیہ داؤد کو وہاں دیکھ لیا اس نے گھر آ کر بتایا ان کی بڑی بہن ثمینہ نے کہا عطیہ تم اپنے نیک باپ کی پگڑی کیوں مٹی میں روند رہی ہو؟

عطیہ داؤد کے گاؤں میں ادلے بدلے کی شادی، بچپن کی منگنی، لڑکی یا لڑکے کے بالغ ہونے سے پہلے ہی شادی کر دی جاتی تھی۔ بے جوڑ شادیاں بھی عام تھیں۔ لڑکی کی شادی قدرتی طور پر بالغ ہونے کی بجائے قد اور جسامت دیکھ کر کر دی جاتی تھی۔ خود عطیہ داؤد کی والدہ اپنے شوہر سے بہت چھوٹی تھی۔ محمد داؤد جہاں جاتے بیوی کو ساتھ لے جاتے۔ ایک دفعہ کسی کام کے سلسلے میں ٹرین کا سفر کرنا پڑا۔ ان کی والدہ عورتوں کے ڈبے میں تھی۔ ٹرین ایک جگہ رکی۔ ان کے والد نے اپنی بیوی کو اشارے سے بلایا۔ ان کو پتا نہ چلا۔ ایک خاتون نے ان کو کہا: "اے لڑکی کیا سن نہیں رہی ہو؟ کب سے تمہارے دادا تم کو بلائے جا رہے ہیں۔ ارباب شرم سے پانی پانی ہو گئی۔"[۹۷]

عطیہ داؤد کی ہمسائی ادی چھٹن کا باپ ایک غریب آدمی تھا۔ تیز بارشوں کی وجہ سے ان کا کچا گھر بہہ گیا۔ اس کے باپ نے غریبی سے تنگ آ کر اپنی آٹھ سالہ بچی کا نکاح ایک جواری اور شرابی لڑکے سے کر دیا۔ باپ نے بیٹی کو سات سو روپے میں بیچ دیا۔ پہلے ہی دن لڑکی نے بچکانہ حرکتوں کی وجہ سے شوہر سے مار کھائی لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کو اپنے میکے کی یاد آ رہی ہے۔ ان کی ادی چھٹن اپنے بچپنے کی وجہ سے محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ جب ان کا شوہر اپنی بیوی کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ لیتا تو خوب مارتا۔ عطیہ داؤد لکھتی ہیں کہ: "چاچا بخشو اچانک ہی آ دھمکتا ،اور پھر ادی چھٹن کو کھیل میں مگن پا کر انہیں بالوں سے گھسیٹ کر کمرے میں لے جاتا اور ڈنڈے سے پٹائی کرتا۔"[۹۸] کم عمری میں ماں مر گئی باپ نے بڑی عمر کے لڑکے سے شادی کر دی، جوان ہوئی تو ایک جن اس پر عاشق ہو گیا۔ ادی چھٹن آٹھ نو بچوں کی ماں بنی۔ شوہر کی مار کھا کھا کر ٹی بی کی مریضہ بن گئی اور اسی مرض سے انتقال کر گئی۔

ایک چند ماہ کی دودھ پیتی بچی فہمیدہ کے والد نے اس کی نسبت طے کر کے اپنا سہرا سجا لیا۔ فہمیدہ کا سارا بچپن منگیتر کا نام سن سن کر گزرا۔ ایسی بچی جس کو محبت، شادی اور منگنی کا پتا ہی نہ ہو۔ سوتیلی ماں کی قسمت بھی خراب تھی جس کا شوہر بے حد شکی مزاج تھا۔ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا۔ محمد اسماعیل کے دو بیٹے بھی سوتیلی ماں کی پٹائی کرتے تھے۔

عطیہ کو ناک کی کیل بہت پسند تھی جب اس نے کیل پہننے کی خواہش ظاہر کی تو گھر کی عورتوں نے کہا یہ شادی کے بعد پہن سکتی ہے۔ یہی کیل اس کی والدہ نے پہن رکھی تھی۔ چھ سال کی عمر میں جب اس کے والد وفات پا گئے تو زبردستی ان کی والدہ کے ناک سے اتار لی گئی۔ وہ اس وقت اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ :"میں سوچتی ہوں میں کبھی ایسی کوئی کیل ناک میں نہیں پہنوں گی جس پر میرا کوئی اختیار نہ ہو۔"[۹۹]

بڑوں کا احترام کرتے ہوئے ان کے گاؤں کے ایک آدمی اداقان زندگی کے فیصلے میں دو بار دھوکہ کھا گئے اور آخر کار جوانی میں ہی موت کو گلے لگا لیا۔ پہلے وہ جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے اس نے اپنے باپ کو وہاں رشتہ لینے بھیجا۔ باپ نے بیٹے کا رشتہ کرنے کی بجائے اپنی شادی طے کر لی۔ عطیہ داؤد لکھتی ہیں: ''کچھ ہی دنوں بعد ان کی پسند ان کی سوتیلی ماں کے روپ میں ان کے آنگن میں موجود تھی۔''(۱۰۰) اصل پول کھلنے پر اس کے باپ نے کہا تم لوگ بڑے ہو گئے ہو اپنا اپنا گھر بسا لو گئے۔ میں بوڑھا ہوں میرے بڑھاپے کا سہارا بھی ہونا چاہیے۔ اپنے وٹے میں جس بیٹی کا رشتہ طے کر کے آئے تھے وہ دیوار سے مٹی نکال کر کھا رہی تھی اور وہ لڑکا اس وقت کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

فتح خاتون ان کے گاؤں کی ایک عورت تھی جس کی دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹیوں سے نفرت والدین پر بوجھ ہونے کی وجہ سے بھی کی جاتی ہے یہ ہی حال فتح کی ساس کا تھا جو ان کے ساتھ برا سلوک بیٹیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے کرتی تھی۔ وہ سب کو روٹی کے اوپر مکھن رکھ کر لسی کے ساتھ دیتی تھی لیکن فتح اور ان کی بیٹیوں کو صرف لسی ہی ملتی تھی اگر مکھن مانگ لیتیں تو ان کو صرف جھڑکیاں ملتی تھیں۔ ایسے ماحول میں اکثر فتح بیگم اپنی بہن کے گھر جایا کرتی تھی۔ اس کے شوہر فاروق کو فتح بیگم کا وہاں جانا پسند نہ تھا۔ وہ اس کی بہن کے بوڑھے شوہر کی نیت پر شک کرتا تھا۔ فتح نے بہن کے گھر جانے کی ضد نہ چھوڑی تو اس کی سوت لانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ فتح سوت کی خدمت کرتی۔ پھر ایک دن فتح کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی، اور دونوں بیٹیوں کو ماں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ فتح کی مظلومیت کو بیان کرتے ہوئے عطیہ داؤد لکھتی ہیں: ''فتح خالہ ہمارے آنگن میں چارپائی پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے چہرے کو دوپٹے سے چھپا رکھا تھا جس کے نیچے سے ان کی دبی دبی سسکیاں کبھی کبھی سنائی دیتی تھیں۔''(۱۰۱)

پدرسری نظام کے تحت لڑکیوں کی نشوونما رکنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک جتن کیے جاتے ہیں تاکہ وہ جلد جوان نہ ہو جائے۔ ان کے گاؤں کی ایک اور عورت تھی جس کو نمک کی ڈلیاں کھانے کی عادت تھی۔ اس کی شادی وٹے سٹے میں طے کر دی گئی تھی۔ والدین وہاں شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دائی نے مشورہ دیا کہ اس کو نمک کھلاؤ تو اس کی نشوونما رک جائے گی اور یہ لڑکی دیر سے جوان ہو گی۔ وہ جوان تو وقت پر ہوئی اور شادی بھی وہاں پر ہی ہوئی البتہ اس کی شکل وصورت بگڑ گئی اس کے ہونٹوں پر گہرے زخم نظر آتے تھے۔ مصنفہ کی ایک اور دوست بہت صحت مند تھی۔ اس نے بڑی راز داری سے بتایا کہ آج کل ان کے گھر میں مصیبت آئی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اس کے گھر میں ایک دائی آتی تھی جو اس کو کمرے میں بند کر کے سینے کے ابھار کو تھپنی سے مسلتی تھی۔ ان کے ہاں پہلی

ماہ واری میں ہی لڑکیوں کی شادی کا رواج تھا۔ جب مصنفہ کو پہلی ماہ واری ہوئی تو ان کی بہن نے کہا: "قبر میں ابا کو آج سے لے کر تب تک فرشتوں کے جوتے پڑتے رہیں گے جب تک شادی نہیں ہوتی۔"(۱۰۲)

دوسری طرف ان کے ہاں رواج تھا کہ پانی کے گھڑے میں سب سے پہلے مرد ہی پانی پیتا ہے۔ ان کے خیال میں اگر گھڑے میں پہلے مرد پانی پئے گا تو پانی خوب ٹھنڈا ہو گا اور اگر لڑکی پئے گی تو گرم رہے گا۔ ملازمت کے دوران منیجر نے لڑکے اور لڑکیوں کے قد، وزن اور کمر کا ناپ لینا تھا۔ وہ سب کو الگ الگ اپنے کمرے میں بلاتا اور ٹریننگ کی باتیں بتاتا۔ فیتے سے قد اور کمر کا ناپ تھا۔ مصنفہ جب اس کے کمرے میں گئی تو اس نے کہا آئیے میں آپ کا ناپ لے کر سمجھاؤں۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے ناپ لینا شروع کیا سینے کا ناپ لیتے ہوئے ان کا ہاتھ تھوڑی دیر کے لیے رک گیا تو مصنفہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر ہٹا دیا اور کہا: "آپ بیٹھیں اور بیٹھ کر بات کریں وہ سہم کر بیٹھ گئے۔"(۱۰۳) انہوں نے معافی مانگی اور کہا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اس کے بعد وہ مصنفہ سے ڈرے ہی رہتے۔ ایک سکول میں ملازمت کے دوران اس کے پرنسپل نے ان کے لباس پر تنقید کی کہ وہ ماڈرن لباس اور چھوٹے دوپٹے لے کر نہ آئے۔ اس سے طالب علموں پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ مصنفہ نے ایک ماہ کی تنخواہ لینے سے انکار کر دیا اور فوری طور پر اسکول چھوڑ دیا۔ ایک فیکٹری کے ادھڑ عمر اسسٹنٹ منیجر نے عطیہ داؤد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی عطیہ داؤد نے پہلے مذاق سمجھا مگر اس کی عجیب نظروں کا رنگ دیکھ کر ان کو زور سے تھپڑ رسید کیا۔ اس کو ڈانٹنے کی آواز سن کر چپراسی اندر آ گیا اور حیرت سے مصنفہ کو دیکھتا رہا۔

ایک دن ساجدہ زیدی کی چھوٹی ممانی ان کے گھر آئی جو انتہائی خوب صورت اور حسین تھی۔ بدقسمتی سے وہ جوانی میں ہی بیوہ ہو چکی تھی۔ ساجدہ نے بیلے کے پھولوں کا ایک گجرہ بنا کر اس کو سجانے لگی تو ان کی تائی امی نے پکارنا شروع کر دیا: "یہ پھول نہیں پہن سکتیں، یہ تو بیوہ ہیں۔"(۱۰۴)

ساجدہ زیدی کی والدہ ابھی صرف چھتیس سال کی ہی تھی کہ ان کے شوہر داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی والدہ نے ہر قسم کا ہار سنگار کرنا چھوڑ دیا۔ ہر وقت سر پر سفید رنگ کا ڈوپٹہ رکھتی تھی۔ منجھلے چچا نے ان کی جائیداد پر ناجائز قبضہ کر لیا اور ان پر سختی کرنا شروع کر دی۔ ان کی والدہ نے قرآن واحادیث کی روشنی میں چچا کو راہ راستہ پر لانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ان حالات میں اپنی اور اپنے خاندان کی بے کسی کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "ایک طرف ہمارے چہروں پر یتیمی کی خاک سی اڑتی، دوسری طرف اماں کا بے پناہ غم اور چچاؤں کی بے حسی اور منافقت۔"(۱۰۵) ان کی والدہ نے مجبور ہو کر اپنا گھر چھوڑ دیا اور اپنے بھائی کے گھر میں پناہ لی۔ گھر کے حالات نے معصوم بچیوں پر بھی برے اثرات ڈالے۔ اسی دوران ساجدہ زیدی نے غموں سے نجات حاصل کرنے کے لیے

دستکاری کا سہارا لیا نت نئے اور خوب صورت ڈیزائن بنانے لگی۔ وہ لکھتی ہیں:"میں گل بوٹے بنانے میں اپنے غموں اور محرومیوں کو بھلاتی رہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یا ان سے نباہ کرتی تھی۔"(۱۰۶)

ساجدہ زیدی نے پانی پت میں حالی مسلم ہائی سکول میں داخلہ لیا، جہاں پر ان کے رشتے داروں کی تمام لڑکیوں نے تعلیم حاصل کی۔ اس دور میں لڑکیوں کو گھر سے باہر جاکر تعلیم حاصل کرنے کا رواج نہ تھا۔ ان کی والدہ نے ان کے لیے ایک خاتون کو رکھا جو ان کو ڈرکی میں بٹھا کر تین اور لڑکیوں کے ہمراہ سکول لے جاتی تھیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے جس اصلاح نسواں کی بنیاد رکھی تھی ان کے خاندان کے دوسرے افراد نے اس کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ آگے بھی بڑھایا جن میں صالحہ عابد حسین، صغرا مہندی اور ساجدہ زیدی کے نام مشہور ہیں۔ ان کی والدہ نے اپنی بیٹیوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج ترقی کرتے کرتے یونی ورسٹی بن گیا۔ صالحہ عابد حسین جیسی ادبی شخصیت نے ان کے شوق مطالعہ کو جلا بخشی۔ پانی پت میں ان کی زندگی سکول اور گھر کی چار دیواری کی حد تک مقید گئی۔ خاندان کی پہلی لڑکی چھادی نے اپنے بل بوتے پر نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ ایک مدرسی سکول میں ملازمت بھی کرتی رہیں۔ نو آبادیاتی حالات کے زیر اثر ایک ہندو منیش نرائن سکسینہ سے پسند کی شادی کی۔ ان کے شوہر ہندی بلٹز کے ایڈیٹر تھے۔ وہ اکثر اپنے روایتی اور مذہبی قوانین کے تحت دبانے کی کوشش کرتے اور وہ دب جاتیں۔ جب کہ ان کی ہوش مندی اور بے خوفی بھی کام نہ آتی اور وہ ہندو کلچر کے آگے بے بس ہو جاتی۔ اس کلچر میں عورت کی حیثیت اور بے بسی کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:"شاید ہندو کلچر کے پتی ورتا کے اثرات، شاید عورت کی ازلی بے بسی اور محکومیت کے اثرات۔۔۔۔۔۔"(۱۰۷)

اسی ثقافت کی پیروی کرتے ہوئے ساجدہ زیدی کی والدہ نے بچپن سے ہی بیٹیوں کا جہیز اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں لڑکیاں روایات کے خلاف نہیں بول سکتی تھیں۔ لڑکے آزاد اور بے فکر تھے جبکہ لڑکیاں روایات کی پابند تھیں۔ برقعے نہیں اترے تھے۔ روایات سے برگشتگی کا دور ختم نہیں ہوا تھا۔ آٹھویں جماعت میں ان کی والدہ نے مزید تعلیم کے لیے ساجدہ زیدی اور ان کی بڑی بہن کو پانی پت کے ہوسٹل میں بھیج دیا۔ دونوں لڑکیوں کے ہوسٹل کے اخراجات ایک بیوہ ماں کے لیے اٹھانا بہت مشکل تھا۔ اپنی جیب خرچ کے لیے انجمن وظیفہ سادات مومنین سے رجوع کیا۔ جنھوں نے چار یا پانچ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ جس کی پہلی شرط یہ تھی کہ صاحب حیثیت ہونے کی صورت میں رقم واپس کی جائے گی۔

ساجدہ زیدی کا نو عمری میں شادی کا پیغام آ گیا جبکہ ان کے خاندان میں کم عمری کی شادیوں کا رواج نہ تھا۔ رشتے داروں نے جذباتی طور پر بلیک میل کرنا شروع کیا کہ بیوہ ماں نے پانچ بیٹیوں کی شادیاں کرنی ہیں ان

لڑکیوں کو ماں کا بوجھ کم کرنا چاہیے۔ ان کا شوہر عمر میں تیرہ سال بڑا تھا۔ ایک روایتی شوہر کی طرح وہ اپنی سہاگ رات بغیر کسی رومانس کے منانے پر تلا ہوا تھا۔ دونوں خاندانوں کی عادات و اطوار میں بھی خاصا فرق تھا۔ ایک طرف رشوت کو جائز سمجھا جاتا تھا تو دوسری طرف اونچے طبقے کے امانت دار اور علمی گھرانے کا خاندان۔ اپنی بے بسی کو ساجدہ زیدی ان الفاظ میں بیان کرتی ہے: "یوں بھی عورت تو ہر زمانے اور ہر ماحول میں کسی نہ کسی حد تک محکوم ہی رہی ہے۔ لڑکیوں کی شادیاں ہمارے خاندان میں بھی بے جوڑ ہو جایا کرتی تھیں اور انھیں عزت و آبرو سے نبھایا جاتا تھا۔"(۱۰۸)

بیرون ملک سیر کے دوران ایک اطالوی نوجوان ساجدہ زیدی کے پیچھے پڑ گیا۔ بہت مشکل سے جان بخشی ہوئی۔ تنہا عورت کو دیکھ کر ہر تہذیب کا مرد مہذب گفتگو نہیں کر سکتا۔ عام مرد عورت کا استحصال کرنا، اسے استعمال کرنا اور اسے اپنے زیر نگیں بنانا چاہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مرد صرف پیشہ وارانہ کا کام کرتے ہیں خود سے پانی کا گلاس بھی نہیں پینا چاہتے جبکہ عورت ملازمت سے واپس آ کر سارا گھر کا کام کرتی ہے۔ مصنفہ کی خالہ صابرہ زیدی اسکالر شپ پر باہر کے ملک گئی تھی ان کی پوری عمر کی کمائی کتاب تھی جس کو روسی حکومت نے غائب کر دیا جب کہ اس کتاب کا تعلق سیاست سے ذرا بھی برابر نہ تھا۔

ش۔ فرخ لکھتی ہیں کہ لاہور میں گلستان جوہر کے ایک اسپتال سے نومولود بچہ غائب ہو گیا۔ اسپتال کے عملے نے اس بچے کو ایک بے اولاد عورت کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ ماں نے بچے کے لاپتہ ہونے پر صدمے سے دم توڑ دیا۔ رشتے بھی پیسوں میں بکنے لگے۔ اپنے اردگرد عورتوں کا موازنہ کرتے ہوئے ش۔ فرخ لکھتی ہیں کہ دائیاں دن میں تین چار کام کرتی ہیں۔ صبح تندور میں روٹیاں لگاتی ہیں، شام کو مکئی کے دانے بھونتی ہیں یہی عورتوں کی زچگی بھی کرواتیتھیں اور تو اور معاشی حالات سے مجبور ہو کر بچے بھی فروخت کرتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد مصنفہ کو منٹگمری (ساہی وال) کے ہائی سکول میں داخل کروادیا گیا جس کے نتیجے میں ہوسٹل قیام کرنا پڑا۔ یہ شہر کا سب سے اچھا ہائی سکول تھا جس کی پرنسپل مس بیز جی تھی جن کا ڈسپلن بہت اچھا تھا۔ ان ہی دنوں ہوسٹل کی ایک لڑکی نے دہلی سے نکلنے والے ماہنامہ "شمع" کے ایڈیٹر کے نام خط لکھا جس کی خبر سکول کی ہیڈ مسٹریس کو گئی اس نے ہوسٹل کی تمام لڑکیوں کو جمع کیا اور سب لڑکیوں کے سامنے اس لڑکی کو برا بھلا کہا۔ اسی رات اس لڑکی نے ڈر کے مارے سیاہی پی لی مگر بچ گئی۔ وہ لڑکی چیچہ وطنی سے پڑھنے آئی تھی نہ جانے اس کے بعد تعلیمی سلسلہ جاری رہا یا نہیں۔ اس کے بارے میں ش۔ فرخ لکھتی ہیں: "اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ اس نے ایڈیٹر کے نام خط لکھا تھا۔"(۱۰۹)

ساہی وال میں ملازمت کے دوران ش۔ فرخ کو اپنے ایک عزیز رشتے دار کے گھر قیام کرنا پڑا۔ اس کا ایک کلاس فیلو اکثر ملنے آ جاتا تھا جس کا گھر والوں نے برا منایا۔ تو مجبوراً مصنفہ نے اسے ایک کاغذ پر جواب لکھا کہ وہ

مصروف ہے مل نہیں سکتی۔ اس بات پر مصنفہ کو غصہ بھی بہت آیا لیکن وہ یہ بات کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتی تھی کہ وہ بہت اچھا شخص ہے اور مصنفہ کا ہم جماعت اور دوست ہے۔ بی۔ اے فائنل ایئر کے طالب علموں کو اپنے فارغ اوقات میں مصنفہ نے ایک کتاب لکھ کر دی جو امتحانات میں ان کے لیے مدد گار ثابت ہونی تھی۔ وہ کتاب مکمل کر کے اس کا مسودہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کو بھجوا دیا۔ ان کی سینئر نے وہ کتاب اپنے نام سے چھپوا لی جس کا علم مصنفہ کو بعد میں ہوا۔

ازدواجی زندگی میں ناکامی کے بعد مصنفہ اپنے لیے ملازمت تلاش کرنے لگی ان کے بھائی کو معلوم ہوا تو ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کیا ہم اسے روٹی نہیں دے سکتے بات تو درست تھی جب تک والدین زندہ تھے ایسا ممکن تھا مگر مصنفہ کی نظر میں بھائی کی روٹی کا مطلب ہے جیسے قرآن سے شادی ہو، گھربار سنبھالو ان کے بچوں کو پالو تو روٹی کپڑا مل ہی جاتا ہے مگر خود داری اور انا ختم ہو جاتی ہے۔ جب مصنفہ نے ملازمت شروع کی تو گاؤں کے لوگوں نے ان کے بھائی کو طعنے دینے شروع کیے کہ ان کی بہن صحافی بن گئی ہے یہ بڑی ہتک کی بات ہے علامہ صاحب کی بیٹی نے انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ دوسری طرف ہمارے معاشرے میں ایک مطلقہ عورت سے جو سلوک کیا جاتا ہے وہ قابل مذمت ہے مصنفہ کو طلاق ہونے کی وجہ سے عورتوں نے ان سے کترانا شروع کر دیا جبکہ یہ وہی عورتیں تھیں جو ان کے گھر دعوتوں پر آتی تھیں۔ بعد میں ان کی سرد مہری کی وجہ سامنے آئی ایک دن ان کی خالہ کے منہ سے لاشعوری طور پر نکلا۔ "میری خالہ نے کہا تھا، احتیاط برتنا۔ طلاق یافتہ عورتیں دوسروں کے شوہروں کو پھنساتی ہیں۔"(۱۱۰)

پھر خود ہی ان نیک خاندانوں سے دور ہٹتی گئی۔ ضیاء الحق کے دور میں ویمنز ایکشن فورم کے جلوس پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ نصرت بھٹو کے سر پر چوٹ آئی تھی سر کا خون ان کے گالوں پر بہہ رہا تھا۔ شوہر کی پھانسی کے بعد بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اسی دور میں "اخبارِ خواتین" مار کھا کھا کر نیم مردہ ہو چکا تھا۔ خود مصنفہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس کے بعد گھر کے باہر بھائی کے نام کی تختی لکھوائی گئی۔ جو بھائی کے لالچی ہونے اور دوسری طرف تحفظ کی علامت بھی تھی ا۔ یک دفعہ مصنفہ کی دوست اور سٹاف ممبر فریدہ شہید نے وومنز امپورمنٹ کا اردو میں مناسب لفظ نہ ملنے کا شکوہ کیا تو مصنفہ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کیسے ملتا؟ یہاں عورت کو اختیار ہی نہیں ہے۔ اگر وہ کسی طرح یہ حق حاصل کر لیتی ہے تو منفی رویے اس سے اختیار کو چھیننے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ مصنفہ ہی کے گاؤں کی ایک عمر رسیدہ عورت گھروں میں کام کر کے اپنے معذور شوہر کا علاج کروا رہی تھی۔ اپنی ایک جرمن روم میٹ کے بارے میں لکھتی ہیں اس کی شادی ایک ادھیڑ عمر پاکستانی سے ہوئی تھی وہ واپس آنے کا وعدہ کر کے پاکستان

آ گیا۔وہ لڑکی بھی شوہر کی تلاش میں پاکستان آ گئی۔دوسری روم میٹ ہسپانوی عورت تھی وہ بھی ایک پاکستانی مرد کے پیچھے آئی تھی۔

جاگیر دارانہ سماج میں لڑکی کا پیدا ہونا خوشی کی علامت نہیں سمجھا جاتا ہے اس لیے توصیف افضل کی پیدائش پر ان کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔پہلی بیٹی پیدا ہونے کی وجہ سے اس کی ماں کو باپ میکے بھجوا سکتا ہے یا ان کا باپ دوسری شادی کرے گا اور تو اور خاندان والوں کی باتوں میں آ کر ان کی والدہ کو طلاق بھی دے سکتا ہے۔ایسی صورت حال سے بچنے کے لیے قریبی عورتوں نے بچی کو مار دینے کا مشورہ دیا اور کہا گھر والوں کو کہیں گئے مرا ہوا بیٹا پیدا ہوا تھا۔وہ آپس میں مشورہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:"

> نی ایس کڑی نوں گڑھتی نہ دیو، بھارا دودھ رجواں پیا دیو آپے مر جاوے گی، نہیں افیون دی چچی نہیں تاں گل گھٹو۔۔۔۔۔پرانی رسم راجپوتاں والی۔۔۔۔کسے نوں کہیہ پتا کہہ دیاں گے منڈا ہو کے مر گیا۔"(۱۱۱)

لڑکی کو زیادہ دودھ پلا دو یا افیون کھلا دو اور کچھ نہیں تو راجپوتوں کی طرح لڑکی کو زہر دے دو کہہ دیں گے کہ لڑکا مرا ہوا پیدا ہوا تھا یہ سب باتیں سن کر پاس کھڑی بے اولاد ممانی کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا اور انہیں ایسا کرنے سے روکا اور اسے پالنے کی ذمہ داری لی یوں اپنی حکمت عملی سے کاکی ماں یعنی ممانی نے سماجی روایات کو زیر کر دیا اور اس کی پیدائش پر خوشیاں ایسے ہی منائیں جیسے کوئی بیٹے کی پیدائش پر مناتا ہے۔اس کو نئے کپڑے لے کر دیتی خود پرانے پہن لیتی مگر جلد ہی ان کی کاکی ماں مر گئی اور افضل توصیف بیٹے سے دوبارہ بیٹی بن گئی۔ان کے پدر سری خاندان میں لڑکے لڑکیوں کے مقابلے میں عرش کی مخلوق سمجھے جاتے تھے۔وہی پرانی روایات "پرایا دھن اور کماؤ پوت" والی بات۔ان کی دادی اس صنفی امتیاز کو چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے برقرار رکھتی تھی۔جب وہ صبح کو ناشتا بناتی تو گرم گرم روٹیاں مکھن دہی کے ساتھ کھائی جاتیں۔دودھ ،دہی اور مکھن کے برتاؤ میں صنفی امتیاز روا رکھا جاتا جس کو افضل توصیف یوں بیان کرتی ہیں:"دادی کا ہاتھ ایک آٹومیٹک ترازو تھا۔گھر کے مردوں کے لیے مکھن کا بیڑا۔بہوؤں کے لیے اور چھوٹا۔مگر پوتیوں کے لیے کوڈی جتنارہ جاتا"(۱۱۲)ان کے علاقے کوئٹہ میں مقامی لوگ لڑکیوں کو سکول نہیں بھیجتے تھے۔اس لیے ایک بیوہ خاتون شاہ بی بی مصنفہ کو سکول لے جانے اور لانے کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔جس سے اس کو دووقت کی روٹی میسر آتی تھی۔اپنی من پسند استاد کے جانے کے بعد پہلی بغاوت ہڑتال کی صورت میں کی۔لیڈرشپ کا یہ جذبہ کالج میں بھی جاری وساری رہا۔

ان کے گاؤں کی ایک یتیم چھ سالہ بچی کی شادی اس کی خالہ نے اپنے آٹھ سالہ لڑکے سے کروادی۔ماں باپ نہ رہے تو رشتے داروں سے زمین بچانے کے لیے بھانجی کا نکاح اپنے بیٹے سے کر دیا اور بچوں کی بارات کے ساتھ رخصت کروالائی۔ان کے دور میں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔لڑکے اعلی تعلیم کے لیے شہر سے باہر جاتے تھے جب کہ لڑکیوں کے ہاتھ میں ایک قاعدہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔مصنفہ کی ماں نے چھوٹی عمر میں ہی گھر کے کاموں میں بیٹی کو مصروف کر دیا تاکہ اگلے گھر جا کر مشکل نہ ہو۔ان کے کام کرنے پر خوش ہوتی مگر کھانے میں ان سے دوگنا حصہ بھائیوں کا رکھتی تھی۔لڑکیوں کے جلد جوان ہونے کے خوف سے پدر سری سوچ کے زیر اثر ماں نے انڈے نہ کھانے دیئے بڑی ہو کر بھی انڈوں سے مصنفہ کو نفرت ہی رہی۔

افضل توصیف کے ہوسٹل میں ایک لڑکی خالدہ تھی۔خالدہ کا باپ علی گڑھ یونی ورسٹی میں پروفیسر تھا اس کی ماں نے پاکستان آکر دوسری شادی کرلی۔خالدہ اپنے باپ سے دور ہوگئی۔رشتوں کی اس تقسیم نے خالدہ کو اندر سے توڑ دیا جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کرلی۔معاشرتی شعور اور سماجی ناہمواری کو سخت ناپسند کرتی تھی ان کا کہ تعلق نچلے طبقے سے تھا جس میں نوکر، غلام، کسان، مزدور اور مسکین لوگ شامل ہیں۔جس کو اوپر والی دنیا تسلیم نہیں کرتی میں بھی ان کو اپنا نہیں سمجھتی۔لارڈ میکالے کا بنایا ہوا ہمارا نظام تعلیم کھوکھلا ہے۔اس کا قومی اور عوامی زندگی کوئی تعلق نہیں۔نو آبادیاتی نظام نے ذہنی غلام اور کچھ کلرک پیدا کیے جو فائلیں سنبھالنے اور فوج افسران کی بحالی میں مدد دے سکیں۔حاکم کی اطاعت کو اپنا شیوا بنائیں اور بغاوت سے دور رہیں۔اسی نظام نے طبقاتی ناہمواری کو ہوا دی۔آقا اور غلام کا رشتہ استوار ہوا۔شوہر کے حصے میں سرداری اور بیوی اس کی اطاعت گزاری کے لیے غلام بن گئی۔

حمیدہ سالم کے دور میں لڑکی کی شادی سولہ سترہ سال کی عمر میں نہ ہو تو پورا خاندان اس کے بوجھ تلے آجاتا تھا۔اس لیے لڑکیوں کی تعلیم کو شادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا تھا۔ان کی بڑی بہن صفیہ اختر کی ایک منگنی ٹوٹ چکی تھی اور ان کی شادی جان نثار اختر سے ہوئی۔اس دور میں ناک کی کیل سہاگن ہونے کی نشانی سمجھی جاتی تھی جیسے مغربی ممالک میں ہیرے کی انگوٹھی کو سمجھا جاتا ہے۔۱۹۴۲ء کے سیاسی بحران میں صفیہ کے شوہر کی ملازمت چھوٹ گئی۔اس وقت صفیہ علی گڑھ کالج کی پرنسپل تھی۔شوہر کے کہنے پر اپنا تبادلہ بھوپال کروالیا جس پر وہ اکیلی رہ گئی۔اس دور میں نومولود بچوں کی بہت اموات ہوتی تھیں۔صفیہ بھی پے در پے ابارشن سے شادی کے پہلے سال ہی نڈھال ہوگئی تھی۔وہ بیمار رہنے لگی اس دوران دو وہ بچے ہوئے ان کی پرورش کے لیے ملازمت مجبوری تھی ورنہ ان

کی اور بچوں کی کفالت کون کرتا؟والدین پر وہ بوجھ بننا نہیں چاہتی تھیں۔ بیماری میں کام کرنا ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اتنی کمزور ہو گئی کہ قلم تک نہیں پکڑ سکتی تھی۔ اپنے آخری خط میں آخری جملہ یہ لکھا:"اختر مجھے مرنے نہ دو میں مرنا نہیں چاہتی۔"(۱۱۳) ان کی بہن صفیہ کے سسرال والے قدامت پرست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں پر کسی عورت کا تعلیم حاصل کرنا تو دور کی بات تھی ملازمت پیشہ بہو کو کیسے برداشت کرتے ان کی نظر میں ایک عورت کا ملازمت کرنا تو گناہ کبیرہ تھا ان پابندیوں سے نجات حاصل کرنا شاید ان کے شوہر کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ کرشن چندر نے صفیہ کو جدید عورت کہا جو اپنے شوہر کی رفیق ہی نہیں بلکہ اس کا بازو بھی تھی۔ صفیہ اختر نے اپنی شناخت باپ، بھائی اور شوہر سے نہیں بلکہ اپنے تخلیقی فن سے بنائی اور ادبی دنیا میں اپنا نام کمایا۔ حمیدہ سالم نے اپنی آپ بیتی کے باب یادوں کے سایے میں اپنی دوست قمر کا ذکر کیا۔ جس کے گھر نیا کرایے دار آیا تھا جو یونی ورسٹی میں کسی اعلی عہدے پر فائز تھا۔ ان کو قمر سے عشق ہو گیا دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ والدہ نے منع کیا مگر گھر میں عورت کی بات کون سنتا ہے اس زمانے میں عورت کی آواز کو نقار خانے میں طوطی کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ قمر ایک ہی سال کے اندر ماں بننے والی ہو گئی مگر کم عمری کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ تب خاندان سے باہر شادی کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ چھوٹی عمر میں شادیوں کا چلن عام تھا جس کا فیصلہ بزرگ کرتے تھے کنواری لڑکیوں پر بے پناہ پابندیاں لگائی جاتی تھیں جس کی وجہ سے وہ جلد شادی کرنے کی خواہشمند ہوتی تھیں۔ اکثر لڑکیوں کے پیدا ہوتے ہی ان کی نسبت طے کر دی جاتی۔ ذہنی بیماری کی صورت میں ماہر نفسیات کا کوئی تصور نہ تھا۔

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" ایک عورت کی سچی کہانی ہے ان کی ذات کا حصہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے مگر ان کی زندگی میں آنے والی عورتیں بھی مشرقی معاشرے کے نسائی پس منظر میں بے بسی کی زندگی گزرنے پر مجبور ہیں۔ ایک چھت، دو وقت کی روٹی، بچوں کے لیے باپ کی خاطر بیوی مجبور ہو کر طوائف نہیں بن جاتی لیکن ایک ایسی طوائف بیوی ضرور ہوتی ہیں جن کی حیثیت بچے پیدا کرنے والی مشین سے زیادہ نہیں۔ سماج میں بے آبرو ہونے والی عورت کا ذکر بڑی جان سوزی سے کیا جاتا ہے لیکن مرد سے کون پوچھتا ہے کہ وہ کہاں کی محفل سجائے گا؟ مرد باپ، بیٹا، شوہر اور محبوب بن کر عورت کا استحصال کرتا ہے۔ مرد کی ستائی ہوئی عورت کس طرح دربدر خور ہوتی ہے۔ ان حقائق سے پردہ نفیس بانو شمع نے اٹھایا ہے۔ نفیس بانو شمع کے والد نے قصبے کی ایک لڑکی سے دوسری شادی کر لی ان کی والدہ اور تین بچوں کو گھر سے اپنی دوسری بیوی کے کہنے پر نکال دیا۔

ننھیال کے گھر میں ان بچوں نے پرورش پائی،ان کی والدہ کی دوسری شادی ایک ہیڈ ماسٹر صاحب سے کردی گئی چھوٹی بہن ماں کے ساتھ چلی گئی، ان کا چھوٹا بھائی وفات پا گیا۔ نفیس بانو شمع کو نانی نے پالا۔ان کی نانی نفیس بانو شمع کو لے کر کسی بزرگ کے سالانہ میلے میں گئی سفر کے لیے ٹرین کا انتخاب کیا۔کسی نے ٹرین کی چین کھینچ دیان کی نانی سمجھی سٹیشن آیا ہے وہ نفیس کو لے کر اترنے لگی تو پاؤں پھسل گیا نفیس ہاتھ سے چھوٹ کر ٹرین کے نیچے چلی گئی لوگوں نے سمجھا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں مگر ٹرین کے جانے کے بعد ٹرین سے اس کی گردن کا فاصلہ چند انچ کا تھا۔ نفیس بانو نے اس واقعے کو آنے والی زندگی کے رنج والم کو بیان کرتے ہوئے لکھا:"میری موت قسطوں میں لکھی ہوئی ہے میں بڑی سخت جان ہوں۔ایک بار کی موت میرے لیے کافی نہ ہو گی۔"(۱۱۴)

نفیس بانو کی شادی بھی بد قسمتی سے ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کو بیوی سے کوئی دلچسپی نہ تھی مصنفہ کو یہ گلہ تھا کہ وہ اگر کسی اور کا خواب تھا تو ان کی زندگی میں کیوں آیا؟ شادی سے انکار کیوں نہیں کر دیا۔اس نے مصنفہ کے سامنے اپنی خاندانی روایات کی مجبوریوں کا رونا رویا۔گھر والوں کو پریشان نہ کرنے کے خیال سے شوہر کے گھر دوبارہ آ گئی جب کہ شوہر عیاش پرست تھا۔وہ اپنے شوہر کی عیاشیوں کے بارے میں لکھتی ہے کہ:"وہ فارس روڈ کی طوائفوں کو گھر میں لاتا اور مجھے سے کہتے تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور میں ایسا نہ کرتی تو میری پٹائی کرتا۔"(۱۱۵) نفیس بانو شمع نے اپنی زندگی کی داستان سنانے کے بعد ایسے معاشرتی کردار بیان کیے ہیں جن میں دکھ برداشت کرتے کرتے جینے کی کسک ختم ہو گئی۔انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور واقعات کو مکمل طور پر عورت ذات کے لیے ہم آہنگ کر دیا۔ان کرداروں میں رابعہ،مہ جبین،کے نام شامل ہیں۔

نظام الدین اولیا کے مزار پر خواتین کو تیاگ کر راہبہ بن کر زندگی گزارنے کا انتظام تھا مصنفہ وہاں گئی وہاں رکنے کا ارادہ بنا کر واپس آ گئی اور بچوں کی وجہ سے یہ فیصلہ ترک کر دیا۔رابعہ اور شاہ جہاں نفیس بانو شمع کی دوست تھیں جو قریب ہی گھروں میں رہتی تھیں۔رابعہ کی شادی ستر سالہ بوڑھے شخص سے ہوئی جس نے اسے مسلمان بنایا۔مسلمان ہونے کے باوجود وہ شراب پیتا، طوائفوں کو گھر لاتا۔یہ بات رابعہ کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ جو شخص بیوی کے قابل نہ ہو وہ طوائفوں کو کس مقصد کے تحت گھر لاتا تھا؟ اولاد شادی کے بعد ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے مگر رابعہ کا شوہر بوڑھا تھا اس وجہ سے وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔کم عمر لڑکیوں کو اڈھیر عمر کے مردوں کے ساتھ منسوب کر دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ کیا ان لڑکیوں کے جنسی جذبات نہیں ہوں گے؟ رابعہ کے شوہر کی وفات کے بعد اسے اسلم نامی لڑکے سے عشق ہو گیا جو عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ان دونوں نے شادی کر لی۔شادی کے چار ماہ بعد اس کے شوہر نے لکڑی بیچنے والی چودہ سالہ لڑکی سے خفیہ نکاح کر لیا۔بعد میں اسلم نے رابعہ کو یہ کہہ کر

نکال دیا کہ اس کی بیوی نہیں چاہتی کہ وہ اس کے ساتھ تعلق رکھے۔ وہ ایک خوددار لڑکی تھی کافی عرصہ ملازمت تلاش کرتی رہی آخر کار ایک ایجنٹ کے ذریعہ مدینہ منورہ کے اسپتال میں بطور نرس نوکری مل گئی۔ رابعہ کے بعد شاہ جہاں مصنفہ کی دوست بنی اس کی تیس سال کی عمر میں تین شادیاں ہوئی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد تو جتنی مرضی چاہے شادیاں کرلے مگر عورت کی دوسری شادی کو بھی معیوب تصور کیا جاتا ہے وجہ کچھ بھی ہو مرد کا عورت کو طلاق دینا فیشن بنتا جا رہا ہے اگر مرد کی کمزوری عورت ہے تو عورت کا سہارا بھی مرد ہے جس کی عورت کو ہر عمر میں ضرورت ہوتی ہے۔ شاہ جہاں کی پہلی شادی بارہ سال کی عمر میں ہوئی وہ شخص اس سے چالیس سال بڑا تھا جو شاہ جہاں کو اپنی بیٹی سمجھتا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے شاہ جہاں کو طلاق دے دی تا کہ اس کی ماں اس کے ہم عمر لڑکے سے شادی کروادے مگر ماں نے بیٹی کو امیر گھر میں بیاہنے کے شوق میں دوبارہ ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ جوڑ دیا، جس کی اپنی بیٹی اور بہو بھی تھی۔ اس شخص سے شاہ جہاں کی ایک بیٹی ہوئی جس سے اس کی جنسی سوئی ہوئی امنگ جاگ گئی دوسری طرف شوہر کئی کئی دن گھر نہ آتا، تنہائی کاٹ کھانے کو آتی ان حالات سے مجبور ہو کر شاہ جہاں نے ایک لڑکے سے دوستی کرلی جس کا اس کے شوہر کو جب علم ہوا تو اس نے شاہ جہاں کو طلاق دے دی۔ دو ماہ بعد اس کی بیٹی اور ماں دونوں داغ مفارقت دے گئیں۔ شاہ جہاں پھر سے تنہا ہو گئی۔ جس سے دوستی ہوئی تھی وہ ایک غریب طالب علم تھا جو ایک کرایے کے گھر میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا اس کا کیسے بوجھ اٹھا سکتا تھا؟ حالات نے ایک دفعہ پھر شاہ جہاں کو اپنی گرفت میں لے لیا اب اس نے تیسری شادی اپنی مرضی سے کی اب بھی دونوں کی عمروں میں تو فرق تھا مگر دلوں میں نہیں تھا۔ نفیس بانو شمع کے گھر کے باہر فٹ پاتھ پر ایک بیس، بائیس سال کی خوش شکل لڑکی کھڑی تھی۔ اس کو کھڑے کھڑے تین چار گھنٹے ہو گئے تو نفیس کو اس کے بارے میں تشویش ہوئی وہ بار بار کھڑکی کے پاس آکر چیک کرنے لگی۔ رات ہوئی تو ایک چادر بچھا کر سو گئی نفیس بانو شمع نے نوکر کو بھیج کر اس کو بلایا تا کہ حقیقت معلوم ہو سکے۔ نفیس بانو شمع نے اس سے یہاں رہنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ یہ ایک گریجویٹ عیسائی لڑکی ہے ایک لڑکے سے پیار ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ بھاگ آئی۔ ایک ہفتے ہوٹل میں رہے بعد میں وہ لڑکا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ایک اجنبی شخص نے بتایا کہ اس کے شوہر کو پولیس لے گئی ہے۔ یہ لڑکی اس اجنبی کے ساتھ ایک عمارت میں آئی جہاں پر چار پانچ اور غنڈے تھے جنہوں نے بتایا کہ تمہارے شوہر نے پچیس ہزار میں تمہیں بیچ دیا ہے اب وہ اسے ایک ہفتہ استعمال کرنے کے بعد ایک چکلے میں اسے فروخت کر دیں گئے۔ ایک ہفتہ ان غنڈوں کے ہاتھوں کھلونا بننے کے بعد وہ لڑکی موقع پا کر بھاگ گئی اور اب فٹ پاتھ پر بے یارو مددگار پڑی ہوئی تھی۔ نفیس بانو نے اسے

بتایا کہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کا ٹھکانہ طوائف کا کوٹھا ہی ہوتا ہے۔ نفیس بانو نے اسے گھر واپس جانے کا مشورہ دیا جس پر وہ دو دن کا کہہ کر واپس نہ آئی۔ وہی جولی بعد میں دو ماہ بعد طوائف کی صورت میں نظر آئی۔

نفیس بانو شمع کے محلے میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو گلہ دبا کر مار دیا کیوں کہ اس کے ہاں ہر دفعہ بیٹی پیدا ہوتی تھی اور اسے لڑکے کا شوق تھا۔ اس کے رویے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بازار میں اولاد کی منڈی لگی ہو اور جو چاہے اٹھا کر لے آؤ۔ لڑکا اور لڑکی کا صنفی امتیاز جگہ جگہ اس آپ بیتی میں نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ لکھتی ہیں: ”جب بھی کسی عورت کے اندر جھانک کر دیکھا وہ دکھی ہی نظر آتی ہے چاہے وہ شہر کی ہو یا دیہات کی، نصیب سب کا ایک سا لگتا ہے۔“(۱۱۶) نفیس کی اپنی رضائی بہن سورستی کی شادی ہوئی تو اس کے سسرال نے بہت ظلم ڈھانے لگے جن کی تاب نہ لاتے ہوئے سورستی نے ٹرین کے نیچے سر دے دیا۔ امجد نے تیسری شادی کی اس کی پہلی دو بیویاں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ تیسری بیوی کی عمر کم تھی جس کی وجہ سے سہاگ رات کو کرب ناک چیخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ امجد کی بیوی قربانی کے بکرے کی طرح چلاتی رہی۔ صبح کے وقت محلے والوں کی شکایت پر اسے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ بعد میں پتہ چلا وہ اذیت پسند اور ظالم تھا لڑکی نے اسی رات طلاق لے لی۔ بنارس میں ادریس نامی ایک شخص تھا جو شادی شدہ اور بچوں کا باپ ہونے کے باوجود ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ ہم جنس پرستی کی لت مبتلا تھا۔ اس کا مفعول خالد اس کے بیٹے کا ہم عمر تھا۔ ادریس سب کی پروا کیے بغیر سر شام خالد کو کمرے میں لے کر چلا جاتا۔ اس بات پر میاں بیوی کا جھگڑا طوالت پکڑتا گیا۔ ادریس نے غصے میں آکر اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اپنی غلطی کا احساس ہونے پر حلالہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کو خالد پر بھروسہ تھا اس نے اپنی سابقہ بیوی کا نکاح خالد کے ساتھ کروا دیا تاکہ اگلے دن وہ طلاق دے اور وہ دونوں دوبارہ نکاح کر لیں۔ ادریس کی بیوی سکینہ خالد سے پچیس سال بڑی تھی مگر خالد نے اس کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور اسے طلاق نہ دی یوں ادریس کے ساتھ دھوبی کے کتے والی ہوئی۔

نفیس بانو نے مردوں کی مکاریوں اور فریب کاریوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرے میں تنہا عورت کا مقام ایک کٹھ پتلی کی طرح ہے جسے حاصل کرنے کے لیے اکثر شرفا اور مہذب لوگ بھی گھٹیا پن پر اتر آتے ہیں۔ نفیس بانو شمع کے ماموں نے پینتیس سال کی عمر میں سات شادیاں کیں کوئی بھی بیوی چھ مہینے سے زیادہ اس کے ساتھ نہ رہ سکی کیوں کہ وہ بہت زیادہ شکی مزاج تھے۔ آفس جاتے ہوئے بیوی کو کمرے میں بند کر جاتے واپسی پر گھر کے صحن اور چھت پر مردانہ قدموں کے نشان دیکھتے۔ اگر بلی کے پنجوں کے نشان بھی مل جاتے تو اگلے دن بیوی کو طلاق دے کے رخصت کر دیتے۔ نفیس بانو شمع کی خالہ مریم شادی کے چھ ماہ بعد ہی بیوہ ہو گئی شوہر کی نشانی ایک بچی کی صورت میں پیچھے رہ گئی۔ کمسن ماں نے پوری عمر بیوگی میں گزری کیوں کہ اس زمانے میں عورت جس عمر میں بھی

بیوہ ہو اس کی شادی کو معیوب سمجھ جاتا تھا۔اس لیے پرویزپرویزی نے "جنت سے نکالی ہوئی حوا" کوایک دکھی عورت کی خود نوشت نہیں کہا بلکہ کئی دکھی عورتوں کی داستان قرار دیا ہے۔اس بے رحم سلوک کے خلاف عورتوں کا احتجاج بھی جاری ہے۔

خیبر پختونخواہ کا صوبہ انتہائی قدامت پرست اور پس ماندہ صوبہ ہے۔ان کے صوبے کی عورت کا ذکر اردوادب میں بہت کم آیا ہے نثار عزیزبٹ کی آپ بیتی "گئے دنوں کا سراغ لے کر" میں حقیقی زندگی سے لیے گئے بے پناہ نسوانی کردار ہیں جنہوں نے بڑی استقامت سے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ان کے علاقے میں لڑکیوں کا سکول نہ تھا۔عام طور پر ان کے خاندان کے لڑکے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے لعولعب میں مبتلا رہتے اپنی عورتوں پر بے پناہ تشدد کرتے عورتوں نے بھی صبر کا دامن مضبوطی سے تھام لیا تھا جو عورت زیادہ تکالیف برداشت کرتی وہ تعریف کی حق دار قرار پاتی۔لڑکیوں کی شادیاں خاندان سے باہر نہیں ہوتی تھیں۔وہ ہر وقت پردے میں رہ کر عزت وعصمت کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتیں۔عزت کے نام پر وہاں عام قتل وغارت گری ہوتی تھی۔ان کے گھر کی ملازمہ شمس السحر ان کو باہر کی خواتین کے حالات سے آگاہ کرتی۔روپیہ لے کر لڑکی کا نکاح کسی بھی بوڑھے،اپاہج اور غلط شخص سے ہو سکتا تھا۔نثار اپنی دوست خورشید کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اس کی شادی ان کے باپ کے ہم عمر مرد سے ہوئی۔اسی آپ بیتی میں قرۃ العین حیدر برصغیر کی عورت کی حالت زار کے بارے میں لکھتی ہیں کہ طوائف اور عورت بے بس ہوتی ہے اس لیے معاملہ تقدیر کے سامنے آتا ہے۔طوائف اس معاشرے کی علامت ہیں جہاں پر گھریلو عورتیں ان پڑھ اور جھگڑالو ہوتی ہیں۔انہی گھروں میں مردوں نے داشتائیں رکھی ہوتی ہیں جو پڑھی لکھی اور تہذیب یافتہ ہوتی ہیں۔

اس معاشرے میں لڑکے عیاشی کرتے ہیں اور لڑکیوں پر تشدد کیا جاتا ہے۔لڑکیوں کا اپنے سے بڑی عمر کے مردوں سے شادی کرنے کا عام رواج تھا۔مصنفہ کو خود تعلیم حاصل کرنے میں بہت تگ ودو کا سامنا کرنا پڑا۔پھر ساری عمر جدت اور روایت کی کشمکش میں وقت گزرا۔وہ لکھتی ہیں:"بیسویں صدی کا ڈرامہ تو کسی اور سٹیج پر ہو رہا تھا اور ہم اس ڈرامے کے تماشائی تھے یا پھر اس کے VICTIMS۔۔۔۔۔۔"(۱۱۷)

مصنفہ پورے یقین کے ساتھ کہتی ہیں کہ ان کے پیدا ہونے پر رونا دھونا ڈالا گیا ہو گا کیوں کہ ان کے نانا/نانی کے گھر میں پہلے ہی سے سات لڑکیاں پیدا ہو چکی تھیں۔جب کہ ان کے امی ابو خوش تھے وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی۔ان کے ہاں کنواری لڑکیوں پر بے جا پابندیاں لگائی جاتیں اور ان کی سخت نگرانی کی جاتی۔وہ اپنی

دوسری والدہ کے بارے میں لکھتی ہیں: "کہ ممی اپنے گھر کی پابندیوں سے آزاد ہو کر روشن خیال شوہر کے گھر پہنچیں تو نہال ہو گئیں۔"(۱۱۸)

ان کے گھر حالات اس حد تک خراب تھے کہ ان کی سوتیلی ماں اپنے والد کی سخت مزاجی سے تنگ آچکی تھی اس نے خوشی خوشید وسری شادی والے سے شادیکرنے پر مجبور ہو گی۔یوں ان کی والدہ کنوارپن کی پابندیوں اور میکے کے مسائل سے آزاد ہوئیں تو بچوں کو نانی کے گھر کے حبس سے نجات ملی۔ان کے ہاں دس سال کی لڑکی کو جوان ہونے کا طعنہ دیا جاتا تھا۔ان کی خالہ کا شوہر جرنیل تھا ساری بہنیں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔مگر دولت سے قسمت اچھی نہیں ہوتی وہ حد درجہ عیاش تھے وہ آئے دن ملتان طوائفوں کے مشہور ڈیرے پر جاتے ایک طرف بیوی سے محبت کرتے تو دوسری طرف عیاشی کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ان کے جاتے ہی ان کی خالہ کو بخار ہو جاتا۔ان کے رشتے دار حاجی صاحب کی بیوی کو ایک ماہ کے لیے سینی ٹوریم جانا پڑا وہ بیوی کی غیر موجودگی سے سخت پریشان تھے سب بیٹیوں کو بلا کر کہا کہ میں تمہاری ماں کو طلاق دے رہا ہوں یہ سن کر ایک لڑکی رونے لگی تو دوسری بحث کرنے لگی۔یوں ان کے علاقے میں بے بنیاد اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق دے دی جاتی تھی۔ہمارے دیہاتوں اور چھوٹے شہروں کی عورتیں بے بس،ان پڑھ اور دکھی ہیں۔ان کی حالت گوشت پوشت کی چیزوں جیسی ہے جو بالکل بے کار ہوں۔مصنفہ کا پہلا افسانہ چھپا تو بہت خوش تھی مگر وہ افسانہ ان کے چھوٹے بھائی سرتاج عزیز کے نام سے شائع ہوا۔لڑکیوں کو شادی بیاہ پر جانے کی اجازت نہ تھی لڑکیاں دلہن دیکھنے کا شوق پورا کرنے کے لیے "مخ ٹوپیاں "بن جاتیں جو برقع پہن کر اور نقاب کر کے دلہن کے گھر جاتیں۔یہ عورتیں مخ ٹوپیاں کہلاتیں۔ان کے آنے پر دلہن کو دوبارہ دلہن بننا پڑتا۔مصنفہ نے ان فضول رسم ورواج سے نجات کا راستہ تعلیم کو قرار دیا اور لکھتی ہیں: "میں تعلیم حاصل کر کے ان اندھیروں میں سے نکل سکوں جو اس زمانے کی ہمارے علاقے کی عورتوں کا مقدر تھی۔"(۱۱۹)

سرتاج عزیز اپنی بہن کا رزلٹ دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ایک لڑکے نے وجہ پوچھی تو کہا کہ میرے نالائق دوست کا رزلٹ آیا ہے۔اس نے اپنی بہن کا نام غیر لڑکے کے سامنے لینا اپنی غیرت کے خلاف سمجھا۔ان کے والد روشن خیال ضرور تھے مگر وہ اپنی بیٹی کا رشتہ کا کا خیل خاندان میں ہی کرنا چاہتے تھے۔والد صاحب نے خاندان کے چند لڑکوں کو اپنے پاس رکھ کر سکول داخل کروایا پر وہ پرائمری پاس بھی نہ تھے جو واحد لڑکا ان کی دانست میں تعلیم یافتہ تھا اس سے مصنفہ کا رشتہ کرنا چاہتے تھے جب وہ نہ مانی تو ان کی بہن کا رشتہ وہاں کر دیا۔شادی کے بعد مصنفہ نے بہت سے اسفار کیے۔ایک دفعہ بلجیم کے نائٹ کلب میں نیم برہنہ اور خوب صورت عورتوں کو دیکھ کر

بہت رنجیدہ ہوئیں اور کہانا جانے ان پر کیا افتاد آن پڑی ہے جو ان کو یہ کام کرنا پڑا۔ جہاز پر سفر کرتے ہوئے مصنفہ کو مشنریوں کا گروپ بھی ملا۔ جس میں ایک جین نامی لڑکی سے مصنفہ کی دوستی ہو گئی۔ وہ لڑکی بہت دکھی نظر آرہی تھی اس کے دکھ کی وجہ صرف اتنی سی محسوس ہوئی کہ اس کے والد اسے مشینری کے کام کرنے کے لیے اسے ہندوستان بھیجنا چاہتے تھے اور وہ جانا نہیں چاہتی تھیں وہ دھیمے لہجے کی اداس لڑکی تھی۔ ایک کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں کہ ساری دنیا کے مردوں کی طرح ڈاکٹر سجاد حسین عورتوں کو سادہ لباس پہنوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے قرۃ العین حیدر کو کسی کانفرنس میں دیکھا تو انہیں مغرور عورت کا خطاب دے دیا۔ مصنفہ نے قرۃ العین حیدر کے دفاع میں صرف اتنا کہا: ''کیا دانشور عورتوں کو اپنی نسائیت کی نفی کرنا چاہیے؟''[۱۲۰] یہودی مارک کے کئی بیٹے تھے اس کا تایا ہم جنس پرستی کی لت میں مبتلا تھا جو ایک جنسی اور نفسیاتی بیماری ہے۔ اس کی بیوی کو فکر لاحق تھی کہ اس کے بیٹے بھی تایا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم جنس پرستی کا شکار نہ ہو جائیں۔ سعودی عرب میں عورت کو خاتون خانہ کے طور پر پسند کیا۔ اس لیے مصنفہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ خود کو جرنلسٹ کی بجائے ایک خاتون خانہ کے طور پر متعارف کروائیں۔ حج کے دوران مصنفہ نے مشاہدہ کیا کہ سعودی عرب میں ہی صبح چار بجے کے بعد عورتوں کو روضہ رسول کی جالیوں کے پاس جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں پر نگران عورتوں کو ڈانتے دھتکارتے رہتے ہیں۔ اردو ادب کی نامور نقاد ممتاز شیریں کے نہ لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان کے نہ لکھنے کی وجہ ان کے شوہر تھے جن کے منع کرنے پر انہوں نے بہت سے مضامین ادھارے چھوڑ دیئے۔ وہ صرف اور صرف پتی ورتا بن کر رہ گئی۔ اسی طرح بہت سی باصلاحیت خواتین اپنے شوہروں کے کہنے پر اپنے پیشے کو چھوڑ دیتی ہیں۔ بورین سٹریٹ کے ایک ہوٹل میں بڑی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کر رہے تھے۔ چارلسٹن میں مصنفہ نے غلاموں کی خرید و فروخت کی ایک قدیم مارکیٹ دیکھی جہاں پر غلاموں کو فروخت کرنے کے لیے لایا جاتا تھا ایک رجسٹر پر ان کی عمر، صورت اور قوت کے بارے میں لکھا جاتا تھا۔ جہازوں میں بھر کر سیاہ فام مرد اور عورتیں بندر گاہوں کے ذریعے لائی جاتی تھیں۔ وہ آزاد ان ساحلوں پر اترتے اور عمر بھر غلام رہتے۔ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر اسے آزاد رہنے نہیں دیا جاتا۔

جنرل ضیاء الحق کے بارے میں لکھا کہ ایک دن انہوں نے ووٹ دینے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہر بالغ آدمی کو ووٹ دینے کا حق دینا کیوں ضروری ہے؟ اور عورتوں کو کیوں ووٹ دینے کا حق دیا جائے ووٹ صرف صالح اور متقی لوگوں کو ہی دینے اور ملنے چاہیں ان کی نظر میں عورتیں صالح اور متقی نہیں ہیں۔ زہرا داؤدی کو اپنے لڑکی ہونے کا احساس چھ سال کی عمر میں ہوا جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ بگھی میں پیچھے بیٹھی اور بھیا کوچوان کے ساتھ آگے بیٹھ کر بڑے فخر سے اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ زہرا داؤدی نے بھی بھیا کے ساتھ بیٹھنے کی

خواہش ظاہر کی تو ماں نے یہ کہہ کر رد کر دی کہ لڑکی ذات ہو کر کو چوان کے ساتھ بیٹھے گی۔ان کے علاقے میں لڑکیوں کی زیادہ پڑھائی لکھی اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی کیونکہ ان سے نوکری / ملازمت کروانے کا رجحان نہیں پایا جاتا تھا۔جب خاندان کی کوئی لڑکی پڑھی لکھی تھی نہیں تو بغاوت کس نے کرنی تھی۔یہ خیال کیا جاتا تھا کہ لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتی ہیں۔انہیں سکول میں داخل کروانے کی بجائے گھر کی چار دیواری میں بند کر دیا جاتا تھا۔یہاں پر کم عمری کی شادی کا بھی رواج عام تھا یہ کہاوت مشہور تھی کہ قبر پر چراغ تو بیٹا جلائے گا بیٹی کو تو پرائے گھر جانا ہے۔زہرا داؤدی کی والدہ اپنے شوہر سے تیس سال چھوٹی تھی۔جو اپنے شوہر کے پہلے بیٹے سے بھی تین سال عمر میں چھوٹی تھی۔ان کے گھر میں بڑے بھائی کی حکمرانی تھی جو لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔زہرا داؤدی اپنے چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔زہرہ کی والدہ کے دل میں بیٹی کو پڑھانے کی کسک پیدا ہوئی وہ گھر میں خود پڑھانے لگی تو ان کی پھوپھیوں کو اعتراض ہونے لگا۔قسمت نے ساتھ دیا تو ان کے والد کا تبادلہ دوسرے شہر پٹنہ ہو گیا اور اس کا بھائی حیدر آباد رہ گیا۔ان کے والد اور والدہ نے عربی،فارسی اور قرآن پاک کی ضروری تعلیم دی۔زہرا داؤدی بچپن سے ضدی اور دھن کی پکی تھی اکثر بھوک ہڑتال کر کے اپنی بات منوا لیتی تھی۔اس نے سکول میں داخلہ لینے کے لیے بھوک ہڑتال کی تو کامیاب ہو گی۔۱۹۳۸ء میں زہرا داؤدی کو پٹنہ کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا جہاں سے انہوں نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔زہرا داؤدی کو پہلی مسلم گرلز بہار کا اعزاز حاصل تھا۔ایف۔اے کے بعد اس کی شادی حبیب داؤدی سے کر دی گئی۔

صغرا مہدی کے والد کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اسی لیے وہ گھر کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے تھے اور زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرتے تھے۔ان کی والدہ گھر کا انتظام اکیلی نہ کر سکنے کی وجہ سے اکثر ذہنی طور پر بے چین رہتی تھی ان کو پریشانی کی وجہ سے بہت سی بیماریوں نے گھیر لیا تھا۔اپنے والدین کی ازدواجی زندگی کے بارے میں صغرا مہندی نے لکھا:

> "اماں اور میاں کی عمروں میں بہت فرق تھے اور مزاجوں میں بھی۔اماں ہماری دادی کو سخت ناپسند تھیں جو رشتے میں ان کی چچی لگتی تھیں،مگر بہت تیز اور سخت مزاج تھیں۔۔۔اماں اور میاں کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتیں وجہ اختلاف بن جاتیں۔"(۱۲۱)

ان کے گھروں میں لڑکی کی پیدائش پر افسوس کیا جاتا تھا اس لیے صغرا مہدی لڑکے اور لڑکی کے تضاد اور معاشرتی ناہمواری کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں لڑکوں کے لیے منتیں مان لی جاتی تھیں۔لڑکیوں کے لیے یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔بی۔ایڈ کے ٹور کے دوران مصنفہ نے چتوڑ گڑھ کا قلعہ دیکھا جہاں پر راجپوت عورتیں "جوہر کی

رسم"میں ستی ہوئی تھیں۔ اپنی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے ماحول کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ علیگڑھ کا ماحول تنگ نظری کا شکار تھا۔ لڑکوں کا لڑکیوں کے پیچھے گھومنا، فقرے بازی کسنا اور لڑکیوں کا شرمانہ عام تھا۔

عذرا عباس اپنے بچپن کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان کے بھائی نے گھر میں چڑیا کو قید کر لیا تو اسے دیکھ کر ان کو بخار ہو گیا۔ جب وہ جوان ہوئی تو گھر والوں نے اس کو بھی گھر میں اس چڑیا کی طرح قید کر دیا۔ گھر کا ہر فرد کڑی نگرانی کرتا کہیں وہ باہر تو نہیں گئی ان کی دنیا گھر اور سکول کی حد تک محدود ہو گئی۔ ایسی کڑی پابندیوں نے جینا دشوار کر دیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس سے ایسا کیا گناہ ہوا ہے؟ جس کی سزا مل رہی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"اب میرا باپ، میرے بھائی مجھے اس طرح دیکھتے جیسے کسی قیمتی چیز کی رکھوالی کی جاتی ہو اور اسے بار بار دیکھنا پڑتا ہو، میں اکثر ان آوازوں کی زد میں ہوتی "باہر کیوں جا رہی ہو؟" بال باندھو، کود کیوں رہی ہو؟"(۱۲۲)

وقت کے ساتھ ساتھ جسم کے اندر ہونے والی جسمانی تبدیلیوں نے بھی پریشان کر رکھا تھا اور پھر مختلف سوالوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک دن وہ اپنی امی کے ساتھ لیٹی تھی تو ان سے ناف کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کیوں ہوتی ہے؟ پھر اچانک دوسرا سوال یہ کر دیا کہ میرا بھائی یہاں سے پیدا ہوا ہے نا؟ اس سوال کے سنتے ہی ان کی والدہ غصے سے لال پیلی ہو گئیں اور زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا: "کم بخت کیا کیا سوچتی ہے ناک کیوں ہے، کان کیوں ہے میں حیران ہو کر ماں کو دیکھ رہی تھی؟"(۱۲۳) ہمارا معاشرے میں ایسے سوالوں کے تسلی بخش جواب نہ دینے کی وجہ سے مزید تجسس پیدا ہوتا ہے جو معاشرتی گھٹن کا باعث بنتا ہے۔

پدرسری نظام کے تحت وجود آنے والے معاشرے میں عورت کے استحصال کا آغاز گھر کی دہلیز سے شروع ہو کر گلی محلوں، دفتروں اور حکومتی اور مذہبی اداروں تک جاتا ہے کشور ناہید نے اپنی کتاب "بری عورت کی کتھا" میں کہا کہ ان کے اپنے استحصال کا آغاز گھر سے ہوا ہے جس میں پدرسری نظام کے تحت پرورش پانے والی عورتیں اپنی اولاد کے ساتھ بھی امتیازی سلوک روا نہیں رکھ سکتی کشور ناہید یہاں گمان کرتی ہیں کہ ان کی پیدائش پر بھی کوئی خوشی نہیں منائی گئی ہو گی کیوں کہ یہ اپنے والدین کی پانچویں اولاد ہونے کے ساتھ ساتھ بیٹی بھی تھی ویسے بھی ہر سال ڈیڑھ سال بعد ایک نیا مہمان بچہ ان کے گھر آ جاتا تھا۔ وہ اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ وہ گوشت کی بوٹیاں مردوں کے لیے اور گھر کی لڑکیوں کے لیے آلو اور شوربا رکھتی ہیں۔ ان کے نانا وکیل ہونے کے باوجود لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھے اس لیے ان کی والدہ نے بچپن میں قرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ ساتھ "بہشتی زیور" جیسی جاگیردارانہ نظام کے لیے لکھی گئی کتاب پڑھائی تاکہ لڑکی بڑی ہو کر بھائی، باپ اور شوہر کی

فرمانبردار ہوں۔ علی گڑھ کالج میں بھی یہ صنفی امتیاز جوں کا توں برقرار رکھا چھٹیوں کے بعد لڑکوں کے آنے کا خاص اہتمام کیا جاتا جبکہ لڑکیوں کو صرف قرآن پاک اور بہشتی زیور پڑھانے پر افتادہ کیا جاتا جس کا ملال ان کی والدہ کے اندر بھی تھا اس لیے وہ اپنی بیٹیوں کو اعلی تعلیم دلوانے کے حق میں تھی۔ ان کی والدہ کی جہاں پر پہلی شادی تیرہ سال کی عمر میں ہوئی وہاں پہلی اولاد بیٹی ہونے کی وجہ سے شوہر نے طلاق دے دی۔ دوسری جگہ شادی ہونے کی صورت میں سوت کی تین جوان بیٹیاں دیکھنی پڑیں۔ یہ تینوں ایک ماں کی اولاد نہیں تھیں۔ والدین میں ناراضی کی بڑی وجہ ان کے مزاج میں اختلافات تھے جس کا حل ان کی والدہ کو مذہبی وظائف میں ہی نظر آتا تھا جب بھی ان کے والد بگڑتے ان کی والدہ تسبیحات کا ورد کرتی، چینی پڑھ کر دیتی کہیں یہ موصوف بھی طلاق کا تحفہ ہاتھ میں نہ تھما دیں۔ اپنے ماں باپ میں ناراضی کی صورت میں مذہبی لحاظ سے رویوں میں بہت فرق پایا جاتا تھا جس کا ذکر کشور ناہید ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"ابا کی ناراضگی کے دنوں میں اماں کالا مرغا منگایا کرتی تھیں اور ایک بی بی آکر یہ مرغ لے جاتی تھیں اور جو ابا میں پڑھی ہوئی چینی اماں کو دے جاتی تھیں۔ جتنی اماں کی نمازیں بڑھتی گئیں۔ تسبیحیں اور دعائیں طول پکڑتی گئیں۔ اتنا ہی ابا جی لاپرواہ ہوتے گئے۔"(۱۲۴)

کشور ناہید کے زمانہ طالب علمی کے دنوں میں ریڈیو بہت شوق سے سنا جاتا تھا۔ اکثر لڑکیوں کو ریڈیو سننے پر ان کے والد اور بھائی سزا بھی دیتے تھے۔ ان کے گھر میں ریڈیو سننے پر پابندی نہ تھی۔ اس زمانے میں سوہنی اور حمید کی ہنسی اور آواز بہت متاثر کن تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ان کے ہمسایے بھی ہیں ان کے بہن بھائی بھی ریڈیو کے شیدائی تھے لہذا ان کی والدہ نے بچوں کی فرمائش پر گھر کھانے پر مدعو کیا۔ انہوں نے کشور ناہید کی آواز سن کر ریڈیو پروگرام میں بطور میزبان کام کرنے کی پیش کش کی جو ان کی والدہ کو ناگوار گزری، اور کہنے لگی اب سید زادی کی آواز دنیا بھر میں گونجے گی جس گھرانے کی بچیوں کی آواز دیوان خانے میں نہیں سنی جا سکتی تھی۔ یہ لڑکی خاندان کی ناک کٹوائے گی۔

جب کشور ناہید کو کالج میں مشاعرہ جیتنے پر کپ ملا تو وہ کپ ساتھ لے کر گھر لے آئی کپ کو دیکھتے ہی گھر والوں نے شور مچانا شروع کیا۔ انہوں نے کشور کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے خاندان کی عزت خاک میں ملانے کا کہا وہ کہنی لگی: "آ گئی خاندان بھر کا نام اچھال کر، مجھے پتہ ہوتا تو ایسی اٹھے گی تو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔"(۱۲۵)

شادی کے بعد گھریلو اور دفتری ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھنے سے مائیگرین ہونے لگا جس سے مصنفہ کو الٹیاں آنے لگیں۔ ڈاکٹر نے یہ حالت دیکھ کر گلوکوز کی ڈراپ لگائیں جو کئی کئی دنوں تک جاری رہیں۔ ۱۹۸۳ء میں سات یونی ورسٹیوں میں شاعری کے موضوع پر لیکچرز دینے گئی تو ان کی طبیعت ناساز ہو گی کیوں کہ ان کو پیریڈز کے علاوہ بھی خون رستا رہتا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو ہوموگلوبن صرف سات فی صدرہ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کل آپ کا آپریشن ہے

یوٹرس نکالی جائے گی بائیوپسی کا رزلٹ ڈاکٹرز نے نہیں بتایا۔ مصنفہ کے بار بار اصرار پر ڈاکٹر نے کہا: "جسم کی جو چیز پوری طرح استعمال نہیں کی جاتی وہ احتجاج کرتی ہے یہ تمہاری یوٹریس کا احتجاج تھا۔"[۱۲۶]

دوسروں کے دکھوں پر رونے والی نے اپنے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں کہ اس کے اندر بھی دکھ پل رہے ہیں۔ ان ہی دنوں کشور ناہید نے اپنی نظم Fare well to uterous لکھی ان ہی دنوں عورتوں کی کانفرنس ہو رہی تھی جہاں پر کشور ناہید کی ڈیوٹی تھی بستر پر لیٹے لیٹے اس کانفرنس کی تفصیلات، اور فنڈز دینے والوں کی فہرست بنا رہی تھی، اس کام میں ڈاکٹر انیس ہارون، ش۔ فرخ، اور علی امام کی بھی معاونت حاصل رہی۔

عورت کی زندگی میں جسمانی طور پر دو مشکل مراحل آتے ہیں۔ پہلا پیریڈز جب شروع ہوں دوسرا جب مینو باز۔ پہلے مرحلے میں بے پناہ درد اور گھر والوں کی طرف سے حکم صادر ہوتا ہے کہ گھر کے مردوں کو اس بات کا علم نہ ہو۔ دوسرا مرحلہ جب پیریڈز جب ختم ہوتے ہیں تو مینوپاز شروع ہوتا ہے تو اس کو ہاٹ فلیشز آتے ہیں خواتین کی داڑھی، مونچھیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہارمونز کی تبدیلی کی وجہ سے عورتیں انجکشن اور کریمیں استعمال کرتی ہیں۔ ہر قسم کی عورت کو مرد اپنی تھرڈ کلاس سیاست کا نشانہ بناتے ہیں۔ مصنفہ کے ساتھ بھی کچھ ادیبوں نے ایسا ہی کیا خود خط لکھ کر میز کے نیچے رکھ کر کہا کہ یہ مجھے کشور ناہید نے لکھا ہے۔ بیالیس سال کی عمر میں مصنفہ جب بیوہ ہوئی تو گھر میں کسی کو بھی اس کی تنہائی کا خیال نہ تھا کسی نے بھی دوسرے نکاح کا نام نہ لیا۔

کشور ناہید کے مطابق عورت حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اس لیے وہ ہمیشہ مرد کی محتاج رہتی ہے اسلامی تعلیمات کے مطابق عورت اپنے شوہر کو مجازی خدا سمجھے اور اس کی تابع داری کرے ان حالات سے نجات پانے والی عورت سزا کی مستحق ہے وہ اپنے دکھ کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر عورت کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتی ہے۔ گھریلو عورت کے علاوہ طوائف کا بھی معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا۔ جس کی قیمت دس روپے سے لے کر سو روپے تک لگائی جاتی تھی۔ کبھی وہ کنزیں منتخب ہو کر داد عش وصول کرتیں۔ ساری رات ہوس کے مارے مردوں کی جنسی ضرورت پوری کرتیں اور دن کو ٹوٹی چارپائی پر ٹوٹے بدن لے کر پڑی رہتیں۔ ان کی ایک چارپائی جتنے کمرے میں میلے پردے ہوتے۔ کچھ جنسی بیماریوں میں مر جاتیں تو کبھی تھوکتے ہوئے۔ طوائف بنی کا رواج عالم گیر ہے جس میں ان کو پیش کرنے کا انداز مختلف تھا مگر کام وہی لیا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں کشور ناہید لکھتی ہیں: "فلپائن اور تھائی لینڈ میں تو قومی آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ ہی لڑکیاں ہیں جو زیادہ سے زیادہ شراب اور رات کے ٹھیکے کرواتی ہیں۔"[۱۲۷]

گاؤں میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھنا لکھنا اس لیے نہیں سکھایا جاتا کہ کہیں اپنے عاشقوں کو خط نہ لکھنے شروع کر دیں۔ لڑکیوں کا گھر سے باہر جانا ممنوع تھا۔ خوش شکل لڑکی کے ساتھ نمبر دار سے لے کر چوہدری تک کی خواہش

ہوتی کہ اس سے تعلقات بنائے جائیں انکار کی صورت میں لڑکی کو بد کردار قرار دیا جاتا۔ ایک اور صورت یہ تھی کہ آدھی تنخواہ کلرک کو دے سکول ہی نہ جائے تو بہتر ہے جبکہ دوسری طرف معمولی شکل وصورت کی لڑکی گھر کا کام کرتی رہتی۔ آج کل کے ترقی یافتہ دور میں بھی جہیز کم لانے پر بہوئیں پیٹرول چھڑک کر جلائی جاتی ہیں۔ ترقی مشینوں سے نہیں بلکہ ذہنی ارتقا کی صورت میں آتی ہے۔ ٹرانس جینڈر کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ بیوہ کے ساتھ برا سلوک صرف انڈیا ہی نہیں بلکہ اب بھی اکثر ممالک میں کیا ہے ستی کی رسم کے ختم ہونے کے باوجود ہو گئی اب بھی ان کا جینا حرام کیا جاتا ہے۔ مصر میں بیوؤں کو ایک الگ شہر میں رکھا جاتا ہے جہاں پر ان کے بال کاٹ دیئے جاتے ہیں تاکہ ان کی دوسری شادی نہ ہو سکے۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دشمنیاں ختم کرنے کے لیے بیٹیاں دے دی جاتی ہیں۔ اکیلے گھر سے باہر جانے پر کوڑے مارے جاتے ہیں۔

۱۹۷۱ء کی جنگ میں مصنفہ کی ڈیوٹی مشرقی پاکستان میں لگائی گئی سرکاری افسروں کے حق میں کتابچہ لکھیں وہاں نہ جاتی تو ادھر کی صورتحال سے واقف نہ ہوتی۔ دریائے گنگا کے کنارے کیمپ لگا تھا جہاں پر عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ جن کے ساتھ بڑے افسروں نے زیادتی کی تھی ان بے کس عورتوں کی حالت کو بیان کرتی ہوئے لکھتی ہیں:

> ”کیا میں انہیں عورتیں کہوں۔ مشکل سے تیرہ سے پندرہ سال کی پتلی پتلی لڑکیاں جن کی ابھی چھاتیاں بھی سانس لینے نہیں پائی تھیں مگر ان کے پیٹ چھٹے یا ساتویں مہینے کی گواہی دے رہے تھے۔“(۱۲۸)

ان کے گھر والوں کو غدار اور سازشی کہہ کر مار دیا گیا۔ ان کی نسلیں ختم کرنے کے لیے ان کے ساتھ غداری کی گئی۔ اس جنگ کے بعد آنے والی آمریت زدہ ضیاء حکومت نے چادر اور چار دیواری کا نام لے کر عورتوں کے گرد گھیر تنگ کر دیا۔ زنا اور زنا بالجبر میں کوئی فرق نہ رہا۔ اسی مد میں آئی ہوئی ایک اندھی لڑکی صفیہ بی بی تھی جس کے ساتھ افسروں نے زنا کیا اور حمل ٹھہر جانے کی صورت میں سزا صرف اس نابینا عورت کو دی۔ ۱۹۹۳ء میں باپوں نے اپنی بیٹیوں کے خلاف زنا کے مقدمات درج کروائے تاکہ ان کو وراثت میں حصہ نہ دینا پڑے اور وہ رسوائی دی کہ ڈھول گلے میں لٹکا کر کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ پولیس نے ان عورتوں کی ٹی وی پر تشہیر کی اور ان کے چہروں پر تھپڑ مارے۔ استحصالی رویوں کی انتہا یہ کہ ایک طرف ساٹھ سالہ شاہ بانو کے نان نفقے کا کیس واپس لیا گیا تو دوسری طرف مردوں کو چار شادیاں کرنے پر حوصلہ افزائی کی رہی تھی۔ عرب ممالک میں یہ شادیاں چار سے بھی زیادہ ہو گئی ہیں۔ جس کا تذکرہ کشور ناہید ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"ہیر ڈ کے سٹور پر آج سے پچاس سال پہلے ایک عربی آیا سیکشن تھا انڈر گارمنٹس کا، پوچھا کون پہنتا ہے؟ سیلز مین نے اسے پہننے کے انداز میں بتایا کہ خواتین پہنتی ہیں، بولا "یہ سب پیک کر دو" سیلز میں بولا "سر یہ مختلف سائز کے ہیں" جوابا کہا: کوئی بات نہیں میری بیویاں بھی مختلف سائزیز کی ہیں۔"(۱۲۹)

ناانصافی صرف غریب طبقے میں ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے معتبر اور نامور گھرانوں میں بھی ہوتی ہے جیسے دنیا کی خوب صورت خاتون لیڈی ڈیانا کو جب طلاق ہوئی اور کومیلا پار کر جیسی عام خاتون سے شادی ہوئی وہ اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے طنزا کرنے لگی چارلس نے تمھیں دو بچے دے دیئے ہیں ان کے ساتھ مصروف رہو وہ لیڈی ڈیانا غسل خانے میں جا کر رونے لگی طلاق کے ایک سال بعد اس نے موت کو گلے لگالیا۔ ڈیانا کے دکھ کو بیان کرتے ہوئے کشور ناہید لکھتی ہیں: "ساری شام ہم نے ڈیانا کی زندگی اور موت کی تفصیلات پر کبھی ہنستے اور روتے گزار دی۔"(۱۳۰)

اکثر اچھے رشتے نہ آنے کی وجہ غربت ہوتی ہے دوبئی میں ان پڑھ لڑکوں کی شادی بی۔اے پاس لڑکیوں سے طے ہوتی ہے جن میں جوڑے اور زیورے دونوں نقلی ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ ان کو انکے خوابوں کا شہزادہ مل گیا۔ وہ کچھ عرصے بعد امریکہ یا لندن سے واپس جاتا ہے تو سسرالی لڑکی کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور ماں بیٹا مل کر پیٹرول چھڑک کر لڑکی کو مار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں لڑکی نے خود آگ لگائی ہے۔ بہو کو زیادہ لڑکیاں ہونے کی صورت میں بھی سسرال والے سارا قصور بہو پر ڈال دیتے ہیں۔ کئی بیویوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں اگر اس دفعہ لڑکی پیدا ہوئی تو تمھیں ماں باپ کے گھر چھوڑ آئیں گئے۔ معاشرے میں مرد مختلف حربوں سے لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر زنا کروایا جاتا ہے۔ لڑکیاں حمل ٹھہر جانے کی صورت میں حمل ضائع کرواتی ہیں یا پھر ان بچوں کو معاشرے کے ڈر سے کچرے اور نالیوں میں پھینک دیتی ہیں۔ جہاں سے عبد الستار ایدھی جیسے انسان دوست انہیں اٹھا کر زندگی اور نام بخشتے ہیں۔ کشور ناہید سماج کی بے حسی کو بیان کرتے لکھتی ہیں کہ لوگ با آواز بلند ایدھی صاحب کو طعنے دیتے ہوئے کہتے ہیں: "یہ ایدھی تو جہنم میں جائے گا، یہ حرامی بچے پال رہا ہے، ہماری اگلی نسل اس کے یتیم خانے سے نکلے گی۔"(۱۳۱)

طاہرہ بھی کشور ناہید کی طرح این۔ایس۔ایف میں تھی وہ ہندوستان میں اسکوٹر چلاتی تھی۔ ایک بار اس نے کشور ناہید کے کسی دوست کا اسکوٹر چلایا اور وہ پیچھے بیٹھی تھی۔ ان کی فوراً ڈین کے آفس میں حاضری ہوگئی اور سرزنش ہوئی کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے کام نہیں کرنے چاہیے۔ توبہ کرلی کہ آئندہ سے اسکوٹر نہیں چلائیں گے۔ اس دور جدید کا المیہ یہ ہے یہاں پر جوان لڑکیوں کے ساتھ ساتھ کم عمر بچیوں اور بچوں کو بھی زنا اور بد فعلی کا نشانہ بنایا جاتا

ہے۔دو سال کی بچی کے ساتھ بد فعلی کر کے گلا گھونٹ کے مار دینا عام بات ہو چکی ہے۔ چھوٹے بچوں کو بڑی ڈھٹائی سے استعمال کر کے ان کی لاشوں کو مسجد کی چھت پر ڈال دیا جاتا ہے۔

تخلیقی کام کرنا ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کے کھوئے جانے پر افسوس کیا جاتا ہے کشور ناہید کے خیال میں اگر مرد تخلیق کار لکھنا چھوڑ دے تو سب افسوس کرتے ہیں جب کہ عورت لکھاری کے نہ لکھنے پر اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہمارے بہت سے تخلیق کار اپنی بیویوں کو لکھنے سے منع ہی نہیں کرتے بلکہ بچوں کی تربیت کا سبق بھی یاد دلاتے ہیں۔ ان لکھنے والیوں میں جارج ایلیٹ، جین آسٹن، ورجینا وولف اور سائمن دی بوا وشامل ہیں۔ لکھنا لکھانا بھی منہ چھپانے کے لائق عیب سمجھا جاتا ہے۔ لکھنے والیوں کی تحریروں کو اعلیٰ تو کبھی بھی نہیں سمجھا گیا کشور ناہید صرف مشرقی عورت کا نوحہ ہی نہیں لکھتی بلکہ مغربی عورت کی حالت زار پر بھی آنسو بہتی نظر آتی ہے۔

معاشرتی روایات کے ساتھ ساتھ ہر مذہب نے بھی مرد کو فوقیت دی کیوں کہ ہر مذہب مرد کا لایا ہوا ہے۔ ان کی تعلیمات کی تشریح و تفسیر بھی مردوں نے ہی لکھی ہیں۔ عورت کے بارے میں مرد کی رائے قانون اور حکم خداوندی کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ یہ سب حالات ایک سازش کے ذریعے تشکیل دیئے جا رہے ہیں۔ عورت کو ایک سیاست سے منسوب کیا جا رہا ہے اس لیے کشور ناہید سوالیہ انداز میں پوچھ رہی ہیں:"

> عورت تو ہے کم درجہ۔۔۔۔۔ورنہ عورت خدا نہ ہوتی، پیغمبر ہوتی، مرد کے برابر ہوتی۔۔۔۔۔اس لیے عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔کون کہہ رہا ہے۔۔۔۔کون فیصلہ صادر کر رہا ہے۔"(۱۳۲)

محترمہ فاطمہ جناح اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو کشور ناہید بڑی جرات سے بے نقاب کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کی آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔ وہ ایوب خان پر بہت معتوب تھیں کہ اس نے ملک تباہ کر دیا۔ محترمہ فاطمہ جناح کو ہرانے کے لیے صدر ایوب نے مذہب کو استعمال کیا۔ انہوں نے پیر دیول شریف کو خرید کر عورت کی سربراہی کے خلاف فتویٰ دلوایا جبکہ جماعت اسلامی محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ تھی اس جماعت اسلامی نے ضیاء الحق کے زمانے میں عورت کی حکومت کا الٹا فتویٰ دیا تاکہ بے نظیر اور نصرت بھٹو کا راستہ روکا جا سکے۔ ضیاء الحق کو بے نظیر اور نصرت بھٹو سے بہت خوف تھا اس لیے مولوی حضرات نے راستہ روکا اور فتویٰ دیا کہ کوئی عورت جج یا وزیر اعظم نہیں بن سکتی۔ ضیا ء الحق نے ایک طرف مذہبی اقلیتوں اور دوسری طرف عورتوں کو دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ اسی طرح لڑکیوں کا حق

مارنے کے لیے فارن سروسز میں ان کو نوکری نہیں دی جاتی تھیں۔ وہ صرف ریسرچ آفیسر بن سکتی تھیں۔ ضیاء الحق نے ریفرنڈم میں بھی مذہبی کارڈ کھیلا اور لوگوں کو کہا کیا تم کلمہ طیبہ پر یقین رکھتے ہو سب نے اثبات میں جواب دیا پھر کہا چلو میں تمہارا بادشاہ ہوں۔ یوں ریفرنڈم کروایا۔ ماہ واری کے دن قریب آجائیں تو عورتوں کو غصہ زیادہ آتا ہے جس کو ڈاکٹر پری منسٹوریل کہتے ہیں جو ہارمون میں تبدیلی کی وجہ سے ہوتے ہیں، جس میں کوئی دوائی بھی لی جاسکتی ہے، لیکن ماہ واری اور حمل کا بہانہ بنا کر کسی بڑی سیٹ / عہدے پر عورت کو نہ آنے دینا زیادتی ہے۔ مذہب کا سہارا لے کر ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس جیسا بدنام زمانہ قانون بنایا۔ جس میں زنا اور زنا بالجبر میں کوئی فرق نہ رکھا۔ یعنی مظلوم خود کو بے گناہ ثابت کرے۔ سنگسار اور چوری کے لیے ہاتھ پاؤں کاٹنا اور بہت سی چیزیں اسلام کے نام پر تھوپ دیں جیسا مخصوص مضامین میں داخلہ دینے اور کھیلوں میں حصہ لینے پر پابندی عائد کی گئی۔ عورتوں کے باہر اور پبلک لائف میں شامل ہونے کے خلاف فتوی دیا۔

عورت کو مارنے اور ظلم کرنے والے قریبی رشتے دار ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں اس فرسودہ سوچ سے نکلنے کی ضرورت ہے کہ عورت صرف ماں، بیٹی، بہن اور بیوی ہی نہیں بلکہ انسان بھی ہے جس کو ایک عام شہری کے برابر حقوق دینے چاہیں۔ مردوں کی طرح عورت کے بھی بہت سے خاندانی رشتے ہوتے ہیں۔ تشدد کا شکار صرف نچلے طبقے کی عورت ہی نہیں ہوتی بلکہ کلچرڈ، تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت گھرانوں کی خواتین بھی استحصال کا شکار ہوتی ہیں جہاں پر ظلم کی انتہا ہوتی ہے۔ غریب کوارٹر میں پٹنے والی عورت کی آواز باہر آتی ہے مگر بنگلوں میں یہ آواز گھٹ جاتی ہے۔ عزت و عصمت کے نام پر عورت بہت کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

۳۔ عورت اور مزاحمتی رویے:

مزاحمت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "روکنے" کے ہیں۔ مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ، رویے یا طریق کار کو کہا جاتا ہے جو کسی ناانصافی، ظلم، تشدد، بربریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ کسی ظلم، ناانصافی کو برداشت نہ کرنے کا نام مزاحمت ہے۔ مزاحمت کی دو اقسام ہیں۔ انفرادی مزاحمت اور اجتماعی مزاحمت۔ انفرادی اور دیرپا مزاحمت کو تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔ اجتماعی مزاحمت کے اغراض و مقاصد واضح ہوتے ہیں۔ اجتماعی مزاحمت جیسے انقلاب فرانس اور انقلاب روس ۱۹۱۷ء وغیرہ۔ انفرادی مزاحمت میں فرد اپنے حقوق نہ ملنے پر مختلف رد عمل کا مظاہر کرتا ہے۔ یہ نظریہ کسی فکر یا نظام کو قبول کرنے سے انکار پر مبنی نظریہ ہو سکتا ہے اور انکار کرنے والی شخصیت

محکوم، ماتحت اور مجبور ہوتی ہے یہ مزاحمت طاقت ور اور کمزور کے خلاف ہوتی ہے اس لیے ڈاکٹر قاسم یعقوب اپنی کتاب "لفظ اور تنقید معنی میں "مزاحمت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ طے شدہ سماجی رویوں، نظام عدل وعقائد، رسم ورواج اور رائج قدروں کے خلاف ہے تخلیق کار از سرنو معاشرے کی تخلیق کرتا ہے، فرسودہ اور بانجھ فکری روایات کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔"(۱۳۳)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے بقول مزاحمت خطرے میں گِری اور ذلت والی زندگی جینے سے انکار کا نام ہے۔ مزاحمت کی کئی شکلیں ہیں ثقافتی، سیاسی، مذہبی اور ادبی۔ اس کے مختلف اطراف اور پیرائے ہیں۔ ہر طبقہ مزاحمت کے لیے الگ پیرائے کا انتخاب کرتا ہے مزاحمت طاقت وروں سے یہ تسلیم کرواتی ہے کہ آزادی ہر فرد کا حق ہے۔ مقتدرہ قوتیں مزاحمت کو محدود کرنا چاہتی ہیں۔ اسی طرح عورت پر کی جانے والی ناانصافی کے خلاف مزاحمت انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے کی گئی۔ عورت نے جب بھی اپنے اوپر ہونے ظلم کے خلاف مزاحمت کی تو اس کو صرف مرد کے خلاف ہونے سے موسوم کیا جاتا ہے جب کہ عورت کی مزاحمت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اس مخالفت کا تعلق سماجی ڈھانچے سے ہے اس لیے عورت کی مزاحمت کے بارے میں روبینہ سہگل وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"عورتوں کی مزاحمت صرف کسی انفرادی مرد کے خلاف نہیں ہوتی، وہ ایک پورے نظریاتی، ثقافتی، تہذیبی، معاشی، اور سیاسی نظام کے خلاف ہوتی ہے جس کا شکار مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ لہذا اس نظام کا جدید دور میں تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو عورتوں اور مردوں میں اس قدر کشیدگی پیدا کرتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مدد گار بننے کے بجائے ایک دوسرے کے حریف اور دشمن بن جاتے ہیں۔"(۱۳۴)

مزاحمت کی تاریخ بھی جبر کی تاریخ کی طرح قدیم ہے ہر انسان پیدائشی طور پر اپنے اندر مزاحمت اور جارحیت کا جذبہ لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر غم وغصہ اور انتقام کے جذبات ہوتے ہیں۔ معاشرہ عورت کی جنسی قوت سے خوف زدہ ہوتا ہے اس لیے اس کی جنسی صلاحیت کو مردوں کے مقابلے میں دبایا اور کمزور کیا جاتا ہے۔ اسلام میں عورت کو فتنہ اسی پس منظر کے تحت کہا گیا ہے۔ عورت کی جنسی صلاحیت کے بے باک استعمال سے معاشرہ منتشر ہوتا ہے۔ مرد کو باپ ہونے کا یقین اس وقت آتا ہے جب اس کو پتا ہو اس کی بیوی کے کسی اور مرد کے ساتھ جسمانی اور جنسی تعلقات نہیں ہیں۔ اس لیے وہ عورت پر چادر اور چار دیواری کی پابندی عائد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں پر رسم ورواج اور روایتوں کے مہرے لگا کر اس کی جنسی قوت کو قابو میں

رکھا جاتا ہے۔ عورت مسلسل قربانیوں اور لگاتار ضبط سے ذہنی امراض کا شکار بھی ہو جاتی ہے۔ احساس کمتری، بے بسی اس کی ذات اور شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ کسی واقعے یا حادثے سے جنم لیتی ہے۔ جیسے ارسطو کی وفات پر رومی بادشاہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا، تعلیمی ادارے بند کر دیئے۔ مزاحمتی رویے زیادہ تر تیسری دنیا کے ممالک میں دیکھنے کو ملتے ہیں، جہاں پر لوگوں کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی حقوق سلب کیے جاتے ہیں مزاحمت ہی بغاوت اور انقلاب لانے کا باعث بنتی ہے۔ انقلاب دنیا میں پہلی مرتبہ مادی نظریات پر آیا۔ معاشی جبر کے علاوہ مزاحمت انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ہو رہی ہے نفرت جب بغاوت کا روپ اختیار کرتی ہے تب بھی مزاحمت جنم لیتی ہے۔ مرد عورت سے جسمانی لحاظ سے طاقت ور ہوتا ہے اس لیے عورت کا استحصال کرتا ہے۔ مشرقی معاشروں میں بیٹے کی پیدائش پر خوشی اور بیٹی کی پیدائش پر سوگ منایا جاتا ہے۔ لڑکیوں پر سماج، معاشرے اور گھر کی طرف سے بے جا پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ گھروں میں مالی تنگ دستی بھی عورت پر گھریلو تشدد کا باعث بنتی ہے۔ عورت کے خود مختار ہونے کا مطلب مرد برتری کا اظہار کر نا لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ روایتی مرد بن کر عورت پر تشدد کرتا ہے۔ اس کو پاؤں کی جوتی جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا۔ دوسری طرف مذہبی تشریحات میں بھی مذہبی انتہاء پسندی کا مظاہرہ عورتوں کے حقوق محدود کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں: ”مرد کے تسلط نے عورت پر کیا اثرات ڈالے اور عورت نے ان اختیارات کے خلاف مزاحمت کی۔“(۱۳۵)

مزاحمت سیاسی، تاریخی۔ اقداری بیانیوں سے انکار کا بھی اعلان کرتی ہے فطرت کے اصولوں کے خلاف چلنا بھی مزاحمت ہے مگر اس میں جیت ہمیشہ فطرت کی ہوتی ہے۔ آج کل انسانی زندگی میں الیکٹرونک، پرنٹ اور سوشل میڈیا کا بڑا دخل ہے۔ جس میں بہت سے عناصر انسان کے استحصال کا باعث بنتے ہوئے مزاحمت کی وجہ بنتے ہیں۔ ادب معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے مزاحمتی ادب معاشرے کے جبر و تشدد، ظلم اور ناانصافی سے نجات دلانے کے لیے جنگ پر آمادہ کرتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ظلم و بربریت کی جنگ میں سب سے زیادہ استحصال بھی عورت کا ہی ہوتا ہے۔ دہلی کی تباہی ہو یا ہجرت کے واقعات سب میں کہیں عورتوں کی عزت کو بچانے کے لیے قتل کر دیا جاتا ہے یا پھر مفتوحہ علاقوں میں عورتوں کا لین دین کر کے مفاہمت کے راستے ہموار کیے گئے۔ ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیوں کہ ادیب اپنے گرد و پیش سے کنفرم نہیں کر پاتا اسی کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے ایک طرح سے سارا ادب مزاحمتی ادب ہے اور ہر ادیب باغی ہے۔ ایسی ہی مزاحمت کا اظہار خواتین نے اپنی تخلیقات میں ہے جن میں سے آپ بیتی ایک مستند حوالہ ہے۔ خواتین نے اپنی آپ بیتیوں کے اندر نجی، ذاتی اور معاشرتی زندگی میں ہونے والے مظالم کو روکنے کے لیے مزاحمت کا سہارا لیا۔

شہر بانو کی ساس نے جب شہر بانو سے اپنے شوہر کی پھانسی اور برے حالات کا بدلہ کم تر اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے لینا شروع کیا اور جینا محال کر دیا تو شہر بانو نے بھی جوابی طور پر تکرار شروع کر دیا۔ اس کے بیمار ہونے پر خوب دل لگا کر خدمت کی صحت یاب ہونے کے بعد پھر وہی روکھے پن اور ذکاوت کا رویہ اپنا لیا۔ اپنے حالات سے مجبور ہو کر وہ لکھتی ہیں: "الہی کیا کروں۔ خاوند ہے تو اس کا عجب ڈھنگ ہے کہ کچھ پروا نہیں۔ ساس ہے تو ان کا یہ رنگ ہے کہ گویا خون کی پیاسی۔"(۱۳۶) ان کی ساس نے شہر بانو کا جینا حرام کر دیا۔ بات بات پر بگڑ جاتی۔ ان کے رویے سے تنگ آ کر شہر بانو نے اپنی ساس کو دوٹوک جواب دینا شروع کر دیا۔ "ایک دن یاد نہیں کیا بات تھی۔ اس پر وہ بھبک کر بولیں ایسے کہ گویا ابھی کھا جائیں گی، تو بوا میں نے بھی ایسا پتھر توڑ جواب دیا کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔"(۱۳۷)

ہمارے معاشرے میں شادی کے بعد ساس بہو کا جھگڑا گھر کا سکون تباہ کر دیتا ہے اسی لیے ڈاکٹر خالد سہیل لکھتے ہیں: "اکٹھے خاندان میں ساس بہو کے جھگڑے اہم مثالیں ہیں۔"(۱۳۸) اپنی زندگی کا مشاہدہ کرتی ہے اور وہ خود کو بد قسمت قرار دیتی ہے کیوں کہ سب کی بد سلوکیوں نے اس کو زندگی سے بے زار کر دیا۔ وہ لکھتی ہیں:

"روز پیدائش سے لوگوں کو مجھ سے حسد شروع ہوا۔ غدر میں کیسی مصیبت اٹھائی، کیسی کیسی سختیاں سہیں، سسرال والوں نے کیا کیا بد سلوکیاں کیں خاوند نے یوں برباد کیا، اولاد سے یہ پھل ملا کہ ایک بھی زندہ نہ بچا، ایک ماں تھی سو اس نے یہ کیا کہ خون کی پیاسی ہو گئی۔ اگر چھری کو پائیں تو مجھ کو نہ پائیں۔"(۱۳۹)

قرۃ العین حیدر کا تعلق ایک روشن خیال گھرانے سے تھا ان کو مزاحمت گھٹی میں ملی ان کی والدہ کے مضامین پر گہری تنقید ہوتی جس کی وہ پرواہ نہ کرتی اور اپنے موقف پر ڈٹ جاتی ان کی اپنی زندگی میں آنے والی مخالفت کا سامنا بھی وہ بڑی بہادری سے کرتی اور اپنی والدہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی۔ وہ اپنی والدہ کی طرح فضول رسم ورواج، پردہ اور بدعت جیسی چیزوں کو ماننے سے انکار کرتی ہیں۔

قرۃ العین نے شادی میں دیئے گئے جہیز کے خلاف مزاحمت کی۔ ان کے خیال میں یہ رسم ایک بے کار اور فیوڈل روایت کی علامت ہے۔ ملازمت میں ناانصافیوں کی وجہ سے استعفی دے دیا جس میں صحافت اور پی۔ آئی۔ اے شامل ہے۔ شناخت اور حقوق نہ ملنے پر پاکستان چھوڑ کر انڈیا چلی گئیں۔ اس موقع پر شائستہ اکرام اللہ (جو پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی کی رکن اور سفیر بنی تھی) نے قرۃ العین حیدر کو خط میں لکھا: "تم چلی گئیں۔ ہم نے تمہاری قدر نہیں کی، تمہارے جانے کے بعد ہم ایک بیش قیمت چیز سے محروم ہو گئے۔"(۱۴۰)

قرۃ العین حیدر شاعرات اور شعرا پر گہرا طنز کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ شاعرات میں وہ کنک اور Mannerism نہیں ہوتے جو بعض شعرا کرام کا خاصہ ہیں۔وہ شراب نہیں پیتی۔زہرہ نگار نے ہمارے معاشرے کا عبوری دور کہا ہے جس میں مغرب والی آزادی یہاں آئے گی تو ہماری خواتین بھی ویسے ہی ترقی کریں گی جیسے وہ کر رہی ہیں۔ایک صحافی نے فوری طور پر منفی انداز اپناتے ہوئے کہا کیا وہ شراب،،سگریٹ اور چرس پیئیں گی یا آوارہ گردی کریں گی ان کی باتیں سن کر مصنفہ کو فوری طور پر مغربی شاعرہ ڈی لن طامس کی دوست اور پیرس کی بوہیمیا کی فنکارہ یاد آئیں جو اپنی تنہائی اور دکھ کو ختم کرنے کے لیے ماہر نفسیات کے پاس جاتی تھیں۔جیسے ان کا تخیل ،سوچ اور فن نعمت نہ ہوا بلکہ عذاب بن گیا کیوں کہ ہمارا معاشرہ عورت کو بے زبان دیکھنا چاہتا ہے۔

مصنفہ کا ادبی شہکار "آگ کا دریا" کا سراقہ عبداللہ حسین نے "اداس نسلیں" ناول کی صورت میں کیا اور مصنفہ کو قابل ذکر ناول نگار ماننے سے انکار کیا تو مصنفہ نے ان کے اس بیان پر مزاحمتی رویہ اپناتے ہوئے کہا کہ مجھے حیرانی ہے کہ "اداس نسلیں" میں متعدد ابواب ان کے افسانے "میرے بھی صنم خانے"، سفینہ غم"، "آگ کا دریا" اور "شیشے کے گھر" سے چرائے گئے ہیں یہاں تک کہ پورے پورے جملے اور پیراگراف تک وہی ہیں۔اس غیر اخلاقی حرکت پر سوائے خالد اختر کے کسی نقاد نے آواز نہیں اٹھائی کیا یہ صنفی تضاد نہیں ہے تو کیا ہے؟

صالحہ عابد حسین کے بچپن میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو بہت مارا وہ لہولہان ہو گئی۔محلے کے اس ظالم آدمی کا اثر صالحہ عابد حسین کے معصوم ذہن پر بھی پڑا۔اس نے مردوں کے عورتوں پر مظالم کے عنوان پر تقریر کی۔صفیہ جان اختر نثار جب بھی صالحہ عابد حسین سے ملی تھی وہ اپنے شوہر کی تعریف کر رہی تھی۔جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔صفیہ کینسر کی مریضہ تھی۔سخت بیماری کے دنوں میں بھی نوکری کر کے شوہر اور اپنے بچوں کی کفالت کرتی تھی۔دوسری طرف شوہر عیاش پسند اور عورتوں کا شوقین تھا۔وہ ان کی نئی اور پرانی محبوباؤں کی دلداری بھی کرتی تھی۔صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:"ایسی عورتیں ہی مردوں کا دماغ خراب کرتی ہیں جو ہر کمزوری کو نظر انداز کر کے اسے دیوتا بنا کر پوجیں۔"(۱۴۱)

۱۹۵۰ء میں ساجدہ زیدی کی بہنوں نے دوسری طالب علم لڑکیوں کے ساتھ مل کر کسی جلوس میں حصہ لیا،لاٹھیاں کھائیں اور گرفتار ہو گئیں صالحہ عابد حسین کی ایک پردے دار خالہ زاد بہن آلہ آباد میں بھوک ہڑتال کرنے والی لڑکیوں سے ملی۔وہاں سے سیدھی پنڈت نہرو کے پاس گئی اور ان کو کھری کھری سنائیں ان کی باتیں سن کر پنڈت نہرو بھی دنگ رہ گئے انہوں نے دردمندی سے سارا مسلہ سنا اور تین چار دنوں میں لڑکیوں کو رہا کر دیا۔

صالحہ عابد حسین عورتوں کے حقوق کی بڑی علمبر دار ہیں۔ انہوں نے عملی طور پر بھی عورتوں کی رہنمائی کی اور اپنے مضامین اور تحریروں میں خواتین کی حمایت کرتی رہیں۔ جب ۱۹۷۸ء میں شاہ بانو کو اس کے شوہر نے طلاق دی تو شاہ بانو کے پاس کوئی اور ذریعہ آمدن نہ تھا۔ اس نے اپنے اور اپنے بچوں کے نان نفقے کا دعویٰ عدالت میں دائر کیا۔ سات سال تک یہ کیس چلتا رہا آخر کار عدالت نے شاہ بانو کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ بہت سے مسلمانوں کے نزدیک یہ فیصلہ عائلی قوانین اور شرعی احکامات کے خلاف تھا۔ انہوں نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ ۱۹۸۶ء میں عدالت نے نان نفقے کے بارے میں ایک قانون نافذ کیا جو اس عدالتی فیصلے کی نفی کرتا تھا۔ صالحہ عابد حسین نے اس قانون کے خلاف مضامین لکھے اور تقریریں کیں۔ جب کہ یہ ان کی عمر کا آخری حصہ تھا۔ وہ تمام عمر عورتوں کے حامی مذاہب پر روشنی ڈالتی رہی۔

ملانی جی، چندھی، بہری اور بلا کی بد دماغ تھی۔ ان کی بد دماغی کی وجہ ان کے مرحوم شوہر کا تشدد تھی۔ ان کے مرحوم شوہر چارپائی سے باندھ کر بھیگی ہوئی رسی ان کی چمڑیا دھیڑا کرتے تھے اسی وجہ سے بڑھیا فی لفظ ایک دو تھپڑ رسید کرتی تھی بیس بائیس بچے ان کے پاس پڑھتے تھے سب کو مستقل چانٹے تھپڑ گھونسے مارتی تھی۔ وہ سب آیتیں پڑھ پڑھ کر ان کے مارنے کی دعائیں کرتے تھے انہوں نے کبھی کسی انسان سے ایسی شدید نفرت نہیں کی تھی۔ یہ سب مزاحمتی چیں کا نتیجہ ہیں۔ کیوں کہ ظلم جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں پر ہی روک دیا جائے تو دوسرے استحصال کا شکار نہیں ہوتے جیسے شوہر کا دفتر سے ڈانٹ سن کر بیوی کو مارنا۔

اعلابی کو پتا چلا کہ عصمت چغتائی شادی کے خلاف ہے تو انہوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ عصمت چغتائی نے کہا کہ وہ کسی انسان کے حکم کی تابع نہیں بن سکتی۔ میں نے زندگی بزرگوں کے جبر کے خلاف احتجاج کر کے گزاری ہے۔ انہیں اپنی راہ آپ بنانی ہے۔ ان کو مشرقی بیوی بننے کے خیال سے ہی گھن آتی تھی۔ ایک دفعہ ان کو نواب صاحب کی بہو بننے کا موقع ملا۔ نواب زادے ولایت میں زیر تعلیم ہیں نواب صاحب شادی کے بعد انہیں بھی انگلستان بلالیں گے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ بہت کچھ اپنے خاندان کے لیے کر سکتی ہیں۔ تم پھوپھی، بھتیجی راج کرو گی۔ عصمت چغتائی نے اس شادی سے انکار کر دیا اور وہاں سے واپس آگئی۔ عصمت چغتائی بچپن سے ہی حساس طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ کسی پر ظلم ہوتا برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ واقعہ کربلا میں چھ ماہ کے علی اصغر کی شہادت کا سن کر اس پر سوال اٹھایا کہ اسے کیوں مارا؟ بلی کے مینا کو کھا جانے پر واویلہ مچایا۔ وہ ناحق بات اپنی ماں کی بھی برداشت نہیں کرتی تھیں۔ بچپن سے ہی ذہن میں بیٹھا لیا کہ پڑھ لکھ کر اعلیٰ مقام حاصل کروں گی۔ وہ اس مقصد کے لیے بھائی کا سکول کا کام بھی کرتی تھی۔ ان کے دور میں عورتوں کے زیادہ پڑھ لکھ جانے کو معیوب سمجھا جاتا تھا انہوں

نے تہیہ کرر کھا تھا کہ وہ اس بات کو غلط ثابت کر کے رہے گی۔ وہ لکھتی ہیں: "پھر ایک اور بھوت سوار ہو گیا کہ سب کہتے ہیں تعلیم پا کر لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں میں یہ ثابت کرنے کی دھن میں لگی ہوں کہ یہ غلط ہے۔"(۱۴۲)

برصغیر میں تعلیم نسواں کے آغاز کے تحت شیخ محمد عبداللہ اور بی اماں نے بے لوث خدمات سرانجام دیں۔ عصمت چغتائی نے علی گڑھ مسلم سکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی۔ سب لڑکیاں کالج اور ہوسٹل کے ماحول سے مطمئن تھیں۔ کچھ شر پسند لوگوں نے کالج کے خلاف باتیں کرنا شروع کر دیں۔ "انگارے" کی اشاعت کے بعد ان باتوں نے طول پکڑا۔ سب لڑکیاں ڈر رہی تھیں کہ کالج بند ہو جائے گا اس موقع پر عصمت چغتائی نے ایک جذباتی قسم کا مضمون لکھا جس میں یہ کہا گیا کہ اگر کالج بند کیا گیا تو ان کی لاشیں ہی یہاں سے جائیں گی۔ کیا ان کے کالج کے چھ ہزار طالب علم اور اساتذہ کرام اس کالج کو بند ہونے دیں گئے؟ کیا وہ اس مشکل وقت میں ہماری مدد نہیں کریں گئے؟ شیخ محمد عبداللہ نے یہ مضمون علی گڑھ گزٹ میں شائع کروا دیا۔ اسی دن وہ مضمون پڑھ کر کالج کے لڑکوں نے مولانا احراری کی خوب پٹائی کی اور ان کے دفتر کو توڑ پھوڑ دیا۔ ان لڑکوں کی جو رشتے دار لڑکیاں کالج میں پڑھتیں تھیں ان کے ذریعے سب کا شکریہ ادا کیا گیا اور ہوسٹل میں خوب فتح کا جشن منایا گیا۔

عصمت چغتائی کو معاشرتی ناہمواریاں ہمیشہ ناپسند رہی ہیں۔ وہ جنسی تفریق کے خلاف ہیں۔ اس کو ان عورتوں پر غصہ آتا ہے جو پتی ورتا بن کر شوہروں کی شادیاں کرواتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

> "اگر بچے نہیں ہیں تو کسی غریب کے لے کر پال لیں۔ اگر شوہر کو بیوی پسند نہیں تو طلاق لے لیں۔ وہ لکھتی ہیں: "اگر عورت ایک مرد سے زیادہ شوہر نہیں رکھ سکتی تو مرد کو بھی ایک سے زیادہ عورت رکھنا حرام ہے۔"(۱۴۳)

"لحاف" پر مقدمہ چلنے کی صورت میں عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کو ایم۔ اسلم کے گھر قیام کرنا پڑا۔ انہوں نے عصمت چغتائی کے ساتھ اس فحش افسانہ لکھنے پر تکرار کیا۔ عصمت چغتائی نے بھی بے باکانہ انداز میں جوابات دیئے۔ ایم اسلم نے جو "گناہ کی راتیں" میں سیکس ایکٹ کی تفصیل بیان کی ہے وہ کیا جائزہ تھی ؟ انہوں نے اپنے مرد ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ عصمت چغتائی نے دوٹوک جواب دیا اگر ان کو اللہ تعالی نے مرد بنایا ہے تو ان کا کوئی دخل نہیں اسی طرح عصمت کے عورت بننے پر ان کا کوئی دخل نہیں۔ آزادی سے لکھنے کا حق سب کو ہے۔ اس کو کسی سے مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایم اسلم نے بار بار عصمت چغتائی کو مذہبی تعلیم کا طعنہ دیا تو عصمت چغتائی نے کہا کہ یہ تمام باتیں "بہشتی زیور" میں بھی کھل کر بیان کی گئی ہیں۔ تو ایم۔ اسلم لاجواب

ہوگئے۔انہوں نے عصمت چغتائی اور منٹو کو عدالت سے معافی مانگنے کا مشورہ دیا تو عصمت چغتائی نے انکار کر دیا اگر انہوں نے گناہ کیا ہے تو ان اس کی سزا ملنی چاہیے ایسے ان کا ضمیر ملامت کرے گا۔

پاپا میاں والد محترم رشید جہاں تو بچپن سے ہی ہندوستانی عورت کی زبوں حالی سے متاثر تھے وہ جموں کے ایک برہمن خاندان کے بیٹے تھے بچپن سے ہی بے انتہا حساس طبیعت کے مالک تھے محلہ میں کوئی مرد اپنی بیوی کو روزانہ شراب پی کر مارا کرتا تھا اس کی چیخیں پشیخ عبداللہ کی نیندیں حرم کر دیتی تھیں۔جان اختر نثار کی وفات پر ایک عورت نے کہا بیوہ کو بلاؤ اس کی چوڑیاں توڑو۔۔ عصمت چغتائی کو اس بات پر غصہ آگیا انہوں نے کہا عورت کو ہی کیوں کہا جاتا ہے فلاں کی بیوہ ہے مرد کے لیے کیوں نہیں کہتے فلاں کا رنڈوا ہے اور فوراجب وہ رنڈوا ہو تو کھینچ کر اس کی عینک اور گھڑی توڑ ڈالو۔یہ عصمت چغتائی کا نظریہ مساوات تھا۔ادا جعفری کا تعلق جس خاندان اور علاقے سے تھا وہاں پر قدامت پرستی، مذہبی احکام کی پابندی اور رسم ورواج کی پاسداری جیسی پابندیوں پر سختی سے عمل درآمد کیا جاتا تھا۔عورتوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔جہاں مرد عورت کی قسمت کا فیصلہ کرتے تھے۔عورت کی ذات پر مکمل اختیار بھی گھر کے مردوں کو حاصل تھا۔ایسے تعفن اور گھٹن زدہ ماحول میں لڑکیوں کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ادا جعفری کو بھی بچپن ہی سے ان پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔یہاں پر شادی کے بعد لڑکیوں کو رخصت کرنے کا رواج نہ تھا۔ادا جعفری کے والد مولوی بدر حسن اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جاسکے وہ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں کان پور میں مقیم تھے۔

ادا جعفری کی والدہ سال میں ایک دو بار ان کے پاس رہنے کے لیے چلی جاتی تھی۔اکثر ادا جعفری بھی اپنی والدہ کے ساتھ جاتیں جس کی یادیں مرتے دم تک زندہ رہیں۔ادا جعفری ابھی صرف تین سال کی تھی کہ ان کے والد محترم وفات پا گئے۔ان کی والدہ بیوہ ہونے کے بعد ہر وقت سفید چادر اوڑھے رکھتی تھی۔والد کی جدائی نے ادا جعفری پر گہرے منفی اثرات چھوڑے۔ان کے والد کی باتیں گھر میں ہوتی بھی تھی تو دوسری طرف بڑوں نے یہ کہ کر تسلی دی کہ وہ حکیم سے دوائی لینے گئے ہیں۔پانچ سال تک انتظار کرتی رہی۔انتظار کا یہ سفر بہت تکلیف دے تھا۔وہ لکھتی ہیں:"اس سانحے کے بعد مجھے کسی کھیل میں دل چسپی نہ رہی تھی۔بے حد خاموش 'گم سم' تنہا نشین ہوگئی تھی۔"(۱۴۴)

والد کی وفات کے تین ماہ بعد ادا جعفری کا ایک بھائی اس دنیا میں آیا۔کچھ عرصے بعد ادا جعفری کی والدہ کو اپنی چھوٹی بیٹی کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا۔انہوں نے اپنی توجہ بیٹی کی طرف مبذول کی۔ان کے پڑھنے لکھنے کا انتظام کیا۔وہ بچپن سے ہی اپنی مرحومیاں اور اداسیاں صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کی عادی ہو چکی تھی۔اور باقاعدگی سے ڈائری لکھتی تھی۔بڑی حویلی کے اوپر ایک کمرے میں کتابوں کی چھوٹی سی لائبریری تھی۔ادا جعفری وہاں سے

آسان آسان اردو کی کتابیں پڑھنے لگی۔ جس کتاب کی سمجھ نہ آتی اس کو دو سے تین بار پڑھتی تھی۔ اس جگہ کا گھر میں ذکر نہ کرتی تھی کہ کہیں منع نہ کر دیں۔ اس نے نو سال کی عمر میں شعر لکھنے شروع کر دیئے۔ اپنی امی کو وہ نظم دکھائی تو وہ بہت خوش ہوئی اور وہ نظم شائع بھی کروادی۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں لغت کے چند صفحات ملے تو ان کو زبانی یاد کر لیا۔ شعر لکھنے کے لیے زبان و بیان پر عبور حاصل کرنا لازمی ہے ادا جعفری کو اس کے لیے لغت کی ضرورت تھی۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے اس لغت تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ ایک دن ادا جعفری کے نانا ابو نے اس کی ذہانت کا امتحان لیا۔ اس سے لفظ ''تبخال'' کے معانی پوچھے تو ادا جعفری نے بتا دیئے تو انعام میں کشوری لغت ملی۔ اسی لائبریری کے اوپر ان کے نانا کی دوسری بیوی رہتی تھی دو بچے ہونے کے باوجود گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ اس گھٹن زدہ ماحول سے متنفر ہو کر بھاگ گئی تھی۔ شاید وہ اس علاقے کے رسم و رواج سے سمجھوتا نہ کر سکی اور شوہر کے گھر میں ایک اجنبی کی طرح رہنا اس کو راس نہ آیا۔ بڑی حویلی میں بہت سے خاندان اکھٹے رہتے تھے جن میں ادا جعفری کے ماموں لوگ بھی تھے۔ اس کے ماموں کی بیٹی ادا جعفری کی ہم عمر تھی جس پر اس کی ماں توجہ نہ دیتی تھی سارا دن گھر کی آرائش کے لیے تکیوں پر کڑھائی کرتی رہتی تھی۔ باپ نے باہر نوکری کر کے خاندان والوں کی حکم عدولی کی تھی بیٹی کی پڑھائی کا کہہ کر خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ زہرہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس تعفن زدہ ماحول کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے اس دنیائے فانی سے کنارہ کر گئی۔ ادا جعفری کے ساتھ بھی ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ بھی دم گھٹ کر مر چکی ہوتی۔ ماں نے اپنی گرم و نرم آغوش میں خاندان کی تلخ باتوں اور پابندیوں کو چھپا رکھا تھا۔ دوسری طرف کتاب دوستی نے بھی مسیحائی کی۔ اسی خاندان کا تیسرا کردار ادا جعفری کی خالہ کا تھا جن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر میں کنواری لڑکیوں کی طرح رہتی تھی۔ گھر کی آرائش، کھانا پکانا، ڈوپٹے رنگنا اور دوسرے گھر داری کے کام وہ کرتی تھی۔ اس سخت پابندیوں کی آڑ میں نہ کسی نے اس کے جذبات کی آواز سنی اور نہ اظہار کا موقع دیا۔ اس گھر کی نوکرانی رحمتی تھی۔ جس کو اس کا شوہر مارتا تھا۔ وہ شراب پیتا اور جوا کھیلتا تھا۔ جب پیسے ختم ہو جاتے رحمتی کو کہتا جاؤ کام کرو اور اسے خوب مارتا۔ ادا جعفری لکھتی ہیں: ''کبھی آنکھ پر نیل ہوتا کبھی منھ سوجا ہوا، کبھی ہاتھ پاؤں زخمی۔''(۱۴۵)

وہ کچھ دن کام کرتی پیسے جمع کر کے اپنے گھر واپس چلی جاتی تھی۔ تازہ زخموں پر اسے شوہر پر غصہ آتا کچھ دنوں بعد وہ پھر بچوں کی یاد سے تنگ آ کر واپس چلی جاتی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں ایک ادا جعفری کی ہم عمر تھی۔ ادا جعفری اکثر ان کے گھر بھی چلی جاتی تھی۔ بے جا پابندیوں والے ماحول میں اکثر عورتیں ذہنی مریض بن جاتی تھیں۔ جن کو آسیب کا سایہ سمجھ کر پیروں فقیروں کے پاس لے جایا جاتا تھا۔ کچھ خواتین اس ماحول سے نجات

پانے کے لیے مزارات کا رخ کرتیں تھیں جہاں لڑکیوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ ان کے لیے کہیں باہر جانے کی جگہ شادی بیاہ والے گھر تھے۔ ان کی زندگی ٹونک والے پھاٹک تک محدود ہو گئی تھی۔ مرنے کے بعد دفن بھی وہاں ہی ہوتی تھیں۔

ادا جعفری کہتی ہیں کہ یہ حال صرف ٹونک والے پھاٹک کا نہیں تھا بلکہ برصغیر کی تمام خواتین پر ایسے حالات گزرے ہیں۔ صرف زنداں کا طول و عرض مختلف تھا۔ جو خاندان اپنی نگاہوں میں جتنا زیادہ معتبر تھا خواتین پر اتنی ہی زیادہ پابندیاں تھیں۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے شادی اپنی مرضی سے کی ان کی والدہ نے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ مصنفہ نے صبح اٹھ کر سلام دعا کے بعد ایک لکھا ہوا پرچہ ماں کی طرف بڑھایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ماں نے جواب پڑھا اور آخر کار بیٹی کے فیصلے کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

نکاح کے وقت مولوی صاحب کے آگے مہر کی بات ہوئی تو وہ بہت برہم ہوئے اور کہا میں تو اختر کی شادی حمیدہ سے کرنے آیا ہوں۔ تم لوگ کیا لڑکی کو بیچ رہے ہو؟ بتاؤ تم لوگوں نے اس لڑکی کیا قیمت لگائی ہے کسی نے کہا جو بڑی بہن اور بہو کا مہر ہے مولوی عبد الحق نے چیک لکھ کر دے دیا۔ ان کی والدہ کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے چیک کے چار ٹکڑے کر کے مولوی عبد الحق کو واپس کر دیئے۔ مولوی عبد الحق کی طبیعت بہت بچکانہ تھی ایک دفعہ حمیدہ اختر حسین رائے پوری سو رہی تھی تو انہیں جاگنے کی خاطر حمیدہ اختر حسین رائے پوری کے اوپر موٹی موٹی کتابیں، میز اور ایک صندوق رکھ دیا۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری کو ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے بڑا زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو تمام چیزیں گرنے لگیں ان کے گرنے کی آواز سن کر مولوی عبد الحق نے کہا حمیدہ آپ کیا توڑ رہی ہیں؟ حمیدہ نے نہایت غصے میں کہا: "یہ جو آپ کتابیں، صندوقچہ، کرسی میرے اوپر لاد گئے ہیں ان کو گرا رہی ہوں۔ یہ کس قسم کا بیہودہ مذاق ہے سوتے ہوئے انسان کے ساتھ"(۱۴۶) مولوی عبد الحق کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں سے تنگ آکر حمیدہ اختر حسین نے غصے میں کہا: "ہمارے گھر میں کوئی دس بجے سے پہلے سو نہیں سکتا، کوئی دن کا کھانا نہیں کھا سکتا، شریفے کھا نہیں سکتا، اختر کہتے ہیں کتا نہیں آ سکتا۔ یہ ساری باتیں میرے لیے ہی ہیں۔"(۱۴۷)

جواہر لال جی کے پاس حمیدہ اختر حسین رائے کا پاس پورٹ حاصل کرنے کے سلسلے میں گئی تھی تو انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹی کے سامنے ان کی تعریف کی اور کہا حق یوں ہی نہیں ملتا اس کو حاصل کرنے کے لیے زور وزبردستی کرنی پڑتی ہے۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور کینسر بھی ہو گیا۔ سرجن حمید کے تلخ لہجے سے تنگ آکر انہوں نے ڈاکٹر کو شکایت لگائی اور کہا یہ سرجن نہیں بلکہ قصائی ہیں۔ سعیدہ بانو احمد نے جب گھر چھوڑ کر جانے کا ارادہ کیا تو ان کی بہن نے سب سے زیادہ مخالفت کی اور الجھ کر کہا: "آخر تم پہلے کیوں نہیں بولیں کہ تمہاری اپنے شوہر سے ناچاقی رہتی ہے، اب یکدم سے کیا ہو گیا اور دلی جانے کی کیا ضرورت ہے؟"(۱۴۸)

سعیدہ بانو احمد نے کہا کہ وہ آخری حد تک اپنا گھر بچانے کی کوشش کرتی رہی تا کہ لوگوں کی تنقید کا نشانہ نہ بن سکے۔ ان کے خیال میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو والہانہ محبت میں بھی دراڑ آجاتی ہے۔ جب نوکری شروع کی تو ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو گئے ایسے میں اپنے بیٹے، آیا اور خود ان کی اپنی جان بھی محفوظ نہ تھی۔ ایسی صورت میں بیٹے کو کہیں نہیں بھیجنا چاہتی تھی وہ لکھتی ہیں:

"نہیں سعید میرا بچہ نہیں جائے گا۔ اگر مرنا ہے تو میرے کلیجے سے لگ کر ہی مریں گے ہم دونوں۔ خانم کی جان کی میں ذمہ دار ہوں اور رہوں گی آخری دم تک۔"(۱۴۹)

حمیدہ سالم نے اپنی بہن صفیہ کو ایک باغی لڑکی کے طور پر متعارف کروایا جو والدین کو مزید دکھی نہ کرنے کے ڈر سے خاموش رہتی ہے۔ ان کے خطوط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ بے جا پابندیوں کو ٹھکرانے اور پرانی روایات کو توڑنے کی سکت رکھتی ہے۔ اسی جوان بہن نے جیل میں اپنے بھائی کو خط لکھا کہ شادی ہر لڑکے لڑکی کی فطری ضرورت ہے وہ بھی اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرتی ہے جس میں جنسی تقاضوں کو ثانوی اہمیت حاصل ہے ہر عورت کا حق ہے کہ اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ شوہر کی باتیں سن کر نفیس بانو شمع نے اپنے سسرال واپس نہ جانے کا ارادہ کیا مگر گھر والوں کی محبت اور مزاحمت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ نفیس بانو شمع ایک دن ڈاکٹر کے پاس دوائی لینے گئی تو اس نے دوائی کے پیکٹ میں ایک خط بھی چھوڑ دیا شروع میں تو مصنفہ نے اس حرکت کی طرف توجہ نہ دی مگر دو تین دفعہ ایسا ہوا تو اپنے کزن کو شکایت لگائی جس نے ڈاکٹر کو گلے سے پکڑ کر پوچھا دوائی میں کون سا محبت نامہ ڈالا ہے ڈاکٹر نے شرمندہ ہو کر اپنے کیے کی معافی مانگی۔

سعیدہ بانو احمد ایک باغی اور بے باک خاتون تھیں۔ ان کو معاشرتی رسم ورواج سے نفرت تھی وہ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کو ضروری قرار دیتی ہیں وہ لکھتی ہیں: "دو انجانے انسانوں کو شادی کے بندھن میں جکڑ دینا بڑی ناانصافی ہے۔"(۱۵۰) جب وہ دلہن بنی تو وہ روایتی دلہنوں کی طرح نہ تو شرمائی اور نہ ہی دوسروں کے سامنے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیں۔ ان کے دور میں طوائف سے پردہ کیا جاتا تھا۔ لکھنو کے معاشرے میں طوائف کا پیشہ عام تھا۔ ایک عام عورت کو طوائف بنانے والا بھی معاشرہ ہے اور جب بن جائے تو لاکھ چاہے باعزت عورتوں والی زندگی نہیں گزر سکتی۔ کیوں کہ معاشرے نے اس کو طوائف کا نام دے دیا ہوتا ہے۔ ایسے ہی سعیدہ بانو احمد ایک طوائف اختری بیگم کا ذکر کرتی ہے جو اپنے پیشے سے تنگ آچکی تھی اور باعزت زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ سعیدہ بانو احمد نے اشتیاق احمد عباسی جس کی پہلی بیوی وفات پا چکی تھی اس کا نکاح اختر بیگم سے

کروادیا۔ وہ لکھتی ہیں: "میں اپنے ساتھ نکاح کا دوپٹہ لیتی گئی تھی۔ وہ میں نے اختری کو اوڑھادیا۔ مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا۔"(۱۵۱)

۱۹۳۸ء میں لکھنو میں ریڈیو اسٹیشن شروع ہوا تو سعیدہ بانو احمد نے وہاں پر ملازمت شروع کی۔ اس دوران گھریلو ناچاقی کی وجہ سے گھر کا ماحول خوشگوار نہ تھا۔ وہ اکثر ناشتہ بھی کر کے نہ آتی تھی۔ ملازمت کے دوران دو مرد اس کی زندگی میں آئے ایک جگل صاحب اور دوسرے نور الدین۔ جگل صاحب نے سعیدہ بانو احمد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہے سعیدہ نے ان کو دوٹوک جواب دیا۔ وہ لکھتی ہیں: "دیکھیے میں شادی شدہ عورت ہوں، میرے دو بچے ہیں، ہماری راہیں الگ ہیں۔"(۱۵۲)

عطیہ داؤد کے گاؤں کا پانی کڑوا تھا جب کہ حویلی کا پانی اچھا تھا رئیسانی سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کنواں کا ہے اس لیے۔ تمہارے گھر میں نہر کا پانی آتا ہو گا۔ عطیہ نے پانی کا پیالہ وہاں پر ہی چھوڑا اور کھیت کی طرف نکل گئی منشی سے رئیس کا پوچھا کہ وہ کہاں پہ ہے اس نے جواب دیا باغ میں ہے باغ میں پہنچتے ہی رئیس سے کہا: "رئیس تم بہت بے ایمان ہو خود کنواں کا پانی پیتے ہو اور ہمیں نہر کا پانی بھیجتے ہو۔"(۱۵۳)

رئیس اور اس کے ساتھ والے لوگ حیرت سے عطیہ کو دیکھنے لگے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے ایسا نہیں ہو گا۔ اکثر ان کی ممانی اپنے بیٹے کے ساتھ عطیہ داؤد کے گھر آتی تھی اس کا بیٹا عطیہ داؤد سے چار سال بڑا تھا۔ ایک رات ان دونوں میں تکرار ہو گیا اس نے کہا میں صدر ایوب کی طرح پاکستان کا صدر بنوں گا تو عطیہ داؤد نے کہا میں بھی پاکستان کی صدر بناؤں گی۔ کسی نے کہا عورت صدر نہیں بن سکتی محترمہ فاطمہ جناح نے ایسی کوشش کر کے دیکھ لی ہے عطیہ داؤد نے کہا میں سرکار بناؤں گی۔ ان کے علاقے میں وٹے سٹے کی شادی کا عام رواج تھا۔ اس کے بھائی کی شادی والے دن ایک عورت نے عطیہ داؤد کی ماں سے کہا بڑی بیٹی کی شادی چھوٹے بیٹے کے بدلے میں کی تو کیا عطیہ داؤد کی شادی بڑے بیٹے کے بدلے میں کرو گی۔ یہ سن کر عطیہ گھبرائی ہوئی اپنے بڑے بھائی کے پاس گئی اور کہا: "آپ کو شادی کرنی ہو تو خود کر لینا میرا بیڑا مت غرق کرنا۔"(۱۵۴)

ان کے گاؤں کی ایک عورت محمودہ کی آواز بہت پیاری تھی۔ اس کے بچے مصنفہ کے دوست تھے۔ اس کو جوانی میں کسی لڑکے سے پیار ہو گیا تھا۔ لیکن محمودہ کے بھائیوں نے وہاں رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ وہ شخص شادی کے بدلے میں ان کے مطالبے کی رقم ادا نہیں کر سکتا تھا۔ محمودہ ان رسم ورواج سے تنگ آ کر بھاگ گئی۔ وہ لوگ ملتان چلے گئے۔ وہاں پر محمودہ حاملہ بھی ہو گئی۔ مگر ان کے بھائیوں نے پیچھا نہ چھوڑا اور ایک سول سرونٹ آدمی کو تلاش کرنے کو کہا۔ اس نے سی آئی ڈی کے بندے اس کے پیچھے لگا دیئے، جو لڑکی برآمد کروا کر لے

آئے۔انھوں نے لڑکے پر چوری کا الزام لگا کر جیل بھیجوا دیا گیا۔بھائیوں نے اخلاق کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آدمی کو بہن کا فیصلہ کرنے کو کہا۔اس شخص نے ایک ان پڑھ آدمی سے محمودہ کی شادی کروادی۔ پھر محمودہ ساری عمر روتی رہی۔ عطیہ داؤد کا بڑا بھائی بہت آزاد خیال تھا۔انھوں نے سمجھایا کہ لڑکیوں کا مقدر صرف شادی کر کے بچے پالنا،گھریلو کام کاج کرنا نہیں بلکہ شہروں میں لڑکیاں پائلٹ،ڈاکٹر،استاداور بہت سی دوسری سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتیں کرتی ہیں۔وہ گاڑی چلاتی ہیں اور باہر کے ممالک میں پڑھنے جاتی ہیں۔عطیہ داؤد نے بھی بھائی کی باتیں سن کر تہیہ کرلیا کہ وہ بھی شہری لڑکیوں کی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گی۔ان کی والدہ نے بھی اپنی بیٹی کو پڑھانے کے لیے شہر بھیجوانے کاارادہ کرلیا۔ان کی بھابی عطیہ داؤد کے سکول میں استانی تھیں اس نے ماضی کی تلخیوں کا بدلہ عطیہ داؤد سے لیناشروع کر دیا۔کلاس کی لڑکیوں نے اسے سکول چھوڑنے کا مشورہ دیا، لیکن عطیہ داؤد کے ذہن میں پڑھ لکھ کر اچھی ملازمت کا خواب تھا۔وہ اس خواب کی تکمیل کے لیے ان مسائل کو آڑے نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:”میں نے سوچا کہ ان کو مارنے دو میں صبر کروں گی۔اتنا صبر کروں گی کہ ان کا ظلم تھک جائے گا۔“(۱۵۵)

میٹرک کرنے کے بعد عطیہ داؤد نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر کارخ کیا۔تب ہر طرف یہ ہی تصور کیا جاتا تھا کہ کہیں بھی عورت یا بچی اکیلی نہیں جاسکتی۔ان کے ساتھ ایک مرد یا لڑکے کا ہونا ضروری ہے۔اگر ان عورتوں کی تعداد چار یا پانچ بھی ہو تب بھی ان کے ساتھ ایک مرد ساتھ ہو۔وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں:”میں اس میں اپنی ہتک محسوس کرتی تھی کہ کوئی لڑکا یا مرد محض اس لیے میرے ساتھ سفر کرے کہ وہ مرد ہونے کی وجہ سے مجھ سے برتر ہے، چاہے وہ عقل میں مجھ سے کم تر ہی کیوں نہ ہو۔“(۱۵۶)

اس لیے وہ اکثر گاؤں سے شہر تک کا سفر اکیلے کرتی تھی۔ان کی بھابی ثمینہ کے گھر ادبی رسالہ آتا تھا۔ان دنوں عطیہ داؤد نے واقعاتی شاعری کو نظم کی صورت میں کرتی تھی سندھی نیشنل موومنٹ کے واقعے پر ایک نظم لکھی اور ارسال کر دی۔ نظم پر اپنا نام بھی درست لکھا۔جب نظم شائع ہوئی تو بڑے بھائی کو خالہ نے بھڑکا دیا۔بھائی نے عطیہ داؤد کو غصے بھرا خط لکھا اور کہا تمہیں پڑھنے کے لیے شہر بھیجا تھا تم نے خوب ہماری عزت خراب کی۔انھوں نے مزید لکھا کہ:”اخبار میں تمھاری شاعری پڑھی واہ خوب خاندان کی ناک کٹوائی ہے۔“(۱۵۷)

عطیہ داؤد نے دوٹوک جواب لکھا کہ آپ مجھے نرم لہجے میں بتاتے تو اعتراض نہ تھا مگر آپ نے کوئی رشتہ ہی نہ چھوڑا۔وہ غصے بھر انداز میں لکھتی ہیں:”میں آپ کو آپ کا خاندانی نام لاڑک واپس کرتی ہوں۔“(۱۵۸)عطیہ داود کی بڑی بہن شوہر سے لڑ کر بھائی کے گھر آگئی۔بھابی کو چھوٹی نند کا وجود گوارا نہ تھا بڑی کو کیسے برداشت کرتی۔بھابی اور

بہن کی وٹے سٹے کی شادی تھی وہ بھی ان کی بھابی تھی۔ بھابی نے بڑی نند کا جینا دوبھر کر دیا۔ بلقیس نے تنگ آکر گھر چھوڑ دیا۔ عطیہ داؤد سے کوئی معمولی سی غلطی ہوتی تو سب طعنے دینے لگتے۔ وہ سب کہتے: "ایک بہن نے خاندان کا نام ڈبو ہی دیا ہے اب دوسری بہن دیکھیں کیا گل کھلاتی ہے۔"(۱۵۹) ایک رشتے دار نے عطیہ داؤد کی گم شدہ بہن بلقیس کا پتا بتانے کے لیے کہا۔ وہ کئی بچوں کا باپ تھا مگر تو وہ خود بھی بلقیس سے شادی کا امیدوار تھا۔ بات کرتے ہوئے اس نے عطیہ داؤد کی طرح دیکھنا شروع کیا۔ جس کا اظہار عطیہ داؤد نے ان الفاظ میں کیا:"

وہ گندی نظروں سے مجھے بھی دیکھے جا رہا تھا جیسے بلقیس سے شادی ہو جائے گی تو اس صورت میں میں تو بطور سالن یا شوربے کے اسے مفت میں ہی مل جاؤں گی۔"(۱۶۰) وہ اکیس سال تک اپنی بہن کو تلاش کرتی رہی۔ ایک پڑھی لکھی عورت نے ان کی بہن کی کہانی سن کر کہا یہاں ایک عورت کھو جائے تو وہ دو دن کے بعد بھی صحیح سلامت نہیں ملتی۔ اور اگر اکیس سال بعد اگر مل بھی جاتی ہے تو وحشی مردوں نے اس کے اندر کیا چھوڑا ہوگا۔؟ اور ایسی عورت سے کوئی شادی تو کرتا نہیں کسی نے اس کو اپنی رکھیل بنا کر رکھا ہوگا۔ اور اس کے ناجائز بچے ہوئے تو پھر ؟ اس کی باتیں سن کر عطیہ داؤد تڑپ اٹھی اور سوچا کیا ایک عورت کے اندر جنسی عضو کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

ساجدہ زیدی کے چچا نے سازش کر کے ان کے والد کو قتل کروایا تا کہ ان کے فارم ہاؤس پر ناجائز قبضہ کیا جا سکے۔ ان کے خلاف وہ اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "قاتلوں نے تمام عمر اس دولت پر عیاشی کی، ہمارا بچپن ویران اور ہم بے گھر ہوگئے اور قاتل گھر اور باغات کے مالک قرار پاگئے۔"(۱۶۱)

ایسی صورت میں ان کی والدہ اپنا گھر چھوڑ کر بھائی کے پاس آگئی ان کو بھائی کا پیار تو ملا مگر بھابی کی اپنائیت سے محروم رہی۔ وہ کمرے میں بند رہتی اوران کی بیٹیاں اپنی فرسٹریشن نکالنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑتیں۔ کمرے میں محدود کھیل تھے۔ ان کی والدہ ڈانٹتی تو رونے لگ جاتی۔ لڑکیوں کو تعلیم کی غرض سے گھر سے باہر بھیجنا خاندانی روایت میں شامل نہ تھا۔ شادی کا خیال ذہن میں آتا ہی ساجدہ زیدی نے کہا کیا مجھے ہر بات کی اجازت لینی پڑے گی کیا میری ذات کی کوئی اہمیت نہیں۔ اپنے ان ہی باغیانہ خیالات کو وہ خود شناسی کا پہلا قدم قرار دیتی ہیں۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے روایت پرست ماحول کو تبدیل کرنے کا سہرا بھی ان کے نام آتا ہے۔ جس کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا یہ روایت کی جکڑبندیوں سے بغاوت تھی جس کی اشد سماجی ضرورت تھی۔ ۱۹۴۸ء کے قریب ہندوستان میں پردے کی سخت پابندی تھی۔ پردے کو ہی مسلم تشخص کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے پردے کی رسم کے خلاف اپنی ہم جماعت کے ساتھ بائی سائیکل پر کالج جانا شروع کر دیا۔ وہ لکھتی ہیں:"

ہم چاروں بہنوں اور سائرہ وشہلا نے ایک ایک سائیکل خریدلی تھی اس پر جاتے یہ سب مسلم یونی ورسٹی میں تقریبا ممنوع تھا۔۔۔خلاف روایت تو تھا ہی۔۔۔۔ہم ہر موقع پر آزادی رفتار وگفتار کی وکالت کرتے۔"(۱۶۲)

ابتدامیں لڑکوں نے آوازیں کسنا شروع کردیں، مگر بعد میں وہ اس ماحول کے عادی ہوگئے۔ مصنفہ نے رشید جہاں جیسی فیمنسٹ خاتون کے ساتھ کام کیا۔ وہ دن بھر لکھنو کانفرنس میں مصروف رہتی رات کو بستر بچھا کر سو جاتیں۔ یہ سردیوں کے دن تھا۔ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر اور لیڈروں نے احتجاجی مظاہروں کا پروگرام بنایا۔ ساجدہ زیدی کی تینوں بہنیں بھی اس میں شامل تھیں، جن کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی والدہ خورد ونوش کے ہمراہ جیل ملاقات کے لیے آئی۔ وہ لکھتی ہیں: "میں نے اور اماں نے بنارس جیل جانے اور مقدمہ دائرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرا بچہ ہونے میں چند دن باقی تھے، لہذا بچے کی پیدائش تک انتظار کرنا ناگریز تھا۔"(۱۶۳) یہ تمام لڑکیاں اٹھارہ دن تک بھوک ہڑتال کرتی رہیں اور ایک گز مربع کی کال کوٹھریوں میں قید تنہائی گزر رہی تھیں۔ ایسے مشکل حالات میں ساجدہ زیدی کے شوہر قیصر نے بھی لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ایک عورت کی خانگی زندگی اور ماں کی ممتا اور سماجی تقاضے بہت زیادہ جبر پر مشتمل ہوتے ہیں، جو عورت کو اپنی ذات سے دور کر دیتے ہیں۔ اس لیے وہ لکھتی ہیں: "میں تو بس بچوں کی ولادت وپیدائش اور امور خانہ داری میں محو ہوں۔ مجھے اپنا باطن آشکار کرنا کبھی آیا ہی نہیں۔"(۱۶۴)

پنڈت نہرو سے ملاقات کے بعد ان لڑکیوں کو رہا کیا گیا۔ اس کے بعد ان کے شوہر کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا۔ روس میں قیام کے دوران انہوں نے نوٹ کیا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد عورتوں کی تعداد کم رہ گئی تھی، دوسری طرف ان کی روشن خیالی اور ترقی بھی نظر آرہی تھی۔ جس میں نوکر اور آقا میں فرق نہیں کیا جاتا تھا اس لیے خواتین زندگی کے ہر شعبے میں نظر آرہی تھیں۔ اس کے باوجود ساجدہ زیدی کو عورتیں ہر جگہ مظلوم نظر آئیں۔ ان کی آپ بیتی میں لندن کا بہت زیادہ ذکر ہے۔ ان کا داخلہ لندن یونی ورسٹی انسٹیوٹ آف ایجوکیشن میں ہوا۔ ان کا ادبی گھرانہ تھا ان کی والدہ شاعرہ اور ماموں غلام السیدین (ماہر تعلیمات) تھے ان کے بھی بہت سی ادبی شخصیات سے روابط تھے۔ اسی طرح مصنفہ کو اٹلی میں بھی خواتین پس پردہ نظر آئیں۔ روم میں ساجدہ زیدی کو کئی مردوں نے پریشان کیا انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچاسکیں۔ وہ اپنے تجربات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھتی ہیں: "عام مرد خواہ کسی کلچر کسی ملک کا ہو، کسی بھی معاشرہ کا ہو تنہا عورت کو دیکھ کر خصوصا اگر وہ جوان اور خوب رو ہے اس کے پیچھے پڑجاتا ہے۔"(۱۶۵)

وہ حضرت مریمؑ کی تصویر کو ممتا کا استعارہ سمجھتے ہوئے خریدتی ہیں۔اسی آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنا موازنہ باغی شاعرات کے ساتھ کیا ہے دور قدیم میں قرۃ العین طاہرہ، حبہ خاتون۔ سروجنی نائیڈو، جوا ک آف ارک، جہاں آرا۔ مغل شہزادی اور خالدہ ادیب خانم کا ذکر کیا ہے جبکہ دور جدید میں شفیق فاطمہ ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، زاہدہ زیدی، پروین شاکر اور خود مصنفہ شامل ہیں۔ یہ وہ شاعرات تھیں جنہوں نے معاشرتی پابندیوں کو نہ صرف توڑا بلکہ اپنی بلند فکری پروازی کی بناء پر دنیا میں نام پیدا کیا۔ان خواتین نے اپنے عہد کے مسائل ،اضطراب ،ذات کی پیچیدگیوں، نشاط درد، اور غم الم کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا۔ جدید فکشن نگار خواتین میں عصمت چغتائی، جیلانی بانو، خالدہ اصغر اور زاہدہ حنا کے ناموں سے متاثر تھیں۔ یہ غیر معمولی ذہانت کی حامل خواتین نہ صرف سماجی ذمہ داریوں کو نبھا رہی ہیں بلکہ دوسری طرف تخلیقی خودی اور بے خودی کا سفر بھی طے کر رہی ہیں۔ان کی مزاحمت مصنفہ کے اندر پائی جانے والی مزاحمت کو ہوا دے رہی ہے اور وہ انفرادی مزاحمت کے ساتھ ساتھ اجتماعی مزاحمت کو بھی نمو دیتی ہیں اس لیے وہ خود سے عزم واستقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> میں قلم کی جنگ جاری رکھوں گی، انسانیت اور انصاف کی جنگ، ظلم اور ناانصافی کی جنگ، خون ریزی، بے حسی، شقاوت، خباثت، جنگ جوئی، منافقت اور جھوٹ کے خلاف جنگ۔۔۔ خواہ ظلم و بیدادونا انصافی دنیا کے کسی حصے میں بھی ہو، ثابت کر کے رہوں گی۔"(۱۶۶)

ش۔ فرخ نڈر، بہادر اور خوددار خاتون تھی۔ایک دفعہ ان کی دوست نے آغا خان یونی ورسٹی میں ہونے والے کارکن آمسٹر انگ کا لیکچر نہ سننے آنے کی وجہ پوچھی تو مصنفہ نے کہا یہ لوگ باہر سے آکر ہمارے مذہب کے بارے میں ہمیں کیوں بتاتے ہیں ؟ ہمیں اپنے بارے میں، اپنے شعور کے مطابق، اپنے حالات کے مطابق سب کچھ سمجھنے دیں۔ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھائی کے دوران ہوسٹل سے باہر جانے کے لیے تانگہ لینا پڑتا تھا ایک دن مصنفہ اپنی دوستوں کے ساتھ تانگے پر سفر کر رہی تھی کہ ایک سپاہی نے تانگہ روکا اور کوچوان کو تنگ کرنا شروع کیا۔ کانسٹیبل کوچوان سے کچھ پیسے ہتھیانا چاہتا تھا۔ کوچوان بے چارہ منت سماجت کرنے لگا انھوں نے کہا ہمیں دیر ہو رہی ہے ہمیں جانے دو وہ مان گیا۔وہ سب لڑکیاں یونی ورسٹی جانے کی بجائے سیدھی تھانے گئی ڈیوٹی پر موجود انسپکٹر کو بتایا کہ آپ کے کانسٹیبل کی وجہ سے ان کو دیر ہوئی وہ بہت خفا ہوئے اور وعدہ کیا کہ اس کی پیٹی اتروائیں گے۔ یہ تھا ایکٹویزم کیوں کہ پولیس والے نے غریب کوچوان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ شادی کے بعد ایک ایڈورٹائیزنگ کمپنی کے مالک سے ملازمت کے سلسلے میں ملی جنہیں کاپی رائٹر درکار تھے۔ بوس نے چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد دراز سے ربڑ کی بنی ہوئی ایک عورت کا مجسمہ سامنے رکھا لیا۔ مصنفہ اس انتظار میں تھیں کہ وہ

ملازمت کی کوئی بات کریں گئے مگر موصوف اس مجسمے سے کھیلتے رہے ان کی اس حرکت پر مصنفہ کو غصہ آیا وہ شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر آگئی۔ ضیاء کے دور حکومت میں مہتاب پی ٹی وی پر وگرام کرتی تھیں۔ احکام نے مطالبہ کیا کہ آپ سر پر دوپٹہ اوڑھا کریں مہتاب نے یہ کہہ کر پی ٹی وی چھوڑ دیا کہ سر پر دوپٹہ لینا یا نہ لینا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مصنفہ نے اپنے ساتھ ساتھ دوسری باہمت اور تنہا خواتین کے احوال بھی رقم کیے ہیں جن میں نرگس خانم ایک صحافی خاتون تھیں، شادی نہیں کی تھی اپنی محنت اور کمائی سے خریدے ہوئے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ افضل توصیف نے بغاوت کا آغاز بلوچستان کے سبی ماڈل سکول سے کیا۔ یہاں پر ہی بھوک ہڑتال کی جس کی خبر ان کے والد محترم کو خط کے ذریعے دی گئی کہ آپ کی بیٹی سکول میں ہونے والی ہڑتال کی لیڈر رہے۔ ان کے والد نے بیٹی کی حمایت کی کہ آپ لوگوں نے ان کے من پسند استاد کو کیوں چھین لیا۔

افضل توصیف نے فوجی امریت کے خلاف خوب لکھا جس کے نتیجے میں ان کی تمام کتابوں کو ضبط کر لیا گیا جن میں پہلی کتاب ”اندھیروں کا سفر“ تھی جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوتے ہی ضبط ہو گئی کیوں کہ اس میں فوج کے تشدد کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا اسی دن ان کے بھائی نے اپنی بیوی پر تشدد کیا تو کتاب کی رونمائی چھوڑ کر بھابی کے پاس کوئٹہ آگئی اور اس کے جسم پر پڑنے والے بیل گن رہی تھی۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش لیبیا سازش کیس تھا۔ جس میں پاکستانی فوج کے جرنیل کو جنرل ڈائریکٹر کا جان نشین لکھا تھا دوسرا پیپلز پارٹی کی حامی اور ساتھی ہونا بھی جرم تھا۔ اس کیس میں ملٹری ٹرائل کا سامنا، خوفناک رویے اور مشکل سوالات تھے اس کے باوجود سچ کی طاقت نے اس امتحان میں نہ صرف پاس کیا بلکہ تیرہ لوگوں کی رہائی، اور پانچ کو پھانسی کی سزا سے نجات ملی۔ وہ لکھتی ہیں: ”میری گواہی سے تیرہ بندے چھٹ گئے، پانچ پھانسی سے بچ گئے۔ آج کے دن تک یہ تسلی ہے۔“ (۱۶۷) سانحہ سقوط ڈھاکہ پر عوام کی حالت زار بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "ایک سال فوج کشی میں بنگال کے کتنے لوگ مارے گئے۔۔۔۔۔ کتنی عورتیں ریپ ہوئیں کتنی اجتماعی قبریں بنیں، کتنی لاشیں دریاؤں میں بہائی گئیں۔ کیسی کیسی موت ہوئی۔ (۱۶۸)

ضیاء الحق کے دور کو خواتین کا وہ بدترین دور تھا جس میں چادر اور چار دیواری کا تقدس بحال رکھنے کے لیے زنا اور زنا بالجبر میں کوئی فرق روا نہ رکھا گیا۔ کوڑے لگانے کی سزا نافذ ہوئی جس میں مردوں کو کھڑا کر کے اور عورتوں بیٹھا کر کوڑے لگانے کا حکم صادر کیا گیا۔ حدود آرڈیننس میں عصمت دری کا شکار ہونے والی عورتوں کو تحفظ دینے سے انکار کر دیا گیا اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کو کوئی سزا نہ دی گئی۔ عورت کی گواہی کو آدھی گواہی کہا گیا۔ اس دور میں ظلم، جہالت، لشکریت، اور ملائیت کو فروغ دیا گیا۔ سیاسی ورکرز سے لے کر اساتذہ، طلبہ، ادیب، صحافی، شاعر،

وکلاء اور عورتوں کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ اخباروں پر بھاری سنسر اور ادب پر پابندی لگادی گئی۔ اس دور میں دوسری ادیبوں کی طرح افضل توصیف نے بھی مزاحمت کی۔ وہ لکھتی ہیں:

”سچائی کے لیے، آزادی وانصاف کے لیے میں نے بھی قلم کو تلوار بنایا تو میری کتابیں ضبط ہوئیں۔ میرے پیچھے کتنی ساری ایجنسیاں اور کتنی فورس لگی تو مجھے ڈر لگا، لیکن اچھا بھی لگا۔“(۱۶۹)

مصنفہ نے عورت اور مذہب کو ایک دوسرے کی بے عزتی کے لیے استعمال کرنے والوں سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ گاؤں کے تیلی کی پندرہ سالہ لڑکی کو کوئی وحشی اٹھا کر لے گیا اور اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس لڑکی نے اپنی نجات کے لیے خود جدوجہد کی۔ ایک صبح کوڑے کا ٹوکرا باہر پھینکنے کا بہانہ کر کے باہر آ گئی۔ وہ عورتوں کی ایسی آزادی کے خلاف ہیں جس کا مطلب عورت کو آزادی کے نام پر طوائف بناتا ہے بچوں کو باپ سے چھین کر ان کو بے کس بنا دیتا ہے جو بعد میں ابنارمل اور ادھوری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔

نفیس بانو شمع نے اپنی آپ بیتی میں لکھنو کی آسودہ حال خاتون ثروت کے بارے میں لکھا۔ لکھنو میں خواتین پردے کی سخت پابند تھیں۔ وہاں پر ایک ڈاکو رحمت آتا تھا اسے گاؤں کی جو عورت پسند آتی اسے جبرا یا قیمتا خرید لیتا تھا۔ ایک دن ثروت شادی میں تھی کہ ڈاکو رحمت کی نظر ثروت پر پڑی ثروت نے غصے میں آ کر ڈاکو رحمت کے منہ پر تھوک دیا۔ رحمت کے انتقام نے اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا۔ رحمت نے ایک دن اس کے کمرے میں آ کر اس سے زبردستی کی جس سے وہ نہ چاہتے ہوئے حاملہ ہوگئی یوں اس کی زندگی دو مردوں کے درمیان کھلونا بن گئی۔

مشرقی معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کو مال غنیمت کی طرح ناجائز طریقوں سے تعلق بنانے کو شش کی جاتی ہیں۔ طلاق یافتہ ہونے کی وجہ سے نفیس بانو شمع کو قارئین کے غیر مہذب خطوط آنے لگے جن کا جواب رسالہ ”خاتون مشرق“ میں جوابی خط کی صورت میں دیا گیا۔ اس خط کے بعد بہت سے لوگوں نے نفیس بانو شمع کے خلاف لوگوں نے مخالفت بھی کی اس کو دھمکیاں اور گالیاں بھی دیں۔ نثار عزیز بٹ کو زاہدہ حنا نے باغی لڑکی کہا جس کے اندر باغی پن چھپا ہوا تھا۔ خیبر پختون خوا کے صوبے میں عورتوں پر لگائی جانے والی پابندیوں والے گھٹن زدہ ماحول میں سانس گھٹ جانے سے انسان اپنی موت آپ مر جاتا ہے مگر اس باغی لڑکی نے نہ صرف خود کو زندہ رکھا بلکہ پسند کی شادی اور تعلیم حاصل کرنے کے معاملے میں خاندانی روایات سے انحراف بھی کیا۔ سرتاج عزیز عرف تاجی کی منگیتر کو جب والدین نے سکول جانے سے روک دیا تو نثار عزیز بٹ نے اپنے والدین کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ عورتوں کے سلسلے میں بغاوت کے بیج ان دنوں ہی دل میں بوئے گئے۔ لڑکیاں ہونے کے ناطے بچیاں ستم

رسیدہ تھیں۔ پڑھائی کی غرض سے خالہ کے گھر رکی تو اس نے کہا لڑکی تو گئی ہاتھ سے یہ مال روڈ پر اونچی ہیل پہن کر پھیرے گی دوسری خاتون نے کہا وہاں جا کر لڑکوں کو خط مت لکھنا۔ وہ اپنے علاقے میں لڑکیوں کی صورتحال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ”سرحد میں تعلیم بہت کم تھی، لڑکیوں میں تو تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی، تعلیم کی وجہ سے میری شہرت ہوئی تو رشتے آنے لگے۔“[۱۷۰]

ان کے والد تعلیمی معاملے میں روشن خیال تھے مگر شادی کا کا خیل خاندان میں ہی کرنا چاہتے تھے اصغر بٹ سے شادی کے بارے میں نثار عزیز بٹ نے خاموشی کا رویہ اختیار کیا۔ اس نے خاندان میں شادی کرنے سے انکار کیا تو ریڈیو پاکستان پشاور کے اصغر بٹ سے پسند کی شادی کی کیوں کہ ان کے خیال میں شادی لڑکے لڑکی کی مرضی سے ہونی چاہیے۔ بچپن میں باپ اور بھائی سے علمی مباحث میں شریک ہوتی تھی۔ وہ گھر سے باہر لاہور میں اعلی تعلیم کے لیے گئی اکیلی نے مختلف جگہوں کے اسفار کیے۔ وہ ایسی تقسیم کے خلاف تھی جو مذہبی بنیادوں پر ہو۔ وہ اپنے ہندو استاد کے ہٹائے جانے پر غصے کا اظہار کرتی ہیں کہ ریاضی، فلسفہ اور ادب کے موضوعات کو کیوں ہندو مسلم میں تقسیم کیا جاتا ہے وہ گہری سیاسی بصیرت رکھنے کی وجہ سے مارشل کے خلاف تھی اور اس پر کھل کر احتجاج کیا جس کی وجہ سے ان کے شوہر کی ترقی رک گئی۔ وہ لکھتی ہیں: ”اقتدار اگر فوج اور سول افسر شاہی کے درمیان فٹ بال بنا رہے گا تو یہی حال ہو گا۔“[۱۷۱]

انہوں نے یحیی خان اور ضیاء الحق کے مارشل کے خلاف لکھا۔ یحیی خان نے مارشل کے خلاف بولنے والے کو دس سال قید کی نوید سنائی اور ضیاء الحق حکومت نے عورتوں کو بے جان روح سمجھ کر ان کے ووٹ ڈالنے کے حق میں نہ تھی۔ جس نے بے گناہ عورتوں اور مردوں کو سزائیں دیں۔ افسروں کو دھمکیاں دے کر دوسو لوگوں کو ملازمت سے نکال دیا۔ ایسے عالم میں لوگ بے نظیر اور نصرت بھٹو کو بھول گئے تھے نثار لکھتی ہیں: ”وہ خود آکٹوپس کے شکنجے میں ہیں کسے یاد رکھیں اور کسے بھول جائیں۔“[۱۷۲]

گھر کے دائیں جانب امرتسر کا بجلی پہلوان بھی رہتا تھا اس کا بیٹا اکثر اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ ایک روز نثار عزیز بٹ نے کھڑکی میں سے مار پیٹ کی آوازیں سنیں تو کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس کے بیٹے کو خوب سنائیں اور کہا اتنے ہی سورما ہو تو باہر نکل کر مار پیٹ کرو بیوی کو کیوں مارتے ہو؟

صغرا مہدی نے زمانہ طالب علمی سے لے کر ملازمت تک ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی۔ بی۔ ایڈ کرنے کے دوران اصغر علی شعبہ عمرانیات کے استاد تھے طالب علموں کو کہتے تھے اپنے مسائل ان کے کمرے میں آکر بتایا کریں سب لڑکے لڑکیاں ان کے پاس چلے جاتے تھے صرف صغرا اور عفت نہیں جاتی تھیں۔ انہوں

نے ایک دن عفت اور صغرا کی ٹیچر ڈائری یہ کہہ کر رکھ لی کہ شام سات بجے کمرے میں دکھائیے گا۔عفت خاموش رہی مگر صغرا مہدی نے اس عمل کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے کہا کہ کیوں سر جب وقت مقرر ہے تو آپ اسی میں دیکھیے نا؟ وہ اس بات پر بگڑ گئے اور کہا تم بہت بد تمیز ہو تمہارا رزلٹ خراب کردوں گا ساری عمر روگی صغرا مہدی نے دوٹوک جواب دیا جو آپ کا دل چاہے کریں یہ کاپی ہے یہیں چیک کریں ہم کمرے میں نہیں آئیں گئے یہ بات اعلیٰ احکام تک گئی انہوں صغرا مہدی کو معافی مانگنے کا کہا تو صغرا مہدی نے اصغر صاحب کو فوراجواب دیا: کہ اس نے ان سے کوئی بدتمیزی نہیں کی مگر چونکہ سلامت صاحب کہہ رہے ہیں اس لیے وہ آپ سے معافی مانگتی ہیں۔انہوں نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا اور شام کو کاپی پر سائن کر دیئے۔مزاحمت کی وجہ سے یونی ورسٹی نے صغرا مہدی کو تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔جامعہ میں پڑھاتے ہوئے جامعہ میں بھی غلط بات کو برداشت نہ کیا۔اکثرلوگ ان سے ذاتی اختلافات کی بجائے اصولی اختلافات کی وجہ سے خفا تھے۔

عذرا عباس نے اپنی آپ بیتی ”میرا بچپن “میں بار بار احساس دلایا ہے کہ ہمارے معاشرہ مرداساس معاشرہ ہے جس میں اپنے حقوق کی آگاہی ہی ضروری نہیں بلکہ اسے حاصل کرنے کا گر بھی آنا چاہیے اور نہ ملنے پر احتجاج کا روپ اپنانا چاہیے۔عذرا عباس کی ماں اپنے اختیارات کا استعمال پدرسری سوچ کے تحت کرتی تھی جو ان کو وراثت میں ملی تھی یا شاید اس سوچ اور عمل کو اپنانا ان کی مجبوری بن چکی تھی۔اگرچہ لڑکا اور لڑکی دونوں ایک ہی طرح کے ذہنی اور جسمانی کام کرتے ہیں تو ان کی والدہ بیٹوں کو دودھ اور بیٹی کو چائے کیوں دیتی تھی۔اسی صنفی ناہمواری کو برداشت نہ کرتے ہوئے عذرا عباس لکھتی ہیں:”اماں نے جیسے ہی دودھ کے پیالے میرے بھائیوں کے سامنے رکھے، میں کھڑی ہوگئی اور ایک ہی لات میں دونوں کے پیالے لڑھکا دیے۔روز پیتے ہو! میں شاید چیخی بھی تھی۔سب ہکا بکا مجھے دیکھ رہے تھے۔“(۱۷۳)شروع میں تانیثیت کا تعلق اسی تفریق کے خلاف آواز اٹھانے ہی کا نام تھا بعد میں اس کے اندر وسعت پیدا ہوتی گئی۔

حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کا قصہ تقریبا ہر مذہب میں شامل ہے اس قصے کی تشریح بھی پدرسری نظام کے تحت کی گئی جس کے مطابق حضرت حواؑ حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئیں اس نظریے کے تحت عورت نے آدم کو برتر درجہ دیا۔کشور ناہید اپنی کتھا میں مختلف کرداروں کا ذکر کرتی ہیں جن کو مزاحمت کرنے پر کڑی سزاؤں اورآزمائشوں میں ڈالا گیا۔ان سب کرداروں میں مصنفہ کو اپنی جھلک ہی نظر آتی ہے جن میں ایران کی قرۃ العین طاہرہ ،سیفو اوراندھی صفیہ بی بی وغیرہ شامل ہیں۔قرۃ العین طاہرہ جو ایران میں تانیثیت کی پہلی آواز تھی کشور ناہید نے خود کو ان کے اصلی نام زرین تاج سے متعارف کرواتی ہیں۔زرین تاج کو اس کی خوب صورتی اور مزاحمتی

شاعری کی وجہ سے شاہ ایران کے حواریوں نے گلہ گھونٹ کر مار دیا تھا۔ایرانی شاعرہ سیفو اور مغربی شاعرہ اینا اضماتوواسے ان کے کلیات چھین لیے گئے کہ وہ مسودات اس وقت قابل اعتراض اور ملک کی ساک کے لیے شرمناک سمجھے جاتے تھے۔اٹلی میں اڑتالیس سالہ شہزادے کی شادی بیس سالہ لڑکی سے کر دی گئی کیوں کہ لڑکا امیر تھا۔ان کے خیال میں عمروں میں فرق ذہنی ہم آہنگی کا باعث بنتا ہے مگر دولت کے سامنے سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے،اسی وجہ سے بہت سی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔سرگودھا میں آٹھ سالہ بچی کو مسجد کی بے حرمتی کرنے پر سزا دی گئی جب وہ اچھی اور بری چیزوں میں فرق نہیں جانتی تھی۔اسی وجہ سے مصنفہ کو حوا کی تمام بیٹیاں زندگی کے ہنگامے میں بے چین نظر آئیں اس لیے وہ لکھتی ہیں:"حوا تم نے نام بھی بہت بدے ہیں کبھی تم نے اپنا نام سیکٹن اینا رکھا اور ۲۹ سال کی عمر میں اپنی صحیح پیدائش کا اعلان کیا۔کبھی تم فروغ فرخ زاد بنیں کبھی سارا شگفتہ اور کبھی میری ماں۔"(۱۷۴)

سعودی عرب کی شہزادی کو پسند کی شادی کرنے پر پھانسی کی سزا دی گئی۔ہم جنسیت پرستی بھی معاشرتی استحصال کی ایک قسم ہے جس میں عورتیں اپنے مردوں سے تعلق نہ ہونے کی بناء پر یا ان کے تعصب پسندانہ رویے کی وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہوتی ہیں۔کشور ناہید کے بچپن میں بھی ایسے دو واقعات پیش آئے۔ان کی فارسی زبان کی معلمہ کشور ناہید کی ذہانت سے بہت متاثر تھی۔وہ ایک دن کشور ناہید کو اپنے گھر لے گئی۔اس کی لذیذ کھانوں سے تواضع کی اس کے ساتھ ہی ساتھ مصنفہ پر ہم جنسیت پرستی کا وار بھی کیا جس پر مصنفہ نے اپنی استانی کے آگے ہاتھ جوڑے اور بھاگ کر اپنے گھر واپس آگئی۔وہ اس واقعے کے بارے میں لکھتی ہیں:

"ایک دھکے کے ساتھ میں بستر پر تھی مجھے آغوش میں کرکے ابھی دوسرے تکیے کو درست کرنے کے لیے انہوں نے مجھے ذرا چھوا تو میں نے ہاتھ جوڑ کر رونا اور گڑگڑا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے معاف کریں۔مجھے گھر جانے دیں۔ان کی والدہ اندر آگئیں۔"(۱۷۵)

سکولوں میں لڑکیوں کے استانیوں کے ساتھ معاشقانہ رویوں کے قصے عام تھے ان کے سکول کی ہیڈ مسٹریس اور سکینڈ ہیڈ مسٹریس کمرے میں ہوتیں تو کسی کو ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔بستر بھی ایک تھا آخر یہ دونوں ایک بستر پر کیا کرتی ہیں؟کشور ناہید کے ساتھ تو پہلے ہی ایسا ایک واقعہ ہو چکا تھا۔آدھی رات کو جب لڑکیاں پڑھ رہی ہوتی تھیں تو انہیں قہقوں اور سرگوشیوں کی آوازیں آئیں ساتھ ہی ساتھ کچھ اور بھی عجیب آوازیں تھیں۔وہ ان حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:"دھڑام دھڑام---کراہ---بس---ٹھہرو----ہم ایک دوسرے کو دیکھتے حیران ہوئے اور شرمسار کہ اب گھر واپس نہیں جاسکتے۔"(۱۷۶)

مردوں کے استحصالی رویوں کے باعث عورتوں نے مزاحمت کے طور پر لزبین ہونا پسند کیا جو کہ کسی کو فت سے کم نہیں۔ ہم جنسیت پرستی کا موضوع بہت پرانا ہے اور نا معلوم کب سے ہے؟۔ اس کی بنیادی شرائط میں فریقین کی باہمی رضامندی شامل ہوتی ہے۔ اسی لیے مذہبی ، سماجی ، اور ادبی تاویلوں میں یہ موضوع زیر بحث رہتا ہے۔ مسلمان ممالک میں زیادتی کے کیسز سزا کے مستحق ٹھہرے جاتے ہیں جبکہ مغربی ممالک میں یہ سب کچھ باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ ہمارے اسلامی ممالک میں یہ کام چوری چھپے ہوتے ہیں۔ جیسے باقی غیر شرعی عیب پردے میں کیے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے سائمن دی بورا کی کتاب "سکینڈ سیکس" کا ترجمہ کیا۔ وہ کتاب نجم سیٹھی نے شائع کی۔ اس ترجمہ شدہ کتاب کی دو مہینوں میں دو ہزار کاپیاں فروخت ہو گئیں مگر ضیاء الحق کی حکومت میں اس کتاب پر فحاش ہونے کا فتوی جاری ہونے کی وجہ سے نہ صرف پابندی لگا دی گئی بلکہ ساتھ ہی ساتھ وارنٹ گرفتاری بھی جاری کیے گئے۔ انیس ناگی نے مصنفہ پر الزام لگایا کہ ان کی کتاب 'بے نام مسافت " کی نظمیں مغربی شاعرہ ایریکا ژونگ کی کاپی کر کے لکھی گئی ہیں جب کہ مصنفہ کی کتاب ایک سال پہلے شائع ہو چکی تھی۔

عورت کے مختلف کردار مرد نے خود تخلیق کیے کیوں کہ اس کو معاشرے نے طاقت اور اختیار دیا تھا۔ مرد نے عورت کو طوائف اور داشتہ کا کردار بھی عطا کیا اس لیے طوائف کا کردار اور موضوع دنیا کی ہر زبان میں دلچسپی سے پڑھا اور پسند کیا جاتا ہے مغرب میں ان عورتوں کو شوکیس میں بند کیا جاتا ہے۔ اگر آپ نے ہوٹل میں کوئی عورت بلائی ہے تو ہوٹل والوں کو اس کے بارے میں آگاہ کریں تا کہ ڈاکٹر آکر چیک کر سکے کہ اسے ایڈز جیسا مہلک مرض تو نہیں۔ مگر بلانے والے مرد کو بھی تو ایڈز ہو سکتا ہے چیک اپ صرف عورت کا ہی کیوں ہو؟ "بری عورت کی دوسری کتھا" میں کشور ناہید نے اسلامی دنیا کی تانیثی تحریک کی حامی خواتین کا ذکر کیا ہے جن سے مصنفہ کی مختلف کانفرنس میں ملاقات ہوتی رہی اور ان کو جاننے کا موقع ملا۔ جن میں سب سے پہلی مصر کی نوال سعودی ہے جس سے کشور ناہید کی دوستی ۱۹۸۵ء میں ہوئی۔ دونوں نے اسلام کے نام پر عورتوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں بند کرنے کے لیے جیسے چاہا ویسے ہی قرآنی آیات کی تشریح کر دی اسی وجہ سے کشور کی ماں نے اسے قرآن پاک کا ترجمہ معنی کے ساتھ کروایا تھا اور اسی طرح پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔

انیس ہارون کی آپ بیتی "کب مہکے گی فصل گل" میں پاکستان میں فیمنزم کے آغاز اور ارتقاء کی تاریخ ملتی ہے کس دور حکومت میں خواتین نے اپنے حقوق کی رسائی کے لیے مزاحمتی رویہ اپنایا اور ان کو کڑی سزائیں دی گئیں۔ انیس ہارون واقعہ کربلا میں کشش محسوس ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "مجھے ہمیشہ واقعہ کربلا میں عجیب سی کشش محسوس ہوتی۔ رزم اور مزاحمت سے میرا ازلی رشتہ ہے۔" (۱۷۷)

ان کو بڑی بوڑھیوں کی اس بات پر بہت غصہ آتا تھا جو اکثر کہتی ہیں کہ لڑکیاں تو پرایا دھن ہیں۔ان کا اصل گھر تو ان کا سسرال ہے بھائی جہاں لڑکی رہے گی وہی اس کا گھر ہو گا۔ایسے کیوں کہہ کر لڑکیوں کو خوف زدہ کرتی ہیں۔لڑکیوں کو اکثر سیکھانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ غلطی کی گنجائش صرف لڑکوں کے لیے ہے۔ضیا الحق کے دور میں جب سیاست اور صحافت پر پابندی تھی ویف کی خواتین نے کھل کر نہ صرف اپنا حق مانگا بلکہ تفریقی قوانین کو رد کرتے ہوئے آمریت کو بھی چیلنج کیا۔اس دور میں زندگی کے ہر شعبے میں مزاحمتی کردار ابھر کر سامنے آتے رہے۔ شیما کرمانی نے تحریک نسواں بنائی اور سٹریٹ تھیٹر شروع کیا ضیاءالحق نے رقص پر پابندی لگائی تو شیما کرمانی نے کلاسیکل رقص سیکھانا شروع کیا۔لاہور میں مدیحہ گوہر نے "اجو" بنایا۔سلیمہ ہاشمی نے اپنی مصوری کو مزاحمت کا ذریعہ بنایا۔کشور ناہید و دیگر شاعر وادیب نے اپنے تخلیقی فن پاروں کو مزاحمت کی راہ دکھائی۔ویف میں شمولیت کی وجہ سے انیس ہارون کے شوہر کو دھمکیاں دی جاتی تھیں کہ وہ اپنی بیوی کو روکیں۔انہوں نے کہا وہ میری بیوی ہونے کے علاوہ بھی کچھ ہے وہ اپنی سوچ اور مرضی کی مالک ہے میں کیسے انہیں روک سکتا ہوں۔ان کے شوہر ہارون کے ہسپتال میں اکثر سیاسی قیدی داخل ہوتے جن سے گپ شپ کرنے کا موقع مصنفہ کو بھی مل جاتا تھا اعجاز پلیجو نے پورا سال جناح ہسپتال میں گزرا ان کے اصرار پر سندھیائی تحریک کو ویف کے ساتھ شامل کیا گیا اسی تحریک نے جمہوریت کی بحالی کے لیے نمایاں کردار کیا۔زرینہ بلوچ، مریم پیلجو، شہناز راہو اور اختر بلوچ نے گرفتاریاں دیں۔اختر بلوچ بہت کم عمر تھی پھر بھی پیچھے نہ رہیں ان کی "قیدیانی کی ڈائری "بہت مشہور ہوئی۔سندھیائی اور ویف ایک سنگ میل تھا ویف شہری تنظیم اور سندھیائی دیہی خواتین کی نمائندگی کرتی تھی۔ان ہی دنوں فہمیدہ ریاض کی شاعری پر اعتراض کیا گیا کہ اس نے عورت کے جنسی جذبات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔جس پر تمام ادیبوں اور شعرا میں کھلبلی مچ گئی کہ یہ بے حیائی اور بے شرمی ہے کہ عورت جنسی طلب اور لذت کا اظہار کرے۔مصنفہ جب بھی فہمیدہ کے خلاف ایسی کوئی بات سنتی تو اس کا دفاع کرتی۔

حوالہ جات

۱۔ مشفق خواجہ، مختصر آپ بیتیاں، مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۴۵

۲۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ، میر اامن سے عبد اللہ الحق تک، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۰۲

۳۔ یوسف جمال انصاری، آپ بیتی اوراس کی مختلف صورتیں، مشمولہ، نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۹

۴۔ ریحانہ خانم، فن آپ بیتی اور آپ بیتیاں، مشمولہ، نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۹

۵۔ شہر بانو، بیتی کہانی، القمر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸

۶۔ وارث علوی، ڈاکٹر، کاغذی ہے پیرہن، عصمت چغتائی، پیش لفظ ص ۷

۷۔ شاداب سید، ڈاکٹر، اردو میں خواتین کی خود نوشت اور سماجی سروکار، حسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، پیش لفظ

۸۔ قاسم یعقوب، فرد، سماج اور تہذیبی تجربہ، بک ٹائم، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۵

۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸۸

۱۰۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۵۲

۱۱۔ عتیق اللہ، ڈاکٹر، تانیثیت ایک تنقیدی تھیوری پس منظر، مشمولہ، سمت، نسائیت، تانیثیت اور نسائی نمبر، شمارہ نمبر ۷، اپریل تا جون ۲۰۰۷ء، ص ۱۰

۱۲۔ فاطمہ حسن، برصغیر کے ادب میں صنفیت کے مسائل، مشمولہ، نقوش، ادارہ فروغ اردو، لاہور، جنوری، ۱۹۷۷ء، ص ۳۵

۱۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۷ تا ۱۸

۱۴۔ شہر بانو، بیتی کہانی، ص ۴۷

۱۵۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۲۹۹

۱۶۔ قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے، ص ۲۸۸

۱۷۔ محمد طفیل، نقوش، فن اور شخصیت نمبر، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۹

۱۸۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۹۴

۱۹۔ صالحہ عابد حسین، سلسلہ روز شب، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، پیش لفظ، ص ۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۸

۲۲۔ ایضا، ص ۱۵

۲۳۔ ایضا، ص ٦۵

۲۴۔ مرزا اسد اللہ خان غالب، دیوان غالب، انجمن ترقی ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۵

۲۵۔ سراج اورنگ آبادی، انتخاب سراج اورنگ آبادی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹٦۹ء، ص ۲۴

۲٦۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہء دانیال، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۳۲۰

۲۷۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، کراچی، ص ۲۸

۲۸۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہم سفر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۹

۲۹۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، سجاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹٦ء، ص ٦

۳۰۔ ایضا، ص ۱۵

۳۱۔ ایضا، ص ۲۵

۳۲۔ ایضا، ص ۳۱

۳۳۔ ایضا، ص ۸۸

۳۴۔ عطیہ داود، آئینے کے سامنے، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء، پیش لفظ

۳۵۔ ایضا، ص ۱

۳٦۔ ایضا، ص ۱۱

۳۷۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، اردو دادکامی، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ٦۵

۳۸۔ ایضا، ص ۲۲

۳۹۔ ایضا، ص ۸

۴۰۔ ش، فرخ، جینے کا جرم، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۴۰

۴۱۔ ایضا، ص ۵

۴۲۔ افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، فیروز سنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰۸

۴۳۔ ایضا، ص ۱۲۲

۴۴۔ ایضا، ص ۲۷

۴۵۔ ایضا، ص ۱٦۹

۴٦۔ ایضا، ص ۲٦٦

۴۷۔ اسرار الحق مجاز، کلیات مجاز، کتابی دنیا، دہلی، ص ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۲

۴۸۔ فوزیہ خانم، ڈاکٹر، آپ بیتی ٹیڑھی پسلیوں کی، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۳۲۸
۴۹۔ حمیدہ سالم، شورش دوراں، آبشار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۷۶
۵۰۔ نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، ص ۳۹
۵۱۔ ناصر کاظمی، دیوان ناصر کاظمی، حسابی بک ڈپو، حیدر آباد، ص ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۵
۵۲۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ لے کر، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۲۲
۵۳۔ ایضاً، ص ۹۸
۵۴۔ زہرا دوٗدی، گرداب کی شناوری، جاوداں پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۲۔
۵۵۔ شاد عظیم آبادی، کلیات شاد، مرتب کلیم الدین احمد، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۷۵ء، ص ۵۵۷
۵۶۔ صغرا مہدی، حکایت ہستی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۔۱۹
۵۷۔ ایضاً، ص ۵۸
۵۸۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، کشور ناہید، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰
۵۹۔ انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۲۹
۶۰۔ ایضاً، ص ۱۳۹
۶۱۔ حنا جیلانی، عورت اور سیاسی تحریکیں، مشمولہ عورت زبان خلق سے زبان حال تک، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۷۳
۶۲۔ مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بہشتی زیور، توصیف پبلی کیشنز، لاہور، س،ن، ص ۲۳۴۔۲۳۵
۶۳۔ شہر بانو، بیتی کہانی، ص ۵۷
۶۴۔ ایضاً، ص ۶۰
۶۵۔ ایضاً، ص ۹۷
۶۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲ تا ۱۰۳
۶۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳
۶۸۔ خورشید انور، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور، انجمن ترقی ہند، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۳
۶۹۔ قرۃ العین حیدر، کارجہاں دراز ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳
۷۰۔ روش ندیم، ڈاکٹر، منٹو کی عورتیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۷
۷۱۔ قرۃ العین حیدر، کارجہاں دراز ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۸۶
۷۲۔ ایضاً، ص ۵۳۷

۷۳۔ ایضا، ص ۶۱۴

۷۴۔ ایضا، ص ۵۷۲

۷۵۔ ایضا، ص ۴۴۷

۷۶۔ صالحہ عابد حسین، سلسلہ روز و شب، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۷

۷۷۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۰

۷۸۔ ایضا، ص ۲۷

۷۹۔ ایضا، ص ۱۸۲

۸۰۔ ایضا۔ ص ۲۷۷

۸۱۔ لیلے احمد، عورت جنسی تفریق اور اسلام، دستاویز، مطبوعات مشعل، لاہور، ۱۹۹۲، ص ۵۵

۸۲۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۳۳

۸۳۔ ایضا، ص ۳۱

۸۴۔ ایضا، ص ۵۹

۸۵۔ ایضا، ص ۲۵۲

۸۶۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۳۷۶

۸۷۔ ایضا، ص ۱۵۲

۸۸۔ ایضا، ص ۱۶۴

۸۹۔ ایضا، ص ۱۶۶

۹۰۔ شاداب سید، ڈاکٹر، اردو میں خواتین کی خودنوشتیں اور سماجی سروکار، بمبئی، ۲۰۰۸ء، ص ۴۱

۹۱۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہم سفر، کراچی، ص ۴۸

۹۲۔ ایضا، ص ۱۱

۹۳۔ ایضا، ص ۱۰۱

۹۴۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، ص ۱۰

۹۵۔ ایضا، ص ۳۳

۹۶۔ ایضا، ص ۸۱

۹۷۔ عطیہ داؤد، آئینے کے سامنے، ص ۵

۹۸۔ ایضا، ص ۲۳

۹۹۔ ایضا، ص ۳۰

۱۰۰۔ ایضا، ص ۳۵

۱۰۱۔ ایضا، ص ۴۸

۱۰۲۔ ایضا، ص ۴۳

۱۰۳۔ ایضا، ص ۱۲۲

۱۰۴۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، ص ۴۱

۱۰۵۔ ایضا، ص ۴۹

۱۰۶۔ ایضا، ص ۶۰

۱۰۷۔ ایضا، ص ۷۷

۱۰۸۔ ایضا، ص ۱۲۴

۱۰۹۔ ش۔ فرخ، جینے کا جرم، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۰

۱۱۰۔ ایضا، ص ۶۷

۱۱۱۔ افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، ص ۷ تا ۸

۱۱۲۔ ایضا، ص ۴۱

۱۱۳۔ حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص ۱۳۸

۱۱۴۔ نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، ص ۶

۱۱۵۔ ایضا، ص ۹۰

۱۱۶۔ ایضا، ص ۱۹۲

۱۱۷۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ لے کر، ص ۷

۱۱۸۔ ایضا، ص ۲۷

۱۱۹۔ ایضا، ص ۸۹

۱۲۰۔ ایضا، ص ۲۹۹

۱۲۱۔ صغرا مہدی، حکایت ہستی، ص ۱۲

۱۲۲۔ عذرا عباس، میرا بچپن، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ص ۲۰۰۱ء، ص ۶۱

۱۲۳۔ ایضا، ص ۶۶

۱۲۴۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹

۱۲۵۔ ایضا، ص ۵۴

۱۲۶۔ کشور ناہید، بری عورت کی دوسری کتھا، ص ۱۰۳

۱۲۷۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۵۷

۱۲۸۔ ایضا، ص ۲۵

۱۲۹۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۱۶

۱۳۰۔ کشور ناہید، بری عورت کی دوسری کتھا، ص ۱۳

۱۳۱۔ ایضا، ص ۱۹

۱۳۲۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۳۳

۱۳۳۔ قاسم یعقوب، لفظ اور تنقید معنی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۳۱۰

۱۳۴۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت، مشعل، لاہور، س۔ن ندرد، ص ۱۰

۱۳۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، ص ۱۶۲

۱۳۶۔ شہر بانو، بیتی کہانی، ص ۶۷

۱۳۷۔ ایضا، ص ۱۶۔

۱۳۸۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، انفرادی اور معاشرتی نفسیات، سنگ میل، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰

۱۳۹۔ شہر بانو، بیتی کہانی، ص ۱۲۸

۱۴۰۔ قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے، ص ۷۵۷

۱۴۱۔ صالحہ عابد حسین، سلسلہ روز شب، ص ۲۶۷

۱۴۲۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، ص ۲۴۳

۱۴۳۔ ایضا، ۲۳۴

۱۴۴۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۱۸

۱۴۵۔ ایضا، ص ۲۹

۱۴۶۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہم سفر، ص ۷۲

۱۴۷۔ ایضا، ص ۱۰۰

۱۴۸۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، ص ۲۳۴

۱۴۹۔ ایضا، ص ۱۴۸

۱۵۰۔ ایضا، ص ۴۴

۱۵۱۔ ایضا، ۱۰۶

۱۵۲۔ ایضا، ص ۱۱۸

۱۵۳۔ عطیہ داؤد، آئینے کے سامنے، ص ۱۸

۱۵۴۔ ایضا، ص ۳۸

۱۵۵۔ ایضا، ص ۶۲

۱۵۶۔ ایضا، ص ۷۰

۱۵۷۔ ایضا، ص ۸۰

۱۵۸۔ ایضا، ص ۸۰

۱۵۹۔ ایضا، ص ۱۱۴

۱۶۰۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، ص ۳۸۵

۱۶۱۔ ایضا، ص ۱۶۲۔ ۱۶۱

۱۶۲۔ ایضا، ص ۱۶۶

۱۶۳۔ ایضا، ص ۱۸۸

۱۶۴۔ ایضا، ص ۲۵۷

۱۶۵۔ ایضا، ص ۵۱۴

۱۶۶۔ افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، ص ۹۸

۱۶۷۔ ایضا، ص ۱۰۷

۱۶۸۔ ایضا، ص ۳۲۹

۱۶۹۔ ایضا، ص ۱۰۷

۱۷۰۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ لے کر، ص ۱۶۶

۱۷۱۔ ایضا، ص ۳۴۳

۱۷۲۔ ایضا، ص ۵۷۱

۱۷۳۔ عذرا عباس، میرا بچپن، ص ۲۱

۱۷۴۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۱۶

۱۷۵۔ ایضا، ص ۴۰

۱۷۶۔ ایضا، ص ۴۱۔

۱۷۷۔ انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، ص ۲۵

باب سوم:

خواتین کی آپ بیتیوں میں تانیثی شعور: عائلی حیثیات کے تناظر میں

الف۔ روایتی عائلی تصورات:

ا۔ غیرت وعصمت:

عصمت سے مراد پاکیزگی ہے لڑکی کے جنسی کردار کو غیرت و عصمت کا نام دیا جاتا ہے ہمارے معاشرے میں عورت کو اپنی جنس پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اس لیے غیرت و عصمت کا لفظ صرف عورت کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ عزت و عصمت کی حفاظت کا تحفظ ہر عورت کی ذمہ داری ہے جس کا محافظ مرد کو قرار دیا تاکہ معاشرے میں انتشار پیدا نہ ہو۔ مذہبی لحاظ سے اپنی شرم گاہوں کی حفاظت نہ کرنے والے مرد اور عورت دونوں کو زنی قرار دیا گیا۔ ان احکامات کی غلط تشریحات کر کے عورت کا قتل عام اور استحصال غیرت و عصمت کے نام سے کیا جانے لگا یوں زر ،زن اور زمین کی طرح عورت کو بھی مرد کی ملکیت بنا دیا گیا۔ مرد کی نسبت عورت کے ہر فعل کی کڑی نگرانی کی جانے لگی، بے باکی اور بغاوت کی صورت میں عورتوں کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں کی خرید و فروخت اور اغوا کو بھی شادی کی رسم کے طور پر متعارف کروایا جانے لگا۔ بیوی کو پردے میں رکھ کر غلام بنایا گیا۔ تاکہ وہ فرمانبردار ہو اور اس کی اولاد بھی اسی قانون پر عمل کرے۔ خلاف ورزی کی صورت میں جان سے مار دینے کے علاوہ اس کے ناک کان اور بال کٹ دیئے جاتے تھے۔ پردے کو لازمی قرار دیئے جانے کی وجہ عورت کو کسی اور مرد سے ناجائزہ جنسی تعلقات نہ بنانے سے روکنا اور اس بات کی تسلی کرنا ہے کہ بچے صرف اس کے شوہر سے ہوں تاکہ وہ جائیداد کے اصلی حق دار ہوں۔ غیرت اور عصمت فروشی کے عبرت ناک واقعات جنگوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن میں عورت کو اپنی عزت بچانے کے لیے جان سے مار دیا جاتا تھا تاکہ وہ دشمنوں سے جنسی تعلق نہ بنا سکے اور مزید دشمن کے بچے پیدا نہ کر سکے۔ ملکیت پرستی کی دوسری قسم عصمت فروشی تھی جہاں پر نکاح نامہ استعمال نہیں ہوتا۔ ”آزاد جنسی تعلق کا مطلب ہے کہ انفرادی رجحانات کو دبانا ہے۔ اس لیے اس کی سب سے سچی شکل عصمت فروشی ہے۔“[1]

یوں عزت کا تصور مختلف معاشروں اور زمانوں میں بدلتا رہتا ہے چنانچہ اس نظریے کی تفہیم کے لیے مختلف نظریات اور فلسفوں کا تجزیہ مختلف رہا۔یہ تصور معاشرے کے مادی،سماجی اور اقتصادی حقائق کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔عزت کا تصور اور اس کے نام پر ہونے والا تشدد معاشرے کے سماجی ڈھانچے کے ساتھ مربوط ہو گیا۔جس نے اپنے پنجے پوری دنیا میں پھیلائے ہوئے ہیں عزت کے نام پر قتل صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک میں بھی ہو رہے ہیں یہاں تک کہ یورپ اور امریکہ جیسے ممالک میں بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔صنفی بنیادوں پر کیے جانے والے تشدد کا واحد محرک عزت کا ثقافتی نظریہ ہے جو مادی طاقتوں میں تبدیلی کے ساتھ ہی پیداواری طاقتوں میں بھی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔پیداواری تعلقات لوگوں کے سماجی رشتوں کے پورے نظام میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں جو سماجی،سیاسی،قانونی،ثقافتی اور دیگر سماجی اداروں کے تصورات کو جنم دیتے ہیں۔معاشی نظام میں محنت کی تقسیم صنف کی بنیاد پر ہوئی۔نجی املاک نے مردوں میں اپنے بچوں کے لیے وراثت کے قاعدوں میں تشویش پیدا کر دی اور یک زوجی کی راہ دکھائی جس میں عورت کو ایک ہی شوہر تک محدود رکھا گیا مگر شوہر اس معاملے میں آزاد ہے وہ غیر ذمہ دارانہ طور پر جنسی تعلقات قائم کر سکتا ہے۔وہ اپنی بیوی کی افزائش نسل کی نگرانی اس لیے کرتا ہے کیوں کہ حق وراثت باپ کی طرف سے منتقل ہوتی ہے۔یوں طاقت کا بہاؤ غیر متوازن ہو کر صرف مرد کی طرف جھک جاتا ہے۔عورت کی شکست اور ان پر ظلم،عزت کے نام پر تشدد مارکسی تشریح کے تحت بھی ہوتا ہے جس میں جاگیردارانہ،سرمایہ دارانہ اور قبائلی نظام برابر کے شریک ہیں۔اس لیے عورتوں کی خصوصیات معاشرے میں نسوانیت اور مردانگی کے تصورات پر قائم کی گئی ہیں جو فطری امور پر نہیں بلکہ سماج کی تشکیل کردہ ہیں۔دنیا کے ستاون مسلم ممالک میں زیادہ تر جاگیردارانہ اور قبائلی نظام نافذ ہے۔نسل اور ثقافت سے ہٹ کر سب سے بڑی تقسیم طبقاتی تقسیم ہے جس کے تحت برداری یا خاندان کی سطح پر عورت کا کردار اور مقام متعین کیا جاتا ہے۔جس کے لیے کچھ اصول وضوابط قائم کیے جاتے ہیں جو لڑکا / لڑکی خاندانی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پسند کی شادی کریں یا عشق کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو بھائی اس کو قتل کر دیتے ہیں کیوں کہ خاندان کی عزت وآبرو بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے بدلے میں بھائی کو جنت ملے گی۔ان کو تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب کی جنت خاندان کے نظام کو قائم رکھنے سے ہی ملے گئ جو عشق ومحبت کے خلاف ہے اور نوجوان نسل کو عاشق بننے سے روکتی ہے۔یہ سب کچھ ان سے آزادی اور اختیار چھین کر انہیں غلام بنا کر رکھتا ہے۔خاندان جو غلامی باپ،بھائی اور ماں کے ذریعے کرواتے ہیں یہ جنسی غلامی ہے عشق سے روکنے کا مطلب ہے کہ لڑکا لڑکی کو جنسی رشتہ قائم رکھنے کا اختیار نہیں ہے۔لڑکی کے لیے لڑکے کا انتخاب اس کے

باپ، بھائی اور بزرگ کرتے ہیں جو گھر کے بادشاہ وزیر اور امراء ہیں۔ خاندانی حکمرانی کو نفسیات کی زبان میں جنسی حکمرانی کہا جاتا ہے جس کے تحت خاندان کے کنٹرول کو نفسیات کی زبان میں جنسی آمریت کا نام دیا جاتا ہے اسی قانون پر عمل پیرا ہو کر لڑکیوں پر سخت قسم کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں جس کی زد میں کشور ناہید اور عطیہ داؤد آئیں۔ والدین شادی سے پہلے لڑکے کو پرکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کیسا ہے اس کی کتنی کمائی ہے؟ اور لڑکے والے اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ لڑکی کے بھائی کیا کرتے ہیں اور وہ کتنا جہیز ساتھ لائے گی؟ یہ اقتصادی شرائط بھی جنسی آمریت کے زمرے میں آتی ہیں۔ لڑکے کی شرافت اور لڑکی کی خوب صورتی کا معیار بھی جنسی شرائط کی ایک کڑی ہے یہ تمام گارنٹیاں محبت سے عاری ہوتی ہیں جو ایک قانونی عصمت فروشی بن جاتی ہیں۔ جس کے تحت دو میاں بیوی محبت کی بنیاد پر رشتہ نہیں نبھاتے بلکہ اقتصادی اور سماجی مفادات کی سودے بازی کرتے ہیں۔ ایسے رشتے مجبوری کے رشتے ہوتے ہیں۔ جو کبھی بھی عاشقانہ اور تخلیقی رشتے نہیں ہو سکتے آخر کار طلاقیں ہو جاتی ہیں۔ شادی محبت کے نام پر ہو یا والدین کی مرضی سے اکثر میکانکی بندھن کی وجہ سے طلاق کی نذر ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں محبت بھی ایک ارمان ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ خاندانی نظام کے رسم ورواجوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے عاشقوں کی لاکھوں کہانیاں سامنے آچکی ہیں اور حکایات بن گئیں۔ ہمارے بزرگ نئی نسل کے ترقی پسندانہ خیالات کو کچل کر قدیم جنگلی نظام کو نئی نسل کے سر پر مسلط کر دیتے ہیں۔ جب کہ تخلیقی عمل کو کچلنے کی تحریک خاندان سے شروع ہوتی ہے۔ خاندان بچے کی تخلیقی صلاحیتوں کو اخلاقیات کے نام پر کچل دیتے ہیں والدین بچے کی سیکس کہلانے والی تخلیقی قوت کو انسان دوستی اور فنکاری کے راستے پر نہیں چلنے دیتے بلکہ وہ گھٹن اور اجتناب میں غرق کر دیتے ہیں۔ دونوں قسم کے قتل کھلے عام اور ہر وقت ہوتے رہتے ہیں۔ کسی لڑکے سے پسند کی شادی کرنے، والدین کے نہ ماننے پر بھاگ کر شادی کرنے کی صورت میں لڑکا لڑکی کو غیرت کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے زبیر رانا لکھتے ہیں: "لڑکیوں کو قتل کرنے والے باپ اور بھائی عدالت میں بھی اعتراف جرم کر لیتے ہیں اور پھانسی یا عمر قید کی سزا پا کر فخر سے یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے خاندان کی خاطر یہ سزا پائی ہے۔"(۲)

پدرسری نظام میں عورتوں کے لیے اخلاقی پیمانے مردوں کی نسبت جدا ہیں عزت وناموس کو صرف عورت کے ساتھ ہی جوڑا جاتا ہے جبکہ مرد اس اخلاقی قدر سے آزاد ہیں۔ اس معاشرتی ناانصافی کا ذکر سبط حسن نے اپنی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" میں بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "عصمت اور پاکبازی ہمارے معاشرے میں فقط عورت کا زیور ہیں۔ عورت میں اگر یہ وصف نہ ہو تو ہم اسے بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں۔ البتہ مرد کا محاسبہ اس سختی سے نہیں

ہوتا۔ حالانکہ جنسی تعلقات میں عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اور انصاف کا تقاضا بھی یہ ہی ہے کہ دونوں کی ذمہ داری مساوی ہو۔ "[۳]

دوسری طرف خاندان کی جائیداد بچانے کے لیے بھی اکثر بے جوڑ شادیاں کردی جاتی ہیں جو دیرپا ثابت نہیں ہوتیں۔ اکثر خواتین کو گھر سے باہر جانے اور بے پردہ ہونے پر گھر کے مرد کڑی سزا دیتے ہیں۔ پدرسری نظام کے تحت مرد کو ملنے والی برتری نے صنفی ناہمواری کو ہوا دی۔ طاہرہ ایس خان اپنی کتاب "عزت کے نام پر" میں مردوں کے عورتوں پر ظلم کا حوالے دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ مرد بڑے فخر سے کہتے ہیں:

"ہم مرد ہیں، وہ عورتیں ہیں، وہ کمزور ہیں ہم گھر کے سربراہ ہیں، وہ محض اس میں رہنے والیاں ہیں، ہم شوہر ہیں وہ بیویاں ہیں، ہم ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں، لیکن کوئی عورت ایک سے زیادہ شوہر نہیں رکھ سکتی، ہم کبھی کبھی عورت کو بے رحمی سے قتل کر دیتے ہیں، کیوں کہ اس نے چار دیواری (گھر) سے آگے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ "[۴]

پاکیزگی، صالحیت اور شرافت کے نام پر بھی لڑکیوں کو زندہ دفن بھی کر دیا جاتا ہے ہمارے ہاں عورت کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے عورت کی عزت کو خاندان کی عزت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا مرد کی عزت اس وقت تک محفوظ ہے جب تک کہ اس کے خاندان کی عورتوں کا پردہء بکارت ثابت وسالم ہے اس تحفظ کا تعلق اس کے رویے سے کہیں زیادہ اس کے خاندان کی عورتوں کے رویے سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر لڑکیوں کو ان کے خاندان والے محض کنوارپن کھو دینے کے شک وشبہات میں ہی قتل کر دیتے ہیں۔ اس کا صرف پردے سلامت ہونا ضروری نہیں بلکہ پہلے جنسی ملاپ کے بعد پردے میں سے خون ہی نہیں نکلنا چاہیے بلکہ اس کا ثبوت بھی نظر بھی آنا چاہیے ورنہ شوہر بیوی کو طلاق دے کر رخصت کر دے گا۔ اس کا کھو جانے سب سے بڑی اخلاقی گراوٹ سمجھی جاتی ہے شادی ایک قانونی اور عمرانی معاہدہ ہے اور بیوی کا زنا بالرضا میں ملوث ہونا اس معاہدے کی خلاف ورزی ہے کیوں کہ کنوارے پن نے ایک اخلاقی، مذہبی اور صوفیانہ قدر اختیار کرلی۔ آج بھی وسیع پیانے پر اس کو مانا جاتا ہے۔ سمیون دی بواو کے مطابق:

فرانس کے کچھ علاقوں میں دولھا کے دوست ہنسی مذاق کرتے اور گانے گاتے ہوئے کمرہ عروسی کے باہر منتظر رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ شوہر فاتحانہ انداز میں باہر نکل کر انہیں خون آلودہ چادر دکھاتا ہے یا پھر والدین اگلی صبح کو یہ چادر پڑوسیوں کو دکھاتے ہیں۔ "[۵]

پردہ بکارت کی اتنی سخت شرائط کی وجہ سے بہت سے مسلم ممالک میں کنوارے پن کو برقرار رکھنے کے لیے عورتوں کے ختنے بھی کیے جاتے تھے۔ جبرالدین بروکس کی "کتاب پردے کے پیچھے" کے مطابق اس رسم کا آغاز

افریقہ سے ہوا وہاں سے پھیلتے ہوئے دوسرے اسلامی ممالک میں پہنچا۔اس رسم میں چھ سات سال کی بچیوں کے کلائٹورس کا ۸ / ۱حصہ کاٹ دیا جاتا تھا۔ جس سے ان کی پاک دامنی کو تحفظ دینے کی امید کی جاتی کیوں کہ اسی پاک دامنی پر لڑکیوں کے باپ بھائیوں کی عزت کا انحصار تھا۔ بصورت دیگر پردہ بکارت کی مرمت اور کنوارے پن کی بحالی کی صورت میں لڑکیوں کی صحت کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں اس آپریشن کو لندن میں غیر قانونی قرار دیا گیا اس کے باوجود یہ رسم ختم نہ ہوئی کیوں کہ شادی سے پہلے کسی لڑکی پر بدکاری کا الزام بھی لگ جائے تو پورے خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے۔سندھ میں کاروکاری کی اصطلاح ناجائز جنسی تعلقات میں ملوث مرد عورت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جس کو بلوچ قبیلے اپنے ساتھ لے کر آئے کاری عورت کو بد چلن کا لیبل لگا کر کسی دلال کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا ہے جو اس کو باہر کے ممالک میں بیچ دیتا ہے۔ عورتوں کا تبادلہ تجارت کی پہلی شکل ہے جس میں انسانوں کو اشیاء سمجھا جاتا ہے لیوی اسٹر اس کے مطابق عورتوں کا یہ ہی تبادلہ ان کی محکومیت کے آغاز کا باعث بنا۔ عصمت فروشی کا پیشہ انسانی تاریخ میں اولین پیشہ ہے۔ودیت میں بھی عورت کو ہی دیا جاتا ہے تاکہ دو قبیلوں کے درمیان جھگڑا ختم ہو سکے۔ قبائلی اور جاگیر دارانہ نظام میں برداری لازمی طور پر ہر صورت اور ہر حال میں مثبت کردار ادا نہیں کرتی تاہم جرگہ اسے ایک مثبت رخ دے کر ایک طاقت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ سیاسی خاندان اپنے سیاسی کارکن کو اس لیے برباد کر دیتا ہے کہ معزز سیاسی خاندان اپنی لڑکی کے جسم پر چڑھ ہوئے لباس کو اپنا پارسل سمجھتا ہیں جس کو کھولنے کا اختیار اپنی مرضی کے فرد کو دیا جاتا ہے جنس پر مسلط اس قسم کی اجارہ داری کے خلاف نوجوان نسل کی بغاوتیں ہمیشہ ہی تخلیقی اور تعمیری نہیں ہوتیں بلکہ جنسی رشتے اور تخلیقی قوتوں کو روکنے کے لیے ہوتی ہیں۔ چوری آنکھیں لگانے والے ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں عزت و عصمت کے نام پر قتل ہوتے ہیں مگر وہ اس چوری کی محبت کو بغاوت کا فن سمجھتے ہیں۔ بڑے بزرگ ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ وہی کچھ ہو جو ماضی میں ہوتا رہا ہے خواہ یہ ناانصافی ہی کیوں نہ ہو وہ کچھ نہ ہو جو نہیں ہوا۔ اپنی فرسودہ اور پرانی روایات پر اٹکے رہنا ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ عصمت فروشی کی پہلی مثال مندروں میں دیوداسیوں کی ہے جو مندر میں پنڈتوں کی ہوس کا نشان بنیں۔ عیسائیت میں یہ ہی کام پادری سرانجام دیتے ہیں جو خاندانی خواہش پر حاصل کی گئی عورت کو نن بنا کر دل کھول کر اپنی جنسی ہوس کو پورا کرتے ہیں اگر کوئی عورت نن بننا پسند نہ کرے تو پادری اس پر جادوگرنی / شیطان کے ساتھ بد فعلی کا الزام لگا کر جلا دیتے تھے۔ دور جدید میں مزاروں / تعویز دھاگہ کرنے والے لوگ اکثر عورتوں کی عزتیں پامال کرتے ہیں۔ مرد متنوع جسمانی تعلقات کے باوجود بھی کنوارہ رہتا ہے اور اس کی عزت برقرار رہتی ہے جبکہ عورت کی دانستہ اور نادانستہ کوئی ایک غلطی ساری عمر کی سزا بن جاتی ہے یہ تمام اخلاقی، مذہبی قوانین صرف عورت

جیسے کمزور طبقے پر لاگو ہوتے ہیں مرد نے سماجی اور معاشی طور پر عورت کو اپنی زندہ ملکیتی شے بنالیا ہے۔اس پدر سری نظام میں کئی کئی بیویوں اور لونڈیوں کے باوجود چکلوں میں مرد جاتے ہیں۔ان پسماندہ علاقوں کے امیر، جاگیر داراور حکمران طبقے کے لوگ ان چکلوں کی زینت بڑھاتے ہیں۔چکلے والی عورتیں زیادہ مجبور اور بے بس ہوتی ہیں جو گھریلواور باعزت زندگی گزارنا چاہتی ہیں مگر معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔بظاہری طور پر دولت لٹاکر جنسی داد عیش دینے والے لوگ ان سے زیادہ کم تر اور حقیر ہوتے ہیں جو خود چل کر آتے ہیں۔یہاں پر یہ لڑکیاں غربت، تنگ دستی، ملازمت کے بہانے، جبری اغوا یا محبت کے فریب میں مبتلا کر کے لائی جاتی ہیں۔ان چکلوں میں ہی حکمران، راجے، مہاراجے اپنے بچوں کو تربیت دینے کے لیے طوائف کے پاس لاتے ہیں۔یہ ہی امیر لوگ گھر کی چار دیواری سے نکال کر عورت کو چکلے کے کوٹھے تک لے کر آتے ہیں۔عورتوں کو دوسرے ملک سمگل کرنے والے بھی یہ ہی لوگ ہیں۔کسی خاندان یا قبیلے کے افراد قتل ہو جائیں تو مخالف قبیلے یا خاندان کو خون بہا کے لیے اپنی بیٹیاں ہی پیش کی جاتی ہیں جائیداد یا قرض معاف کروانے کے لیے بھی معصوم اور پیاری بیٹیاں سونپ دیتے ہیں۔ پاکستان میں لاڑکانہ (سندھ) میں کاروکاری اور نام نہاد وغیرت کے نام پر زیادہ قتل ہوتے ہیں۔اس طرح ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو نچلا دکھلانے کے لیے ان کی عورتوں کا ریپ کرتا ہے تاکہ وہ نفسیاتی طور پر ان کو احساس دلاسکیں کہ وہ کس قدر مجبوراور بے کس ہیں کہ اپنی عزت کی حفاظت نہیں کرسکتے۔یہ ہی نفسیاتی پہلو ملکوں کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔فرقہ وارانہ فسادات چین، انڈونیشیا، پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہی کیوں نہ ہوں؟سب سے زیادہ ظلم عورتوں پر ہی ڈھائے جاتے ہیں۔ان کی عورتوں کو برہنہ کر کے ریپ کیا جاتا ہے تاکہ اپنی مردانگی اور طاقت کا مظاہرہ کر کے مخالف کا مذاق اڑایا جاسکے اس دوران صرف عورتوں کو تشدد کا نشانہ ہی نہیں بنایا جاتا بلکہ ان کا یہ عمل مخالفت کو بڑھانے اور نفرت کو پھیلانے کا باعث بھی بنتا ہے، تاکہ دوسرا قبیلہ شکست خور ہو کر عبرت کی تصویر بن جائے۔ان فسادات کی ہولناک تصویر ۱۹۴۷ء کی تحریک آزادی کے واقعات میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔جب دونوں فرقوں کے لوگوں نے ایک دوسرے کا قتل عام کیا۔ملکیتیں لوٹیں اور خاص طور پر عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔بعض صورتوں میں انہیں قتل کر دیا گیا تو بعض حالات میں انہیں داشتہ بنا دیا گیا۔

ہمارے معاشرے میں عورت کا استحصال گھر سے باہر، بس سٹینڈ یا دفتر میں بھی کیا جاتا ہے۔مزاحمت کرنے پر بدنامی کا دھبہ، چہرے پر تیزاب گرانے اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں۔دوسری پارٹی دولت مند ہونے کی وجہ سے قانونی کاروائیوں سے بھی محفوظ رہتی ہے۔گھر کی چار دیواری میں بھی عورت کی عزت محفوظ نہیں۔مشترکہ خاندانی نظام میں اکثر دیور یا جیٹھ کی ہوس بھری نظریں اس کا تعاقب کرتی ہیں عورت خود بھی اس

موضوع پر بات کرتے ہوئے شرماتی ہے اگر ہمت کر کے بتانے کی جرات کر بھی لے تو کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہیں کرتا بلکہ الٹا قصوروار اسی کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کی باتوں میں صداقت نظر آتی ہے وہ اس کو گھر برباد کرنے کی بجائے خاموش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بہتان تراشی کرتے ہیں۔ ذہنی اور جسمانی طور پر اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ریپ کی وجہ عورت کا لباس، آرائش وزیبائش اور اس کے جسم کو قرار دیا جاتا ہے اگر اس بات میں سچائی پائی جاتی ہے تو مردہ خواتین اور چھوٹی بچیوں کی عزت کو کیوں برباد کیا جاتا ہے ؟ لڑکیوں کی آبروریزی کی بڑی وجہ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے نام پر دی جانے والی گالیاں ہیں۔ مختلف قسم کی پھبتیاں اور لطائف خواتین کے جسم سے جوڑ دیے جاتے ہیں تاکہ اس کو نیچا دکھایا جاسکے اس کی انتہائی گھٹیا شکل ریپ کرنا ہے۔ ریپ شدہ عورتیں جس نفسیاتی اذیت کا شکار ہوتی ہیں اس تکلیف کا اندازہ لگانا مشکل ہے ایک طرف وہ خود اپنی نظروں سے گر جاتی ہیں تو دوسری طرف معاشرے میں ان کا احترام نہیں کیا جاتا۔ وہ ایک زندہ عبرت کا نشان ہوتی ہیں جو نہ جی سکتی ہیں نہ مر سکتی ہیں یا تو وہ خودکشی کرتی ہیں یا پھر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہیں۔ عصمت فروشی کے ایسے ہی واقعات خواتین نے اپنی تصانیف میں تحریر کیے ہیں جن میں مالی حالات سے تنگ آکر اکثر شوہر اور سسرال والے خود بھی عورت کو کسی امیر آدمی کے ساتھ جنسی روابط قائم کر کے پیسہ کمانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جدیدیت اور انقلاب کے نام پر بھی لڑکیوں کی عزت وعصمت کو لوٹا جاتا ہے۔

دوسری طرف حکومتیں بھی عورتوں کو دبانے کی کوشش کرتی ہیں پاکستان میں ایسی صورت الحال ضیاء الحق کے دور میں پیدا ہوئی ان کے دور میں حدود آرڈیننس نافذ کیا گیا جس میں عصمت فروشی کو چادر اور چار دیواری کے پردے میں صرف امیر لوگوں کی حد تک محدود کر دیا گیا۔ اس کے ذریعے عورت کی مرضی سے شادی کا حق بھی چھین لیا گیا۔ یہ صورت حال آج بھی اغوا، زنا اور قتل کی صورت میں موجود ہے۔ عورت کو ورغلانے کے لیے اس پر ہر طرح سے جنسی حملے کیے جاتے ہیں جن سے بعض اوقات وہ بچ جاتی ہے تو بعض اوقات ان حملوں کی زد میں آکر معاشرتی وقار کھو بیٹھتی ہے۔ یوں عزت کا تصور مختلف معاشروں اور زمانوں میں بدلنے کے ساتھ ساتھ قائم رہتا ہے خواتین نے اپنی آپ بیتیوں میں عزت وعصمت کے لرزہ دینے والے واقعات قلم بند کیے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو سیر وسیاحت کا بہت شوق تھا ہیں وہ ایک دفعہ چٹاگانگ کے ہل ٹریکس پر سیر کر رہی تھی اس دوران انہوں نے مشاہدہ کیا کہ قبائلی عورتیں کھیتوں میں بیٹھی بڑی محنت سے کام کر رہی ہیں جبکہ مرد مزے سے گھروں میں بیٹھے چرس پی رہے تھے۔ سندھ کے ضلع سکھر میں نہر کے کنارے ان کی گاڑی ہچکولے لے رہی تھی اس سفر میں بروہی صاحب ایک گائیڈ اور رہنما کے طور پر اپنے بروہی قبیلے کے بارے میں آگاہ کرنے لگے اس قبیلے کے

لوگ رسم ورواج کے پابند تھے ان کے ہاں رواج تھا کہ اگر کوئی لڑکی گھر سے بھاگ جائے اور بدقسمتی سے پکڑی جائے تو اسے دلہن بنا کر سارا خاندان دریا کے کنارے لے جاتا ہے۔ وہاں پر اس کو دوزانو بیٹھا کر اس کے ہاتھ باندھ دیئے جاتے ہیں اور کلہاڑی سے اس کا سر تن سے جدا کیا جاتا ہے۔ ان کے اس بیان پر قرۃ العین نے حیرت سے کہا: "بروہی صاحب جس خطے کے شاعروں نے سسی اور ماروی جیسی باہمت اور باشعور ہیروینوں کی تخلیق کی وہاں کی لڑکیوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک؟"(۶)

ان کے گھر سے بھاگنے کی وجہ والدین کا ان کی پسند کی جگہ شادی نہ کرنا ہی تو ہے جنگوں کا تذکرہ ہوئے لکھتی ہیں کہ جنگوں میں فاتح صرف زمین کا ایک ٹکڑا ہی نہیں لے جاتے بلکہ دشمن کی عورت اور بچے کو پال کر گڑھی محل پر اپنا فتح کا پرچم لہراتے ہیں۔ یوں عورت کو دشمن کے بچے پیدا کرنے اور پالنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

عصمت چغتائی بھی عزت و عصمت کا تذکرہ اپنی آپ بیتی میں کرتی ہیں کہ بیوہ لڑکیاں اغوا بھی ہوتی ہیں اور کسی کے ساتھ بھاگ بھی جاتی ہیں۔ کراچی میں ان کی بہت بڑی مارکیٹ ہے وہاں کے مقامی وڈیرے جوان تندرست لڑکیاں شوق سے خریدتے ہیں اور ان کے چنگل سے وہ مر کر ہی نکلتی ہیں۔ اعلابی کے ہوسٹل میں بہت سی مجبور اور لاچار لڑکیاں رہتی تھیں جن میں سے ایک لڑکی کا میاں اور ساس اسے جسم فروشی پر مجبور کرتے تھے وہ لڑکی وہاں سے بھاگ کر آئی اس کے پیٹ میں چند ماہ کا حمل تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے راستے میں ایک ایسی عورت ملی جو اپنی بیٹی کو علی گڑھ مسلم گرلز اسکول میں داخل کروانے جا رہی تھی۔ رحم کھا کر اس نے اس بدنصیب عورت کو سہارا دیا اعلی بی کے سپرد کر دیا۔

ہجرت کے واقعات میں سب سے زیادہ مسائل عزت و عصمت کے سامنے آئے۔ اپنی عزت لوٹا دینے والی بیٹیوں کے والدین نے ان کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ان کی بے بسی نے گناہ کی شکل اختیار کر گئی۔ ان ہی لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے ادا جعفری اپنی دوست رابعہ کا تذکرہ کرتی ہے جس کی عزت کو بچانے کے لیے اس کے ہم جماعت لڑکے نے ساری رات پہرا دیا اور صبح اپنے گھر جانے کی اجازت دی۔ معاشرتی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی دوست رابعہ نے اسی لڑکے کو اپنے ساتھ شادی کرنے کا کہا کیوں کہ گھر سے باہر رات گزرنے والی لڑکی کیسے اپنے والدین کی نظروں کا سامنا کر سکتی ہے۔ ش۔ فرخ نے عورتوں کی عزت و عصمت پر بہت سی کہانیاں اپنی کتاب "کاری زخم" میں لکھیں، جس میں انہوں نے ظاہر کیا کس طرح جاگیر دارانہ اور قبائلی نظام غیرت کے نام پر عورتوں کو ابدی نیند سولا دیتا ہے۔ ایک جاگیر دار دیہاتی کارندے نے مصنفہ پر قاتلانہ حملہ کیا یوں حرص نے انسان کو درندہ بنا دیا ہے وہ جانی طور پر تو بچ گئی مگر ذہنی اور نفسیاتی طور پر بہت متاثر ہوئی۔ یوں ش۔ فرخ نے عورتوں کے لیے آزادانہ

زندگی کو ایک چیلنج کے طور پر لیا۔ ان کے بھائی اپنی بہن کی ملازمت کے بھی خلاف تھے یہ بات ان کی غیرت کے خلاف تھی کہ ایک علامہ کی بیٹی مردوں سے باتیں کرے۔

عطیہ داؤد اپنی آپ بیتی "آئینے کے سامنے" میں ایک فقیر کا تذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایک دن وہ ایک فقیر کی مدد کرنے گھر سے باہر گئی۔ چلتے چلتے وہ گاؤں کے آخری محلے میں آگئی۔ جہاں پر بہت سناٹا تھا۔ فقیر نے ان کو اکیلی دیکھ کر ہراساں کرنے بڑی کوشش کی اور عطیہ داؤد کو کہا تم سانپ دیکھو گی تو اس نے معصومیت سے کہاہاں اتنے میں فقیر سانپ والی پٹاری کھولنے کی بجائے اپنی دھوتی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ وہاں سے دوڑتی ہوئی واپس آگئی۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ اپنے خالہ زاد بھائی کے ساتھ گاؤں میں لکڑیاں کاٹنے گئی وہاں پر ہی ان دونوں کو شام ہوگئی۔ ان کی لکڑیاں ٹوکرے سے ابھی بھی کم تھیں۔ وہاں پر موجود ایک آدمی نے لکڑیاں اکھٹی کرنے میں ان کی مدد کی۔ وہ آدمی سید گھرانے کا تھا اور اس کی بیٹی عطیہ داؤد کی دوست تھی۔ عطیہ داؤد اس آدمی کی طرف اظہار تشکر کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ اس آدمی نے عطیہ داؤد کے قریب آکر جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس موقعے پر وہ لکھتی ہیں: "میں سمجھی میرے سر پر ہاتھ رکھ رہاہے، لیکن اس کا ہاتھ سر پر نہیں جسم پر رینگتا ہوا محسوس ہوا تو میں نے زور سے چیخ ماری۔"(۷)

دوسری طرف عطیہ داؤد پڑھے لکھے اور انقلابی ذہن کے مالک نوجوانوں پر بھی گہرا طنز کرتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ انقلابی جدیدیت کی آڑ میں بھی لڑکیوں کی عزت و عصمت کو لوٹ کر سو جاتے ہیں لڑکی کو جب ہوش آتا ہے تو وہاں انقلاب کے ڈھول کی جگہ نوحے سنائی دیتے ہیں۔ بعد میں وہ اس سب واقعے کو فریقین کی راضامندی قرار دیتے ہیں اور یہ تسلی دیتے ہیں جو کچھ ہوا ان کی مرضی سے ہوا۔ کوئی عزت کا مسئلہ نہیں ہوتا یہ تو عورت کو کمزور کرنے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے۔ ساجدہ زیدی نے عزت و عصمت کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے تحریک آزادی کا ذکر کیا ہے جب بڑی بے دردی سے عورتوں کی عزتیں پامال ہوئیں بہت سی عورتوں نے اپنی عزت کو بچانے کے لیے بڑی خوشی سے موت کو گلے لگالیا۔ جن کی عزتیں برباد ہوئیں ان سے اپنوں نے بھی منہ موڑ لیا ہجرت کے واقعات میں سب سے بڑے کرب ناک واقعات عورتوں سے کیے جانے والے سلوک کے متعلق ہیں۔ جب ساجدہ زیدی کی والدہ اور ان کی تینوں بہنیں خالی ہاتھ دو مردوں کے ساتھ تھیں۔ ان کی حفاظت کا نشان صرف سرخ بندیاں تھیں جبکہ یہاں ہر طرف قتل وغارت، لوٹ مار، عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی آبروریزی، اور بچوں کی ہلاکت کا بازار گرم تھا۔ انہوں نے چھوٹے ماموں کے مشورے پر مولانا ابوالکلام آزاد کے گھر میں پناہ لی تھی اور ان کے گھر پندرہ سولہ دن قیام کیا۔ وہ ایک ہی سوٹ کو بار بار دھو کر پہنے پر مجبور تھیں۔ قیمتی برتنوں میں تھوڑے سے ابلے ہوئے

دال چاول میں گزارہ کرتی تھیں۔اس کے باوجود اپنی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ وہاں پر ان کی عزتیں محفوظ تھیں جبکہ اس دوران بہت سی بے گھر، عورتیں بیوہ ہوئیں اور لاکھوں جوان لڑکیوں کی بے حرمتی ہوتی رہی۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم کا ایک واقعہ افضل توصیف بیان کرتی ہیں جب پنجاب کی ایک عورت کا بیٹا قتل ہوا اور بیٹی کا ریپ کیا گیا۔گھر چھین گیا اور خاوند کھو گیا آخر ان تمام دکھوں سے نجات موت کی صورت میں ملی۔وہ لکھتی ہیں:

> وہ دن جب گانو پہ قہر ٹوٹا اور گھر کی عورتوں اور بچوں نے یہاں پناہ لی تھی۔یہ دیواریں تو گواہ ہوں گی۔کس کی لاش کہاں گری، مگر یہ بتا نہیں سکتیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عمارتیں کتنی بے بس ہوتی ہیں۔"(۸)

یوں مصنفہ نے نہ صرف تقسیم ہند کا جبر دیکھا بلکہ ان کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک کو بھی بیان کیا خاص طور پر جو لڑکیاں اغوا ہو گئیں تھیں جب واپس آئیں تو ان کے لواحقین دوسروں کے سامنے ان کو اپناتے ہوئے بھی شرماتے تھے۔ گاؤں کے تیلی کی پندرہ سالہ لڑکی کو کوئی وحشی اٹھا کر لے گیا اور انہوں نے اپنے قبضے میں وہ لڑکی کرلی۔اس لڑکی نے اپنی نجات کے لیے خود جدوجہد کی۔ایک صبح کوڑے کا ٹوکرا باہر پھینکنے کا بہانہ کر کے آزاد ہوئی۔

کشور ناہید نے کہا کہ تحفظ کا لفظ عورت کے ساتھ لازم وملزم کر دیا گیا ہے جس کو مرد کی ذمہ داری کے کر دیا گیا۔ان کی نانی اور والدہ ایک عرصے تک دامادوں سے پردہ کرتی رہی۔ڈولی میں پتھر رکھا جاتا کہ دلہن کا وزن نہ معلوم ہو سکے۔ آٹے میں ہاتھ لپٹ کر نبض دکھائی جاتی تھی۔ پیروں تک برقعہ پہنا اس دور کا فیشن تھا۔برقعے میں اتنے پلیٹ پڑے ہوتے تھے کہ سارے جسم کے خطوط وضاحت کے ساتھ نظر آتے تھے بعد میں انکشاف ہوا کہ یہ خاص برقعے تو قادیانی فرقے پہنتے ہیں۔یہ ہی پردہ نشین عورت اپنے وطن کی آزادی کے لیے گھر سے باہر آئیں تو پردے کی کوئی پروانہ کی بلکہ کبھی چندہ جمع کر رہی ہیں تو کبھی بھوک ہڑتال، روز جلسے جلسوسوں میں شریک ہو رہی ہیں۔اسی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے اسی حوا کی بیٹیوں نے اپنی عزت و عصمت کو قربان کر دیا پورے شہر کی آنکھوں کا تارا علی گڑھ کی طالب علم لڑکی جب اغوا ہوئی اور بے ہوش ملی تو ہمدردی کے باوجود وہاں پر ہر رنگ کے فقرے سننے کو مل رہے تھے۔

انیس ہارون اپنی آپ بیتی "کب مہکے گی فصل گل" میں ریڈیو پاکستان کے متعلق ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ انہوں وائس آف امریکہ میں ہفتہ وار پروگرام کی پیش کش ہوئی اور وہ وہاں جانے لگی۔ان کا سٹوڈیو وائس آف امریکہ کے سفارت خانے میں ہی تھا وہ یہاں پانچ چھ پروگرام ریکارڈ کروا چکی تھی۔ایک مرتبہ پروڈیوسر نے ہفتے کے دن ریکارڈنگ کے لیے بلایا وہ وہاں پہنچی تو ہر طرف سناٹا تھا۔استفسار پر ریسپشن پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے کہا کہ آج تو

چھٹی ہے آج صرف وہی لوگ آئیں گئے جنہیں کام کرنا ہو گیا اور ساتھ ہی کہا اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے فون کر لیں بس ریسور اٹھالی گئی تو رابطہ ہو جائے گا۔ مصنفہ کو یہ بات بہت عجیب لگی تاہم شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گئی۔ پروڈیوسر عمر رسیدہ آدمی ہونے کے ساتھ ہی کئی بچوں کا باپ بھی تھا گھر میں شاید کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے چھٹی کے دن بھی دفتر آ گیا۔ مصنفہ کو دیکھ کر خوش ہو گیا اور کہا اچھا ہوا وہ آ گئی ورنہ تو وہ اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ مصنفہ نے اصرار کیا کہ جلدی ریکارڈنگ کر لیں انہوں نے گھر جانا ہے وہ جلدی سے اٹھے اور دفتر کا دروازہ بند کر دیا۔ مصنفہ نے بڑی حیرت سے پوچھا آپ دروازہ کیوں بند کر رہے ہیں ؟تو وہ ہنس پڑے ساتھ ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ مصنفہ نے خوف کے عالم میں کہا آپ دروازہ کھول دیں بوس کے چہرے پر شیطانیت ٹپک رہی تھی تو مصنفہ کو اس لڑکے کی بات یاد آئی۔ مصنفہ نے فون اٹھایا تو بوس نے فون بند کر دیا لیکن اس لڑکے نے فون اٹھالیا تھا۔ بوس نے ڈرایا اور کہا اب دروازہ لاک ہو چکا ہے یہاں آؤ۔ مصنفہ نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو بوس نے اس کے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دیا۔ اسی لمحے دروازہ پیٹ رہا تھا پروڈیوسر غصے کی حالت میں دروازے کی طرف بڑھا اتنی دیر میں لڑکا ماسٹر چابی سے دروازہ کھول چکا تھا۔ لڑکے نے کہا سر کیا ہوا دروازہ لاک ہو گیا پروڈیوسر نے کہا ہاں کتنی بار کہا ہے ٹھیک کروالو مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔ مصنفہ نے پرس اٹھایا اور باہر آ گئی۔ اس لڑکے بتایا کہ:" یہ حضرت بڑے استاد ہیں۔ پہلے بھی ایک دو بار ایسی حرکتیں کر چکے ہیں۔ اس نے بتایا تو پھر آپ انہیں نکال کیوں نہیں دیا جاتا۔ آپ لوگ شکایت کریں تو ہو سکتا ہے۔[9] "

ہر دوسری لڑکی کو ایسے مسائل درپیش ہیں اور وہ اپنے آپ کو قصوروار گردانتے ہوئے خاموشی اختیار کر لیتی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ہر خرابی کا ذمہ دار عورت کو ہی قرار دیتا ہے۔ ضرور لڑکی میں ہی ایسی بات ہو گی۔ ان دنوں جنسی ہراسمنٹ کو اٹھانے کے لیے کوئی تحریک بھی نہیں تھی۔ ریاست بھی ایسے معاملات میں کوئی قانون بناتی ہے اور نہ مدد کرتی ہے۔ مصنفہ نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا۔ تیس پینتیس برس بعد اسی خبیث سے عورتوں کے سیمینار میں ملاقات ہوئی۔ بڑی بے شرمی سے دوبارہ ہم کلام ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو مصنفہ نے دوٹوک جواب دیا میں نے پہچان لیا۔ اس آدمی کا چہرہ شرمندگی سے لٹک گیا۔ کسی خاندان سے بدلہ لینے کے لیے بھی لڑکیوں کی عزت لوٹ لی جاتی ہے جیسے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں فوجی آمریت نے عورتوں کی عصمت دری کی جس کا ذکر کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں کیا۔

انیس ہارون کے مطابق صوبہ سندھ میں دو تین جگہ کاری عورتوں کے گمنام قبرستان تھے جہاں ریت کے ٹیلوں میں ظلم باپوں اور بھائیوں کے ہاتھوں نام نہاد عزت کے نام پر قتل ہونے والی عورتوں کی داستانیں دفن تھیں۔ انیس ہارون کے مطابق:

"پاکستان میں کوئی عورت اگر کسی زیادتی کا شکار ہو یا مرضی سے شادی کرنا چاہے تو وہ موت کے بہت قریب ہوتی ہے اور ریاست کا کوئی ادارہ اس کا دفاع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ رجعت پسندانہ جاگیردارانہ قبائلی سوچ ہے۔(10) "

عزت و عصمت کی بات بڑھتے ہوئے عورتوں سے بچوں کے ساتھ زیادتی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ انیس ہارون کی پھوپھی کے پڑوس میں ان کی بھابھی کے ایک رشتہ دار تھے جو زبردستی بچوں اور بچیوں کو اپنی گود میں بیٹھا لیتے تھے کبھی گال مسلتے تو کبھی گدگدیاں کرتے، اور اتنی زوردار چٹکی لیتے کہ دیکھنے والے چیخ پڑتے۔ آہستہ آہستہ سب بچے دور ہوگئے۔ کم سن بچے سہم جاتے اور شرماتے ہوئے کسی کو بتاتے بھی نہیں۔ یہ بے ہودگی گھروں، اسکولوں، کالجوں اور خاندانوں میں ہو رہی ہے اسی وجہ سے سکولوں میں جنسی تعلیم کی باتیں ہو رہی ہیں جس کو فحاشی کا رنگ دیا جارہا ہے اور ایسی باتوں کو چھپا دیا جاتا ہے۔

۲۔حیا:

حیا کے معنی وقار، سنجیدگی اور متانت کے ہیں۔ یہ بے شرمی فحاشی اور بے حیائی کی ضد ہے۔ امام ابو الاعلی مودودی کے نزدیک اسلام کی اصطلاح میں حیا سے مراد وہ شرم ہے جو کسی امر منکر کی جانب مائل ہونے والے انسان خود اپنی فطرت اور خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ امام راغب اصفہانی کے خیال میں: حیا وہ وصف ہے جس کی وجہ سے برا کام کرنے سے نفس میں تنگی محسوس ہوتی ہے علامہ ابن حجر کے نزدیک "حیا وہ خلق ہے جو انسان کو نیکی کرنے اور برائی نہ کرنے پر ابھارتا ہے" حیا کا تعلق صرف عورت سے نہیں ہے بلکہ قرآن پاک کے مطابق حیا مرد اور عورت دونوں کا یکساں اخلاقی وصف ہے جو پوری آب و تاب کے ساتھ قصہ آدم وحوا میں نظر آتا ہے۔ جب میاں بیوی نے شیطان کے دھوکے میں آکر شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا تھا تو ان کا جنت کا لباس اتروالیا گیا تھا دونوں کو اپنی برہنگی کا احساس ہوا اس حالت میں اور کچھ نہ سوجھا تو فورا درختوں کے پتوں سے اپنی شرم گاہوں کو ڈھانپنے لگے۔ ارشاد باری تعالی ہے: "جب انہوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔"(۱۱)

شرم وحیا کا وصف صرف انسان ہی کا لبادہ ہے اگر شرم وحیا رخصت ہو جائے تو تمام نیکیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ شرم وحیا کا دائرہ انسان کو ذلت ورسوائی سے بچاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "جب تجھ میں حیا نہ رہے تو جو چاہے کر"(۱۰)
حیا ایمان کا حصہ ہے اور ایمان کے شعبوں میں سے عظیم شعبہ ہے ایمان کے ساٹھ سے زیادہ شعبے ہیں جن میں حیا ایمان کا قریب ترین شعبہ ہے۔ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچے تو اپنی آرائش اور خوب صورتی کو نمایاں نہ کرے اس سلسلے میں شرم وحیا کو ملحوظ نظر رکھے باہر نکلے تو بھی احتیاط سے اور اس کی چال سے حیا ٹپکے۔ حیا کے بارے میں پہلا حکم مردوں کو دیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> "اے نبی! مومنوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام افعال سے واقف ہے۔"(۱۲)

فرج کے لغوی معنی میں تمام ایسے اعضاء شامل ہیں جو گناہ کی ترغیب میں معاون ہو سکتے ہیں مثلاً آنکھ، کان، منہ، پاؤں، اس لیے اس حکم سے یہ قرار پایا کہ نہ بری نظر سے کسی کو دیکھو نہ گندا اور فحش کلام سنو، نہ خود کہو نہ پاؤں سے چل کر ایسے مقام پر جاؤ جہاں گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اس کے بعد عورتوں کو حکم دیا کہ:

> "اے نبیؐ! مومنہ عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی نظر نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت وآرائش کی نمائش نہ کریں سوائے اس کے جو ضرورت اور مجبوری سے کھل جائے۔"(۱۳)

زینت دو قسموں کی ہے ایک فطری اور دوسری مصنوعی، قدرتی میں جسم کی بناوٹ، خدوخال کا حسن، قدوقامت کی موزونیت وغیرہ شامل ہیں۔ مصنوعی سے مراد بالوں کی آرائش، میک اپ، زیور، اور لباس شامل ہے یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر شہوانی ہیجان کا باعث بنتے ہیں۔ عورت اپنی ہر طرح کی زینت چھپائے اور جان بوجھ کر ظاہر نہ کرے۔ مجبوری کے تحت ایسا ہو تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ بیماری کی حالت میں اپنا جسم ڈاکٹر کو دیکھا سکتی ہے۔ گھر سے باہر جائے تو اپنے اوپر چادر پھیلا لے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اور اپنی اوڑھنیاں اپنے سینے پر ڈال لیں۔"(۱۴)

جب کوئی بالغ لڑکا گھر میں آئے تو پہلے اجازت لے تین بار دستک دینے کی صورت میں واپس چلا جائے۔ رات اور دوپہر کے وقت اپنے والدین کے کمرے میں نہ جائے۔ ان تمام پابندیوں کا مقصد زنا سے بچاؤ ہے جس کی کڑی وعید سنائی گئی ہے۔ زنا سے بچنے کے لیے نکاح کو عام کرنے کا حکم دیا۔ فحش گوئی اور کثرت کلام نفاق کے دو شعبے ہیں۔ حیا کے سبب ہی انسان دوسری خوبیوں کے ساتھ جڑ جاتا ہے جیسے مہمان نوازی کرنا، امانت کا خیال

رکھنا، وعدے کی پابندی کرنا، عفت و پاک دامنی کو اختیار کرنا، محتاجوں کی حاجت روی کرنا، فحش گوئی اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنا، صلہ رحمی نہ ہوتی تو والدین سے اچھا سلوک نہ ہوتا۔ خالق اور اس کی مخلوق سے حیا نہ ہوتی تو خیر کا وجود بھی نہ ہوتا۔ حجاب کا حکم بھی حیا کی ایک نشانی ہے۔ تمام انبیاء اکرام حیادار تھے اور حیا کو پسند کرتے تھے۔ انبیاء اکرام کی سنتوں میں بھی ہمیں حیا کی تلقین ملتی ہے۔ حیا وہ عمدہ اخلاق ہے جو انسان کو ہر برائی سے محفوظ رکھتا ہے۔ حیا اور ایمان آپس میں جوڑے ہوئے ہیں ایک اٹھ جائے تو دوسرا بھی چلا جاتا ہے۔ ہر دین کا ایک خلق ہے اور دین اسلام کا خلق حیا ہے مگر ہمارے معاشرے میں اس کے معنی بدل گئے شرم کی نئی سماجی اخلاقیات سے مراد انکساری نہیں بلکہ شوہروں اور آقاؤں کے لیے یہ بات شرم اور رسوائی کا باعث تھی اگر ان کی عورتیں عام لوگوں کے سامنے آئیں تو اس طرح کا رویہ ان کی عزت یا سماجی تفاخر کو مجروح کرنے والا سمجھا جائے گا اگر کوئی عورت بد فعلی یا آزادانہ رویہ اختیار کرنے کی جرات کرے تو اس کے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں مثلا اس کے اعضاء کا کاٹ دیا جانا یا مار دینا ہے یوں حیا کو صرف عورت کی حد تک محدود کر دیا گیا اسی لیے عصمت چغتائی نے اپنی آپ بیتی میں نسوانیت اور شرم وحیا کے بت ریزہ ریزہ کر دیئے یہاں تک کہ وہ اپنے خاندان کا پردہ بھی چاک کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کے مطابق شادی کے بارے میں لڑکیوں کا اظہار خیال کرنا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ذاتی پسند اور ناپسند کا اظہار کرنا شرم وحیا کے اقدار کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں سسرال میں رہنے کے لیے لڑکیوں کو اپنا سر نیچا، آنکھیں بند اور ان کے اکیلے آنے جانے پر پابندی لگائی جاتی تھی کہیں آنے جانے کے لیے خادمہ کو ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ اپنے بڑوں کی ہر اچھی بری بات کو برداشت کرنا حیا کہلاتا تھا۔ لڑکیاں اپنا حق مانگتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتی تھیں۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اپنی آپ بیتی میں اپنے دور کے شرم وحیا کے تقاضوں پر بات کی ہے ان کے دور میں شادی کے بارے میں لڑکیوں کا اظہار خیال کرنا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا سسرال میں رہنے کے لیے لڑکیوں کو کچھ طور طریقے سیکھائے جاتے تھے جس میں سر جھکانا، آنکھیں نیچی رکھنا اور کان بند رکھنا شامل ہے وہ تنہا سفر نہیں کر سکتی تھی کہیں بھی آنے جانے کے لیے ملازمہ کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ اس وقت لڑکیوں کا شار عزیز بٹ نے بہت سے ممالک کے اسفار کیے جن میں لندن بھی شامل ہے وہاں پر ایک جوڑے سب کے سامنے ایک دوسرے سے لپٹے دیکھا تو شرم سے اپنی نگائیں نیچی کر لیں۔ انگلستان میں ایسے مناظر عام ہیں پارک ہوں یا پلیٹ فارم یا راہگزر سبھی جگہوں پر جوڑے ایک دوسرے سے گھتم گتھا نظر آتے ہیں۔ کشور ناہید اپنی آپ بیتی "بری عورت کی دوسری کتھا" میں مصر کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ اتنے بد معاش اور بے شرم ہیں کہ منہ

سے ایسی آوازیں نکالتے ہیں کہ آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ یہ ہی حال انڈیا اور پاکستان کے ٹیکسی ڈرائیوروں کا ہو رہا ہے ان کی آنکھوں میں بھی بے شرمی آ گئی ہے جو کالج جاتی ہوئی لڑکیوں کا ٹیکسی میں ریپ کرنے سے بھی باز نہیں آتے ہیں۔

۳۔ماں، بہن، بیوی، بیٹی:

خاندان ایک بنیادی معاشرتی ادارہ ہے جو نسل انسانی کی بقاء کے لیے ضروری ہے خاندان کا آغاز مرد اور عورت کے درمیان شادی کے معاہدے سے ہوتا ہے خاندان کی ابتداء انسانی ضرورت کے تحت ہوئی جس سے مرد اور عورت کا تعلق جنسی ضرورت کے تحت قرار پاتا ہے۔ گھر ایک خاندانی جگہ ہونے کے علاوہ ایک سیاسی حیثیت بھی رکھتا ہے جس کی تاریخ اور روایت کی عکاسی وہاں کی عورتیں کرتی ہیں۔ گھر کو تنظیم و ترتیب سے چلانا اور منظم رکھنا عورت کا کام ہے جس کے لیے مہارت اور پھرتی اہم عنصر ہیں اس لیے عورتوں کی تعلیم میں گھریلو اور امور خانہ داری کے پہلوؤں کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے عدم اعتماد اور لڑائی جھگڑوں سے گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کے دو روپ ہیں پاک دامن، شریف اور گھریلو عورتیں اور دوسری بازاری، ڈائن، چڑیل اور طوائف عورتیں ہیں۔ عورتوں کی اچھی کا دارومدار پاکیزگی پر رکھا گیا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صنفی لحاظ سے عورت ایک کمزور ہستی ہے جس کی حفاظت طاقتور مرد ہی کر سکتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کی تقسیم شدہ صفات میں عورتوں کو مردانہ صفات زیب نہیں دیتیں۔ عورتوں کے لیے دینی تعلیم ضروری ہے جدید ماڈرن تعلیم ان میں نسوانی صفات ختم کر دیتی ہے ایک وفادار بیوی کے لیے پاسبانی اور زن پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی سوچ سے کے تحت عورت کمزور اور مرد طاقتور ہوتا ہے۔ یہ دونوں متضاد صفات کے مالک ہیں۔ قوم پرستی کے لحاظ سے یہ صنفی تقسیم قوم کی بقاء کی ضامن ہے اسلام میں مخصوص حالات و شرائط کے تحت کثیر زواجگی کی اجازت بھی دی گئی اسی اجازت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قدیم حکمران، شہزادے، ملک کے امیر زادے اور سردار کئی کئی عورتوں کو اپنے حرم کی زینت بناتے تھے۔ سائنسی ایجادات اور علم و فلسفے کے ارتقاء نے انسانی زندگی کو پیچیدہ بنا دیا اور بلند معیار زندگی کے چکروں میں خاندان معاشی بحران کا شکار ہو گئے شہروں میں اخلاقی اور روحانی اقدار برقرار نہ رہ سکیں۔ میاں بیوی کے تعلق کا انداز بدل گیا اس لیے ابن خلدون نے کہا تھا کہ شہروں میں اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل رہا ہے اور معاشرہ تیزی سے تنزل پذیر رجحانات کا مرکز بن رہا ہے۔ قدامت پسند والدین ان تبدیلیوں کو بغاوت اور سرکشی قرار دے رہے ہیں۔ بچے نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے پرانی روایات پر چلنا پسند نہیں کرتے۔ ذہنی ناہمواری انتشار کا باعث بنتی ہے عورت کی آزادی کا غلط مفہوم نکالنے والے خاندانی مسائل میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان وجوہات کی وجہ

سے طلاق اور علیحدگی کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اس کی وجہ قدامت پرستی، جہیز، ذات پات کا غلط تصور خاندانی نظام میں رکاوٹ کا باعث ہے پرانی اور فرسودہ روایات پر قائم رہنا فخر کا باعث سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ معاشی مشکلات سر اٹھا رہی ہیں اور خاندان پست معیار زندگی گزرنے پر مجبور ہیں۔ عورت خاندان میں بحیثیت فرد بڑی اہمیت کی حامل ہے خاندانی نظام کو برقرار رکھنے میں عورت کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ اسی خاندانی نظام میں عورت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ مرد کے ساتھ عورت کے یہ ہی چار رشتے ہیں ماں، بہن، بیوی اور بیٹی مگر مرد نے ہی اسے ایک اور رشتہ بھی بننے پر مجبور کر دیا وہ رشتہ بیوہ، طوائف اور داشتہ کا ہے۔ خاندان میں کنبہ اور عائلی ذمہ داریوں کو اولین اہمیت دی گئی ہے۔ خاندانی نظام کی بنیاد کا پہلا رشتہ بیوی کا ہے۔ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے سے پہلے لڑکے لڑکی کی مرضی جانا ضروری ہے تاکہ وہ بخوبی اپنے فرائض سرانجام دے سکیں۔ اسلام نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے اور ایک دوسرے سے حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "تمہاری عورتیں تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں۔" [۱۵]بیویوں کو رب تعالیٰ کی امانت قرار دیا ہے۔ اس لیے مرد کو چاہیے کہ وہ عورت پر اعتماد کرے اور گھر کے معاملات میں بیوی سے مشورہ کرے۔ اسی بناء پر مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا۔ اس لیے خاوند کو چاہیے کہ وہ بیوی پر ظلم نہ کرے زندگی کو جہنم بنانے سے بہتر ہے طلاق دے۔ اسلام مرد کو دوسری شادی کی اجازت دو صورتوں میں دیتا ہے اگر جنگ کی وجہ سے بیواؤں کی تعداد زیادہ ہو دوسرا عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ ہو۔ اگر مرد اس رعایت سے فائدہ اٹھاتا ہے تو ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: "کوئی شخص بغیر کسی مجبوری یا ضرورت کے محض اپنے نفس اور بدن کی تسکین و تفریح کے لیے ایسا کرتا ہے تو وہ اخلاقاً ایک ناجائزہ بات کرتا ہے۔"[۱۶]

ہمارے معاشرے میں شادی ایک مذہبی، معاشرتی اور معاشی معاہدہ ہے جس میں لڑکا لڑکی کی مرضی کے بغیر خاندانی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے زبردستی کی شادیاں کر دی جاتی ہیں کم عمری کی شادی کو ترجیح دی جاتی ایسی صورت میں گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور تو اور ہمارے معاشرے میں تمام توقعات بیوی سے ہی وابستہ کی جاتی ہیں وہ گھریلو ذمہ داریوں میں الجھا کر دنیا و مافیا سے دور ہو جاتی ہیں۔ سائمن دی بووا کے مطابق ایسی شادیوں کا مقصد معاشی اور جنسی ملاپ کو معاشرے کے لیے مفید بنانا ہے نہ کہ فریقین کی ذاتی خوشی کو۔ اسی لیے ہمارے ملک میں قریبی کزن کے ساتھ شادیوں کا عام رواج پایا جاتا ہے جس کو طبی معالج خاموش وائرس قرار دیتے ہیں۔ ان شادیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد ذہنی اور جسمانی معذوریوں کا شکار ہو رہی ہے وہ وفا، پاکیزگی اور روایات کی امین ہے شوہر کے ساتھ غداری پوری قوم کے ساتھ بے وفائی کے مترادف ہے۔ خواتین نے اپنی آپ

بیتیوں میں اپنی عائلی حیثیات کو بیان کیا ہے کچھ خواتین نے اپنے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ازدواجی زندگی گزر رہی ہیں۔جب کہ کچھ اس ڈگر سے ہٹ گئیں اور بے گھر ہو کر مشکلات کا شکار ہوتی ہیں اور بڑی تگ ودو کے بعد خود مختار زندگی کا عکس پیش کرتی ہیں۔

قدیم عائلی حیثیات میں ان ادباء آپ بیتی نگاروں کی ماؤں کی زندگی کو دیکھا جائے تو ان سب کی عائلی زندگی میں تقریباً یکسانیت پائی جاتی ہے جن میں واجبی سی مذہبی تعلیم ،اسکول مدرسے سے ناواقفیت ،کم عمری کی شادی اور شوہر کی اطاعت گزاری کی خصائص پائی جاتی تھیں جن کے دلوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے کی کسک تھی۔پدر سری نظام میں پال بڑھ کر ذہنی نمو پانے والی زیادہ تر مائیں اپنی بیٹیوں اور بیٹوں میں فرق روا رکھتی تھیں۔نوابوں کے ہاں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ عورتوں اور باندیوں کو بھی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔جیسے شہر بانو کے باپ نے بارہ شادیاں کیں۔ان کی والدہ کو گھر میں ثانوی حیثیت حاصل تھی جس کے پانچ بیٹے اور نو بیٹیاں تھیں۔وہ اپنی پانچ سالہ بچی کی شادی کے خلاف بھی نہ تھیں۔انتہائی برے حالات میں جان بوجھ کر اپنی بیٹی کی مدد نہ کی جب کہ اس وقت پانچ ہزار کے اثاثوں کی مالک تھیں۔شاید اس کی دولت پر بیٹوں کا قبضہ تھا۔بیگم شائستہ اکرام اللہ کے مطابق والدین کی مرضی اور کم عمری کی شادیوں کے لیے لڑکیوں کو ذہنی طور پر تیار کیا جاتا تھا اس وقت شادی بیاہ کی رسمیں برداری کی عورتوں کے لیے تفریح اور وقت گزارنے کا ذریعہ تھیں۔ادا جعفری کی ماں تیس پنتیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ان کے گھر میں عورتوں کو سات پردوں میں رکھا جاتا تھا۔ان پابندیوں کے باوجود ان کی ماں نے بہترین تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا۔ادا جعفری پرائمری کلاسسز میں سکول بھی جاتی رہی۔کالج نہ ہونے کی بناء پر گھر میں پرائیویٹ تعلیم کا انتظام کیا۔گھر میں ڈاک کے ذریعے رسائل وجرائد منگوائے جاتے تھے۔پردے میں رہ کر ایک استانی فارسی پڑھاتی اور دوسری انگریزی زبان پڑھاتی تھی۔خاندانی روایات سے ہٹ کر ان کی والدہ نے بڑی بیٹی کی شادی خاندان سے باہر کی۔اس لیے ادا جعفری اپنی ماں کے بارے میں لکھتی ہیں:”میری ماں نے حالات کا تحمل سے سامنا کیا لیکن اندھیروں سے سمجھوتے پر راضی نہ ہوئیں۔“(۱۷)

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی کامیاب زندگی میں ان کی والدہ کی تربیت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔اس لیے مولوی عبدالحق نے ان کی ماں کو سقراط اور بقراط کہا۔ان کے والد ظفر عمر پہلے جاسوسی ناول نگار تھے۔نیلی چھتری جیسا ناول لکھا۔ایک حادثے میں ان کو اپنی ٹانگ خود جدا کرنی پڑی۔

عصمت چغتائی کی والدہ تو بچے پیدا کرنے والی مشین بن چکی تھی جس کو اپنے بچوں کی شکل دیکھ کر تے آتی تھی۔ یہ حال صرف ان کی والدہ کا ہی نہیں تھا بلکہ پوری ہندوستانی عورتوں کی یہ ہی حالت تھی ایک انگریز لکھاری لکھاتی ہیں:

> "The main purpose of marriage left women as a mere machine of reproduction of male child……Women neither had property rights nor were allowed any religious studies. Women's confinement in the four walls is well known." [۱۸]

> "عورت کی شادی کا بنیادی مقصد مرد بچے پیدا کرنے والی مشین رہ گیا ہے۔ عورت کا نہ تو جائیداد میں حق تھا اور نہ ہی اسے کسی مذہبی تعلیمات کی اجازت تھی۔ عورتوں کی چاردیواری میں بندش عام تھی۔"

کم عمری میں شادی ہونے کی وجہ اس کا جسم بے ڈھنگا ہو گیا تھا اور ۳۵ سال کی عمر میں نانی بن گئی تھی۔ ان کی والدہ پدرسری سوچ کی حامل تھی جو اپنی بیٹی کو روایتی انداز میں دیکھنا چاہتی تھیں جبکہ عصمت چغتائی کو گھریلو علمی تعلیم سے نفرت تھی۔ وہ اپنی ماں کے ان رویوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

"یہ مردوں کی دنیا ہے مرد نے بنائی اور بگاڑی ہے عورت ایک ٹکڑا ہے اس دنیا کا۔ جسے اس نے اپنی محبت اور نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔"[۱۹]

کشور ناہید کی والدہ گھر میں سب سے بڑی تھی جہاں پر لڑکے علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے اور ان کی والدہ کو صرف قرآن شریف اور بہشتی زیور پڑھا کر دوسرے گھر رخصت کر دیا گیا۔ جہاں پر گرم دودھ دولہے میاں پر نادانستہ طور پر دودھ گرانے کی پاداش میں طلاق دے دی گئی باپ نے دوسری شادی ایسے شخص سے کی جس کی پہلے تین بیویاں مر چکیں تھیں اور اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں کے مزاج مختلف تھے طلاق سے ڈرتے ہوئے ان کی والدہ نے دوسری شادی والے کے ساتھ نبھا کیا۔ وہ لکھتی ہیں: "ابا کی ناراضگی کے دنوں میں اماں کالا مرغا منگایا کرتی تھیں اور ایک بی بی آکر یہ مرغا لے جاتی تھیں اور جو ابا پڑھی ہوئی چینی اماں کو دے جاتی تھیں۔"[۲۰] ان کی والدہ اپنے آٹھ بچوں کو پڑھاتی اور گھر کا سارا کام خود کرتی۔ ان کی گھریلو اور مذہبی تعلیم اس بات کی غماض تھی کہ وہ پدرسری سوچ کے حامل گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔

نثار عزیز بٹ کی والدہ بچپن میں وفات پا گئی تھی۔ باپ نے دوسری شادی کرلی۔ دوسری ماں ان سے دوستوں جیسا سلوک کرتی کیوں کہ وہ قبائلی علاقوں میں عورت پر لگائی جانے والی پابندیوں سے بے زار تھی۔ شادی کی صورت میں ان کو ان پابندیوں سے نجات ملی۔ اس کے لیے سوت کے بچے بھی کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ سعیدہ بانو

احمد کی والدہ کی شادی چودہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی۔اس وقت شروع سے ہی لڑکیوں کو گھر داری سیکھائی جاتی تھی۔بارہ تیرہ سال کی عمر میں لڑکی کو اس کی سہلیاں دولہے میاں کے نام سے چھڑنا شروع کردیتی تھیں۔لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا برا سمجھا جاتا تھا کہیں وہ عشق ہونے کی صورت میں لڑکے کو محبت بھرے خط نہ لکھ دے۔سعیدہ بانو احمد اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ ایک طرف عورت چہار دیواری میں بند،رشتے داروں سے گھری ہوئی،تو دوسری طرف کڑھائی سے بنے ہوئے زری کے کپڑے ،اچکن کے کام کی ماہر اور مغلیہ کھانا پکانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ان کے والد نواب سلطان جہاں بیگم کے چھوٹے بھائی کو پڑھاتے تھے اسی توسط سے ان کی والدہ اکثر نواب سلطان جہاں بیگم کے پاس آتی رہتی تھی۔وہ عورتوں کی ترقی کی راہیں ہموار کررہی تھیں۔انھوں نے خواتین کو اپنا اصلی نام لکھنے کی تجویز دی۔ان کی روشن خیالی کی وجہ سے ان کو عورتوں کا سرسید کہا جاتا تھا بعد میں یہ لوگ لکھنو آگئے۔ان کی والدہ نے ابن رضا کے علاج کے لیے مالی معاونت کی۔

انیس ہارون کی والدہ کا تعلق نواب خاندان سے تھا۔وہ آزادی کے بعد پاکستان آگئی۔ان کی زندگی یکسر بدل گئی کہاں نازو نعم اور کہاں گھر کا سارا کام کرنا۔اپنوں کا غم اور ہجرت کا دکھ ان کی جان لے گیا۔ش۔فرخ کے والد نے تہیہ کیا تھا کہ ان کی شادی کسی پڑھی لکھی عورت سے ہو ورنہ وہ خود اپنی بیوی کو پڑھائیں گے۔ان کی والدہ نے پرائمری جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔پھر فیروز پور کے ایک اسکول کے ہوسٹل میں رہ کر تعلیم مکمل کی اور معلمہ بن گئی۔انہوں نے برسر روزگار ہو کر گھر کے اخراجات میں شوہر کا بوجھ تقسیم کیا۔ان کے والد اور والدہ دونوں کا تعلق شعبہ تدریس سے تھا۔

زہرداؤدی کے مطابق قدیم سماجی ڈھانچے کی بنیادی ناانصافی اور جنس کے استعمال پر ہے اس لیے اسے برقرار رکھنا نہ مردوں کے مفاد میں ہے نہ عورتوں کے۔

افضل توصیف کا تعلق جاگیردارانہ گھرانے سے تھا۔جہاں لڑکیوں کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔افضل توصیف کی پیدائش کے بعد گھر کی خواتین نے نومولودہ بچی کو مارنے کا ارادہ کیا تو پاس کھڑی بے اولاد کاکی ماں نے اسے گود میں لے لیا۔کاکی ماں نے افضل توصیف کی ہر خواہش کو پورا کیا ان کی وفات کے بعد واپس اپنی ماں کے پاس آگئی۔ان کے والد کا تبادلہ بلوچستان قلعہ سیف اللہ میں ہو گیا یہاں کے لوگ اپنی بیٹیوں کو پڑھاتے تھے۔

صالحہ عابد حسین کی والدہ کا نام مشتاق فاطمہ تھا۔صالحہ عابد ابھی چھوٹی عمر میں تھی کہ ان کے والد وفات پاگئے۔زمینوں اور دکانوں سے ملنے والی رقم ماں کی سخاوت کے سامنے کم تھی۔بڑی بہن کی شادی پر ان کے چچا ناراض تھے جن کو راضی کیا نوکر کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر شادی کی۔دہلی میں مجلس عزا کا آغاز کیا جب تک ماں زندہ رہی

بیٹی کے نازو نخرے اٹھاتی رہی اس کے باوجود وہ معاشرتی باندھنوں کے آگے مجبور تھی جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں: "میرے خاندان میں لڑکیوں کو بہت چاہا جاتا تھا مگر روایتی پابندیوں اور بزرگ خواتین کی جکڑ بندیوں کی بدولت مائیں بھی لڑکیوں کو جائز آزادی نہ دے سکتی تھیں۔"(۲۱)

بیوہ ہونے کی وجہ سے گھریلو اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے انہیں پورا کرنے کے لیے اپنا زیور گروی رکھوانا پڑا، بیٹی سے قرضہ لیتی رہی، اس سب کے باوجود اپنے بچوں کو تعلیم دلاوانا چاہتی تھی۔ عطیہ داؤد کی والدہ ارباب بیگم محمد داؤد کی دوسری بیوی تھی جو عمر میں اپنے شوہر سے کئی سال چھوٹی تھی۔ ان کے والدہ خود تعلیم یافتہ تھے بیوی کو بھی پڑھا کر استانی لگوایا۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ اپنے بڑے بیٹے کے گھر رہتی تھی اور اس حد تک بے بس اور مجبور ہو گئی کہ بہو بیٹی اور ان پر ظلم کرتی اور وہ خاموش تماشائی بن کر یہ منظر دیکھتی رہتی تھی۔ نفیس بانو شمع کی ماں حالات کے ہاتھوں اتنی مجبور تھی کہ کچھ نہیں کر سکتی تھی ایک مجبور ماں جو اپنی اولاد کا دکھ سن کر بے ہوش تو ہو سکتی ہے مگر کچھ کر نہیں پائی۔ ایسی بہت سی طلاق یافتہ عورتیں اپنی اولاد کو خود سے نا چاہتے ہوئے بھی دور کر دیتی ہیں کیوں کہ وہ خود مختار نہیں ہوتی۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں عائلی زندگی کا امتیاز اور معاشرتی اقدار کا فرق واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ماؤں نے قربانیاں دے کر اپنی بیٹیوں کے لیے راہیں ہموار کیں اس کے باوجود کچھ جگہوں پر قدیم عائلی زندگی کی جھلک ابھی بھی برقرار ہے نفیس بانو شمع کی عائلی زندگی خوشگوار نہ تھی شوہر کو نشے اور خوب صورت عورتوں کا جنون تھا۔ گھر والوں کو شوہر کی شکایت لگائی تو انہوں نے قسمت سمجھ کر ان حالات سے سمجھوتہ کرنے کی نصیحت کی۔ وہ ایک مجبور بیوی ہی نہیں ایک ماں بھی تھی۔ جب وہ ایک ہفتے کے لیے بمبئی سے دہلی درگاہ نظام الدین اولیاء کی زیارت کے لیے گئی تو اس کے بچے بھی ماں سے رخ موڑ گئے۔ ان کو کوئی کام کرنے کو کہتی تو وہ انکار کر دیتے ان بچوں کو باپ نے ماں کے خلاف بھڑکایا تھا۔ وہ بچوں کو سینے سے لگا کر کئی کئی گھنٹے روتی رہتی۔ ان بچوں کی خاطر تو وہ اس گھٹن زدہ ماحول میں رہنے پر مجبور تھی وہ بھی اسکے اپنے نہ تھے۔ اپنے حالات سے تنگ آکر وہ لکھتی ہے: "ادھوری عورت ہی نہیں، ادھوری ماں بھی ہوں۔"(۲۲)

شہر بانو کے شوہر کا کردار عیاش اور غیر ذمہ دار فرد کا تھا۔ جو نواب خاندان کی عیاش اولاد تھی۔ جس نے اپنے خاندان کی خوشی کے لیے کوئی تگ ودو نہیں کی۔ جو دولت تھی وہ بھی بے دردی سے چٹ کر گیا جس کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کا کوئی ایک بھی خوش گوار واقعہ اس کتاب میں نہیں ملتا۔ شوہر کی عیاشی اور کم عمری میں شادی ہونے کی وجہ سے شہر بانو جنسی اور معاشی مسائل کا شکار رہی۔ پانچ بچے پیدا ہوئے مگر بد قسمتی سے کوئی ایک بھی نہ بچا۔ کم عمری کی شادی میں دوران حمل پیچیدگیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ جس سے بچے پیدائش کے وقت یا

پیدائش کے چند ماہ بعد دم توڑ جاتے ہیں۔ شہر بانو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بچوں کی کثیر تعداد سے اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی کا اندازہ لگانا حماقت ہے۔ شہر بانو کی کہانی برصغیر کی آدھ موئی عورتوں کی کہانی ہے۔ برصغیر کی ان ہی آدھ موئی عورتوں کے بارے میں زاہدہ حنا نے اپنی کتاب "عورت زندگی کا زنداں" میں لکھا ہے:

> "مشرق میں ذہین عورتوں کی ہڈیوں پر تہذیب کے تاج محل تعمیر ہوئے۔ اس عالی شان عمارت کے ذکر پر یاد آیا کہ ارجمند بانو جو ممتاز محل کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کا مقبرہ تاج محل، عجائب روزگار میں سے ہے وہ شاہ جہاں کے سترھویں بچے کی پیدائش میں ختم ہوئی تھی۔ Maternal Mortality کا ایک ناقابل یقین واقعہ۔ جس سماج کی ملکہ سترہ بچے پیدا کرتی ہو، اس کی عام عورت کا کیا حال ہو گا تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔"(۲۳)

سعیدہ بانو احمد اپنی شادی سے خوش نہ تھی مگر گھر والوں نے والد کی وفات کے بعد ان کی زبردستی شادی کر دی۔ ان کے خیال میں دو انجانے لوگوں کو شادی کے بندھن میں جکڑنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ شادی کی پہلی رات ہی شوہر نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا ان کی سنجیدہ طبیعت سعیدہ کی شوخ مزاجی کے سامنے نہ چل سکی اور وہ غصے کی شکل اختیار کر گئی۔ ان کے شوہر نے کہا ان کا دوپٹہ بہت اچھا لگ رہا ہے کس سے بنا ہے سعیدہ نے کہا سوئی سے بس اس بات پر شوہر کا مزاج برہم ہو گیا اور دوسری طرف منہ کر کے سو گئے اور بیوی مجرم بنی بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ انہوں نے کروٹ تک نہیں بدلی پھر انہیں سمجھ آئی کہ یہاں ان کے ناز نخرے نہیں اٹھائے جائیں گئے۔ سعیدہ بانو احمد نے ابن رضا عباس کے ساتھ ہر ممکن نبھا کرنے کی کوشش کی۔ وہ بچپن سے احساس کمتری کا شکار تھے کیوں کہ ان کو چیچک اور ٹائی فائڈ کا مرض ہوا تھا دوسرا ان کی نوکری بھی چاروں بھائیوں کے مقابلے میں معمولی تھی اسی لیے وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر شکی مزاج ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ وہ رادھا کرشن جن کو وہ بھائی کہتی تھی اور ان کے ہاتھ پر راکھی باندھ چکا تھا۔ وہ بھی سعیدہ کو اپنی بہن سمجھ کر ہر سال ان کے گھر نیگ بجھواتے تھے۔ ان پر ابن رضا عباس نے شک کا اظہار کیا اور کہا: "سچ کیوں نہیں بولتیں آپ" "آپ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ رادھا صاحب سے ملنے گئی تھیں۔"(۲۴)

یہ سن کر سعیدہ بانو حواس باختہ ہو گئی ان کے سامنے ساری دنیا گھومنے لگی وہ چاہتی تھی کہ زمین پھٹے اور وہ دھنس جائے۔ اپنے ماں باپ کے گھر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ اس انگشت نمائی کو کیسے برداشت کرتے کیوں کہ ایسے معاملے میں ہمیشہ قصور عورت کا ہی سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں ابن رضا عباس نے روتے ہوئے معافی مانگی۔ جب ابن عباس رضا کی آنکھ میں کیٹرے نے کاٹ لیا تھا اس وقت ان کو پڑھنے لکھنے میں مشکل ہوتی تھی۔ شوہر کی آنکھ

کے آپریشن کے لیے اپنی ماں سے پیسے ادھار لیے۔ اچھا علاج ہونے کے باوجود بینائی میں فرق آگیا اسی وجہ سے انہوں نے استعفی دینے کا سوچا۔ سعیدہ بانو احمد نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کریں اپنے ساتھ ایک منشی رکھ لیں آپ جو بولیں گے وہ لکھ دے گا۔ مگر ابن عباس رضا نے ان کی ایک نہ سنی اور استعفی دے دیا بعد میں اسی آنکھ میں کانٹا لگ گیا اور وہ ایک آنکھ کی بینائی سے محروم ہو گئے۔

ایک دن نہ جانے کیا دل میں آئی اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس کے بعد سعیدہ بانو احمد نے سسرال پر بوجھ بننا مناسب نہ سمجھا اور اپنے بیٹوں کو لے کر الگ ہو گئی۔ بعد میں عباس ابن رضا کا انتقال ہو گیا۔ سعیدہ بانو احمد کی دوسری شادی نورالدین سے ہوئی جس کی ایک انگریز بیوی تھی۔ جو ہندوستان نہیں رہتی تھی۔ جب اسے پتہ چلا کہ اس کا شوہر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ انڈیا آگئی۔ نور کے دوست کی بیویوں نے بتا دیا کہ نور دوسری شادی کرنا چاہتا ہے پہلی بیوی نے نورالدین کا جینا محال کر دیا۔ روز شراب پیتی۔ خود کو عام گھریلو عورت کے روپ میں بدل لیا۔ ہندوستانی لباس استعمال کرنے لگی۔ مسلمان ہو گئی اور اپنا نام بلقیس رکھ لیا۔ اس کے بعد نورالدین اپنے خاندان کو لے کر ولایت چلے گئے۔ مگر وہ عجیب دوراہے کا شکار تھے۔ انگریز بیوی محبت ضرور کرتی ہے مگر معاشرت اور زبان ایک سی نہیں ہو سکتی تھی۔ جب نورالدین پانچ سال تنہا دلی میں رہے تو سعیدہ بانو احمد کی ذات میں وہ سب خوبیاں نظر آئیں جو ان کی آئیڈیل تھیں۔ وہ بدستور سعیدہ احمد بانو سے ملتے رہے اور ملاقات بھی ہوتی رہی۔ جب دوبار بلقیس واپس آئی تو اس نے نورالدین کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ نور الدین نے سعیدہ بانو احمد کو پانچ سال کی محبت کو دفن کرنے کا مطالبہ کیا جو اتنے عرصے بعد دونوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ سعیدہ بانو احمد اس بات کو بھی تسلیم کرتی تھی: "کہ دنیا کی کوئی عورت یہ قبول نہیں کر سکتی کہ وہ شوہر کی محبت میں کسی دوسرے کو شریک کر سکے۔"(۲۵)

جب نورالدین کی بیوی کا انتقال ہوا اس کے ایک سال بعد دونوں نے نکاح کر لیا۔ یوں ان کی محبت ۲۵ سال کے طویل عرصے تک محیط رہی۔ جو بہت گھٹن اور صبر آزما وقت تھا۔

ساجدہ زیدی نے اپنی زندگی میں اپنی ماں کی تقلید کی جو خود بھی شاعرہ تھی وہ ایک سمجھ دار خاتون تھی جو گھرداری کے کام کے ساتھ ساتھ مطالعہ کتب بینی میں بھی مصروف رہتی تھی۔ ایف۔ اے کے دوران ساجدہ زیدی کے لیے قیصر زیدی کا رشتہ آیا۔ جو یونی ورسٹی میں معلم تھے اور ساجدہ زیدی سے عمر میں بڑے تھے۔ ساجدہ زیدی ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی تھی۔ جس کی اجازت ان کے سسرال والوں نے دے دی یوں یہ رشتہ منظور کر لیا گیا۔ ساجدہ زیدی نے علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا جہاں پر بی بی اماں اور پاپا میاں (شیخ عبداللہ) جیسی شفیق

شخصیات کی صحبت میسر آئی۔جو اس وقت برصغیر میں تعلیم نسواں کے سب سے بڑے حامی تھے وہ ان کے بارے میں لکھتی ہیں:"شیخ عبداللہ کا مقصد تعلیم نسواں کو عام کرنا اور گرلز اسکول و کالج کو مسلم شرفاء میں مقبول بنانا تھا۔"(۲۶)

قیصر کی والدہ کے بیمار رہنے کی وجہ سے شادی کا مطالبہ جلد کیا گیا۔سسرال والوں نے جہیز نہ لینے کا مطالبہ کیا مگر ان کی والدہ محترمہ نے اپنی خوشی سے گھر کی تمام چیزیں تحفے کے طور پر دیں۔اس آپ بیتی میں ان کے شوہر کا کردار ضمنی اور روایتی کردار ہے۔جو شادی کی پہلی رات بغیر رومانس کیے روایتی سہاگ رات منانے پر تولے ہوئے تھے۔شوہر کی ان حرکتوں کی وجہ سے وہ مدتوں بے چین رہی۔ سیکس مرد کا قوی محرک ہے جس کے تحت روایتی شوہر اپنی بیوی کو اپنی اجارہ داری سمجھتے ہیں۔مصنفہ کے اندر عورت کی محکومیت اور مرد کی حاکمیت کے عناصر نے جگہ بنالی۔یوں بھی عورت تو ہر زمانے اور ہر ماحول میں کسی نہ کسی حد تک محکوم ہی رہی ہے۔لڑکیوں کی بے جوڑ شادیاں ان کے خاندان میں بھی ہوتی تھیں، جنہیں عزت وآبرو سے بنھایا جاتا تھا۔اس لیے وہ پدر سری نظام کے خلاف تھیں۔معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے عورت کی حالت زار کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:"ایسے غیر منصفانہ متعصب اور تنگ نظر سماج میں عورت ہونا بذات خود ایک جرم ہے۔جہاں بیویوں کو جلایا جاتا ہو،گھر میں مرد کی حکومت ہو اور عورت محکوم و مجبور۔"(۲۷)

شادی کے بعد ان کی زندگی کے دو مقاصد تھے۔اولاد کی پرورش کرنا اوران کو مثالی زندگی دینا تھا تو دوسری طرف وہ بہتر تعلیم حاصل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی۔پہلا بچہ رام پور میں ہوا جہاں پر ان کی والدہ کے ساتھ ساتھ سسرال والے بھی رہتے تھے۔ممتا کے جذبات کا یہ پہلا تجربہ تھا جو نسائی حسیت سے زیادہ گہرا اور بلند تر تھا۔وہ کئی کئی گھنٹے اپنے بچے کی طرف دیکھتی رہتی۔یہ ماورائی مسرت کا سرچشمہ تھا اس کیفیت سے مرد ذات دوچار نہیں ہوسکتے تھے۔اسی جذبے کی بناء پر مرد جنگیں لڑتے ہیں اور عورتیں امن کی متلاشی ہوتی ہیں۔بچوں کی پرورش کے دس پندرہ سال محنت اور جانفشانی کے تھے ان ہی دس پندرہ سالوں نے انہیں مکمل عورت ہونے کا شعور اور احساس دیا۔شوہر کو مثانے کا کینسر تھا۔چچا سے پیسے ادھار لے کر علاج کرواتی رہی مگر بے سود۔۴۷ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی۔وہ اپنی کسم پرسی کے بارے میں لکھتی ہیں:"میرے پاس ایک گھر اور اپنی تنخواہ کے سوا اگر کچھ تھا۔۔۔تو بس یہ ہی محنت و کاوش تھی۔۔۔۔۔یا میرے چاروں زیر تعلیم بچے۔"(۲۸) اس کے باوجود بھی ساجدہ زیدی نے اپنے بچوں کو اعلی تعلیم تربیت دینے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کی خود مختاری دی۔

ش۔فرخ نے اپنے شوہر کا نام بھی صغیہ راز میں رکھا۔اپنی ایک دوست کے شوہر کے ذریعے م سے ملاقات ہوئی انہوں نے شادی کی پیش کش کی۔اس نے اپنے والدین کو ماننے کا وعدہ کیا۔کالج کے ایک جز وقتی لیکچرار نے

ش۔ فرخ کا انٹرویو لے کر ایک اخبار میں شائع کر دیا۔م یہ انٹرویو دیکھ کر سیخ پا ہو گئے اور ڈرایا کہ اگر یہ اخبار ان کے گھر والوں نے دیکھ لیا تو اس رشتے سے انکار کر دیں گئے۔ان کے لہجے میں غصہ اور تلخی تھی جس سے ش۔ فرخ خود کو مجرم سمجھنے لگی وہ تو ان کے گھر والوں نے اخبار نہیں دیکھا تھا تو شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ ش۔ فرخ نے شادی کے لیے بینک سے قرض لیا اور کالج میں تین ماہ کی چھٹی اپلائی کی۔ بارات میں دولہے کے والدین شامل نہیں تھے گنتی کے چند لوگ تھے ان ہی میں سے کسی ایک کے گھر قیام کیا۔یوں دلہن دلہن کا کھیل ختم ہو گیا۔ کراچی واپس آکر کچھ دن دعوتوں اور گھر کی آرائش میں گزر گئے۔ مجازی خدا نے کالج میں دوبارہ نوکری کرنے کی اجازت نہیں دی بہت اصرار کے بعد کہا وہاں جا کر استعفی دے آؤ۔ کالج والوں نے پہلے ہی اس جگہ کسی اپنے کو رکھ لیا تھا۔ملازمت چھوڑنے کے بعد پر آسائش ازدواجی زندگی میں اپنی اہمیت گھر میں رکھے ہوئے فرنیچر سے زیادہ نہ تھی۔ شوہر نے چند سالوں میں کئی گھر تبدیل کیے جس کی وجہ اپنی اصلی حقیقت کو چھپانا تھی۔م اکثر کاموں کا بہانہ کرکے گھر سے غائب رہتے تھے۔ڈیفنس میں گھر لینے کی صورت میں ان کا پول کھل گیا۔مالکان نے بتایا کہ گھر دیکھنے تو کوئی اور خاتون آئی تھی اور اس کے ساتھ بچے بھی تھے۔ پھر کڑی سے کڑی ملی ایک بریف کیس میں ایک عورت کی تصویر دیکھی جس کے ساتھ تین بچے اور ان کا شوہر بھی تھے۔ش۔ فرخ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور زمین گھومنے لگی۔ پھر اپنی امی کے گھر جانے کا بہانہ کرکے شوہر کے گھر سے آگئی۔یوں ش۔ فرخ کی زندگی کا ایک باب مکمل ہوا۔ تمام دوستوں نے کراچی واپس آکر نئے سرئے سے زندگی شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ش۔ فرخ نے شادی کے لیے اپنی تمام کشتیاں جلا دی تھی اب پھر زندگی کا آغاز نئے سرے سے کیا۔

نفیس بانو شمع کے ابھی کھیلنے کودنے کے دن تھے کہ گیارہ سال کی عمر میں پچیس سال کی عمر کے لڑکے سے شادی طے کر دی گئی۔ گاؤں میں چھوٹی عمر کی لڑکیوں کی شادی کرنا بڑی عقل مندی کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔نفیس بانو شمع نے ابھی تو اپنی گڑیوں کی شادی کا سوچا ہوا تھا اور گھر والے اس کی شادی کی باتیں کر رہے تھے۔ان کے منگیتر نے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر لی یوں یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ مصنفہ تو خوش ہوئی مگر گھر والے رنجیدہ ہوئے۔ایک جگہ اور رشتہ طے کیا وہاں بھی بات نہ بن سکی آخر کار تیرہ سال کی عمر میں ایک بار پھر منگنی کی گئی۔لڑکا جبل پور میں کسی سرکاری ادارے میں ملازم تھا۔اب وہ خود کو اس گھر میں اجنبی سمجھنے لگی اس کے ذہن میں شادی خوشی کا عنصر بننے کی بجائے نفرت کی علامت کے طور پر سما گئی۔اسے تمام شادی شدہ عورتیں مظلوم نظر آنے لگیں۔کچھ دن بعد خالہ زاد بہن نے آکر آگاہ کیا کہ اس کے گھر والوں نے وہاں پر رشتہ ختم کر دیا ہے۔ معاشرتی رسم ورواج کے مطابق شادی بیاہ میں لڑکی کا کوئی داخل نہیں اس کی عمر خواہ کوئی بھی ہو۔اس دوران نفیس بانو کو خاندان کے کسی لڑکے کو پسند کرنے

لگی مگر ان ہی دنوں اس کا ایک رشتہ آیا جو گھر والوں کو مناسب لگا اور اس کی شادی طے کر دی گئی اور اپنے سسرال گئی۔ پہلے دن ہی مجازی خدا نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے یہ زبردستی کی شادی ہے۔ اس نے گھر آ کر سب کچھ بتایا تو گھر والوں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے مرد ایک وقت میں کئی کئی بیویاں رکھ سکتا ہے یہ اس کا شرعی حق ہے۔ بیوی کے اخراجات پورے کرے باہر جو مرضی کرے اس سے کوئی غرض نہیں۔ معاشرتی اور خاندانی نظام میں ہونے والی زیادتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہے: "لڑکی کی جہاں شادی ہو رہی ہوتی ہے اسے لڑکے کی شکل وصورت بھی نہیں دکھائی جاتی وہ تو بس کھونٹے کی گائے ہوتی ہے جہاں چاہو باندھ دو۔"(۲۹) وہ کم سن ضرور تھی مگر خود سر اور ضدی بھی تھی ایک سال بعد سسرالی لینے آئے تو جانے سے انکار کر دیا۔ اس بغاوت نے گھر میں طوفان برپا کر دیا ایسی صورت میں گھر کے اندر ہنگامہ ہو گیا۔ گھریلو سازشوں کے ذریعے ماں نے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دی تو نانی نے اپنی محبت کا واسطہ دیا ماموں نے غصے بھری آنکھوں سے ڈرانے کی کوشش کی۔ ایسی صورت میں ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہاں کون اس کی سنتا۔ بے بسی کے عالم میں شوہر کے ساتھ بمبئی چلی گئی۔ وہاں شہر اور گاؤں کی دنیا ہی الگ الگ تھی۔ شوہر بھی حد درجے کا عیاش تھا۔ شراب نوشی کے ساتھ ساتھ درجنوں محبوبائیں تھیں۔ سب سے بڑا طبیب اور مسیحا شوہر ہوتا ہے وہ بھی زندگی کے کسی موڑ میں رفیق ثابت نہ ہوا۔ وہ اپنے گھر میں ہی اجنبی مسافر کی طرح زندگی گزر رہی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر خودکشی کر لی مگر پھر بھی بچ گئی۔ شوہر نے دھمکی دی کہ مرنا ہے تو اپنے میکے جا کر مرو یہاں اس کی زندگی کیوں عذاب بنا رہی ہو؟ اس کے ساتھ ہی ظلم و تشدد میں مزید اضافہ کر دیا۔ وہ اپنی بے بسی اور کسم پرسی کے بارے میں لکھتی ہیں: "بائیس سال کی عمر میں تین بچوں کی ماں بن گئی تھی، دو بیٹیاں، ایک بیٹا، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جب آپس میں محبت نہیں تو بچے کیسے پیدا ہو گئے؟ اس بات میں سچائی ہوتی تو طوائفہ کیوں ماں بنتی ہے اس سے کون محبت کرتا ہے؟"(۳۰) اپنی ازدواجی زندگی کے دوران نفیس بانو شمع نے تین دفعہ خودکشی کی مگر بچ گئی۔ ایک دن شیشے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اسے مینا کماری یاد آ گئی جیسے دکھوں کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ اس کو بھی زندگی میں آرام وسکون نہ ملا۔ والدین کے گھر میں غربت تھی ان کو بیٹے کی خواہش تھی لہذا پیدائش کے بعد اسے یتیم خانے چھوڑ آئے دائی کو دینے کے پیسے بھی نہیں تھے بعد میں پدرانہ شفقت غالب آئی اور برداشت نہ کرنے کی وجہ سے واپس لے آئے مینا کماری نے چار سال کی عمر میں ایک فلم میں کردار ادا کر کے اپنے کنبے کی کفالت کی۔ اکیس سال کی عمر میں اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اپنے سے دوگنی عمر کے شخص کمال امروہی سے شادی کی۔ جو شک کی بناء پر کڑی نگرانی اور سخت شرائط کی بناء پر کامیاب نہ ہو سکی اور انتالیس سال کی عمر میں وفات پا گئی۔ اپنے فن میں عروج حاصل کیا اور مرنے کے بعد شہرت حاصل کی۔ یوں نفیس بانو شمع نے اپنی زندگی کے

ساتھ ساتھ دوسری عورتوں کا موازنہ بھی کیا وہ لکھتی ہیں:"عورت کبھی مینا، کبھی میرا بن کر تاریخ کے اوراق میں اپنے آپ کو دوہراتی رہے گی۔"(۳۱)

اس نے بھی اپنی زندگی کے مسائل کا حل عام گھریلو عورتوں کی طرح صرف مذہب میں تلاش کیا اور اپنے علاقے کی ایک عمارت میں واقع خانقاہ میں ضلع رام پور کے سجادہ نشین تشریف لائیں جن کے ہاتھوں بیعت کر کے سلسلہ چشتیہ میں داخل ہو گئی مرشد کی ہدایت کے مطابق کثرت سے دورد شریف پڑھنے لگی۔ شوہر کا رویہ جوں کا توں تھا مگر اب نفیس بانو شمع نے ان حالات پر واویلا مچانے کی بجائے بڑے بڑے دکھ بھی مسکرا کر برداشت کرنے کا ہنر سیکھ لیا تھا اور اپنے گردوپیش عورتوں کو پیش آنے والے مسائل کا جائزہ لینے لگی تھی۔ اس دوران وہ بغیر محرم کے حج پر بھی گئی۔ اسی سمجھوتے نے ان کی تخلیقات کو بھی بام عروج بخشا۔ شوہر اپنی حرکات سے باز نہ آیا اور اس نے نفیس بانو شمع کو طلاق کا پروانہ تھما دیا۔ جن تین حروف کی وجہ سے قید ہوئی تھی ان ہی تین حروف نے اسے آزاد کر دیا۔ طلاق کے بعد نفیس بانو نے کوئی ملازمت تو نہ کی البتہ مکانات کی تعمیرات کا کام شروع کیا تاکہ اپنے تینوں بچوں کا پیٹ پال سکے۔

تنگ نظر لوگوں کے ساتھ ساتھ روشن خیال گھرانوں میں قرۃ العین حیدر کا شمار بھی ہوتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم ایک روشن خیال باپ تھے ان کا خواب تھا کہ اس کی بیٹی قرۃ العین کا پڑھ لکھ کر والدین کا سر فخر سے بلند کر دے۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار نذر سجاد سے اس وقت کیا جب انہوں نے ایک اخبار میں باپ بیٹی کی تصویر دیکھی جس میں بیٹی کے ہاتھ میں سند تھی۔ جو انگلستان سے کوئی زبردست ڈگری کر کے آئی تھی۔ اس بارے میں سجاد حیدر یلدرم کہتے ہیں:"ایک دن ہم بھی ان بڑے میاں کی طرح کھیسیں نکالے مسرور کھڑے ہوں گے جب بی بی انگلستان سے اعلیٰ تعلیم ختم کر کے لوٹیں گی۔"(۳۲)

قرۃ العین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نا صرف باپ کا خواب پورا کیا بلکہ اردو ادب میں اعلیٰ مقام بھی حاصل کیا جس کی وجہ سے اس کے والدین کی شناخت مکمل ہوتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے خاندان کے کنبے کی خواتین کا ایک کتابچہ تیار کیا۔ جس میں اختر سہروردی، لیڈی عبداللہ، المامون سہروردی، بیگم شیر بنگال فضل الحق وغیرہ شامل ہیں۔ احوال رجال کے حوالے سے "کار جہاں دراز" طویل بیانیہ کتاب ہے جہاں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مصنفہ کو سیاحت کا شوق تھا جہاں بھی جاتیں کوئی نہ کوئی عزیز و اقارب جانے والا ضرور مل جاتا اور ان کی حیثیت ان کے درمیان ملکہ مکھی Queen Bee کی طرح ہی رہی۔ چند اہم خواتین کا ذکر تفصیل سے کرتی ہیں جن میں بیگم شائستہ اکرام اللہ لندن سے پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی خاتون تھی جو اقوام متحدہ میں پاکستان کی مندوب اور مراکش

کی سفیر تھیں۔کلاسیکل رقص میں مسلم گھرانے کی تین سے چار خواتین اپنا مقام پیدا کر سکیں اس کی وجہ کلاسیکل رقص کے بارے میں ہمارا تصور ہے جس میں فلمی ناچ، مڈل ایسٹ کے بیلی ڈانس اور طوائف کے مجرے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد شیما کرمانی نے چالیس لڑکیوں کی کلاس رقص کے لیے تیار کی۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آدھی سے زیادہ مسلمان لڑکیاں رقص سیکھانے گئی۔ سحاب قزلباش لندن میں مقیم رہیں بعض لوگ کہتے ہیں وہ سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئیں مگر وہ ریڈیو کے لیے اس دنیا میں آئیں وہ اپنے سکول کے زمانے سے آل انڈیا ریڈیو دلی سے براڈ کاسٹ کرتی رہیں وائسرائے کی بیوی نے ریڈیو سیٹشن کا چکر لگایا تو سحاب قزلباش کو "بی۔بی۔سی اناؤنسر کہہ کر ملوایا گیا۔ان کی رشتہ دار آمنہ نے بڑی ہمت سے ویمنز کالج قائم کیا۔بیگم عبد اللہ ہارون ان کی والدہ کی دوست تھی جو برصغیر میں تعلیم نسواں کی حامی تھی۔ان کی بیٹی رشید جہاں نے رینو کا دیوی فلمی نام اختیار کیا ان کی والدہ کو یہ قلق تھا کہ جو لوگ آزادی نسواں کے مخالف ہیں وہ کہیں گے دیکھیئے کیا نتیجہ نکلا شریف زادیاں ایکٹریس بن گئی۔عطیہ فیضی ہندوستان کی ایک اساطیری شخصیت تھی جن کے بارے میں انگریز لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر تم ہندوستان جاؤ دو چیزیں نہ دیکھو تاج محل اور عطیہ حبیب اللہ تو تم نے کچھ نہیں دیکھا۔وہ لندن گئی اور ایک علمی حلقہ ان کے ساتھ نمائندہ رہا۔بی بی سی میں براڈ کاسٹ کرنا شروع کیا۔خواتین میں کوئی ممتاز شیریں پیدا نہ ہوئی۔ قرۃ العین نے جدید عورت کے تصور کو بیان کرتے ہوئے اپنی والدہ کو مد نظر رکھا ہے ان کے خیال میں وہ نئی عورت وہ ہے۔”جو سائیکل چلاتی تھی ٹائپ رائٹر اور ٹائپسٹ تھی جو اپنی روزی خود کماتی ہے اگرچہ انگلینڈ اور کیمبرج کے دروازے اس کے لیے بند تھے۔انگلستان کی Suffragate کی تحریک کی پرچھائیں بھی پڑیں۔“(۳۳)انگلستان کی تحریک نسواں سے قرۃ العین خود بھی متاثر تھی اس لیے اس کا ذکر بھی کرتی ہیں۔

۴۔والدین:

والدین پر اولاد کی تربیت ، پرورش،اور تعلیم کی ذمہ داری آتی ہے۔اسی طرح اسلام اولاد کو والدین کی خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے اگرچہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہر مذہب میں آیا ہے لیکن قرآن نے والدین کے حقوق مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔اولاد کو حکم دیا کہ والدین پر اپنا اموال خرچ کروان کے ساتھ نیکی اور احسان سے پیش آؤ۔والدین میں اولین حق ماں کا ہے۔کیوں اولاد کی پیدائش سے لے کر پرورش تک زیادہ مشقت ماں اٹھاتی ہے۔گھر کی سلطنت میں والدین مل کر شریک ہوتے تھے سرمایہ دارانہ نظام نے بوڑھے والدین کے لیے اولڈ ہوم کو متعارف کروایا۔

قرۃ العین کے والدین روشن خیال اور جدید تعلیم سے آراستہ تھے۔ان کے والد علی گڑھ کالج میں سٹوڈنٹ یونین کونسل کے صدر تھے۔ایم۔اے۔او کالج سے ایم۔اے پاس کیا۔ترکی زبان پر عبور حاصل تھا۔ترکی کی کہانیاں اردو میں ترجمہ کرتے تھے۔علی گڑھ کالج کے رجسٹرار تھے۔پہلے رومانوی افسانہ نگار تھے۔تعلیم نسواں کے حامی تھے۔شیخ محمد عبداللہ سے چند سال چھوٹے تھے۔سرسید کے پسندیدہ طالب علم تھے۔انہوں عبداللہ لاج میں ۱۹۰۴ء میں اصلاح نسواں کی تحریک کا آغاز کیا۔جس کے سیکرٹری سجاد حیدر یلدرم تھے۔وہ ز۔خ۔ش مرحومہ کو ان کی جرات اور بہادری کی وجہ سے عورتوں کا اقبال کہا کرتے تھے۔ان کی نذر سجاد بھی کی پڑھی لکھی اور روشن خیال خاتون تھی۔نذر سجاد عقیدے کے لحاظ سے اہل تشیع تھی مگر ماتم کو برا سمجھتی تھی۔انہوں نے اکبری بیگم کے ساتھ مل کر توہمات،بدعت،قبر پرستی اور تعزیہ پرستی کے خلاف اعلان کر دیا۔وہ پردے کے بھی خلاف تھی۔علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی دونوں نذر سجاد کی روشن خیالی اور آزادانہ رویے سے ناراض تھے۔علامہ اقبال نذر سجاد کو سید زادی کہتے تھے۔وہ اس لیے ناراض تھے کہ آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو کر بے پردہ ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اپنی ماں کے دور کو نئی عورت کے دور سے متعارف کروایا۔جو سائیکل چلاتی تھی ،ٹائپسٹ اور ٹائپ رائٹر تھی۔نذر سجاد کے دور میں آکسفورڈ یونی ورسٹی کے دروازے عورت کے لیے بند تھے۔نذر سجاد بھی آزادی نسواں کی حامی تھی۔ان کے گھر میں عورتوں کی محافل بھی ہوتی تھی جس میں عورتوں کو درپیش مسائل زیر غور لائے جاتے تھے۔شادی کے بعد موٹر سائیکل چلاتی تھی،پردہ ترک کر دیا اور آزادی نسواں کی حمایت میں افسانے اور ناول لکھے۔ان کے ناول "آہ مظلوماں" پر فلم بھی بنی۔یہ سب کچھ قرۃ العین کے والد کی حوصلہ افزائی اور روشن خیالی کی وجہ سے ہوا۔قرۃ العین کو جب "آگ کا دریا" کی وجہ سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا تو ان کی والدہ نے اپنی مثالیں دے کر حوصلہ افزائی کی۔جس کے والدین آزادی نسواں کے حامی ہوں وہ کیسے حقوق نسواں سے عاری ہو سکتی ہے؟

ادا جعفری اپنی اس آپ بیتی میں انیسویں صدی کی چار مغربی شاعرات کا ذکر کرتی ہیں جن میں روس کی شاعرہ کیرولینا پاولووا،فن لینڈ کی لیرین لیپر اسکی،انگلستان کی ایملی برانٹے اور امریکہ کی ایملی ڈکنسن شامل ہیں۔ان چاروں خواتین پر مظالم ڈھائے۔انہوں نے جانوروں کی طرح ان تکالیف کو برداشت نہیں کیا بلکہ ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ادا جعفری ان شاعرات کے تناظر میں خود کو دیکھتے ہوئے لکھتی ہیں کہ میں اپنی شاعری کو اس ماحول اور عصر سے بغاوت کہنا تو چاہتی ہوں مگر کہہ نہیں سکتی۔بغاوت اجازت کی تابع نہیں ہوا کرتی مجھے اپنی ماں کی اجازت حاصل ہے۔ادا جعفری پر آنے والا مشکل وقت ان کی عظیم ماں کی قربانیوں سے کاٹا۔

زمانہ قدیم میں لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اسلام نے کسی بھی قسم کے خوف کی حالت میں اولاد کے قتل سے منع کیا اور بیٹیوں کی اچھی تربیت کرنے پر جنت کی نوید سنائی۔بیٹیاں دکھ درد میں اپنے والدین

کا ساتھ دیتی ہیں۔ عصمت نے اپنی ماں کو دیکھا جو دس بچے پیدا کر کے بھی تنہا تھی تو اس کو اپنی ماں پر بہت پیار آیا۔ اس نے ایک طرف اپنی بیٹی کو دیکھا دوسری طرف ماں کو اس نے اپنی ماں کی خدمت اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے زیادہ کی۔ عصمت چغتائی اپنی جرات اور بے باکی اپنے بچوں میں بھی منتقل کرنا چاہتی تھی کیوں کہ ان کے خیال میں مجبور، ماتحت اور فرماں بردار بیوی ذہنی طور پر غلام اولاد ہی پیدا کر سکتی ہے جو محکوم معاشرے کو جنم دیتی ہے۔ عورت آنے والی نسلوں کی امین ہے۔ اس کے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کی جرات ہونی چاہیے۔

نثار عزیز بٹ نے اپنے بچوں کی بڑی محبت سے پرورش کیا وران کی بہتر پرورش اور تربیت کے متعلق کتابوں سے بھی مستفید ہوئی۔ بچوں کی وجہ سے ہی رائیٹر ز گلڈ کی ایگزیکٹو ہونے کا اعزاز قابل قبول نہ کیا۔ دوسری طرف بچوں کی اداسی نے ڈھاکہ کانفرنس میں جانے سے روک دیا۔ وہ لکھتی ہیں: ”دنیا کی سب سے بے بس مخلوق چھوٹے بچوں کی ماں ہوتی ہے بچے تو مجھے غسل خانے میں بھی نہیں جانے دیتے۔“[۳۴] قرض لے کر مکان بنوایا۔ والدین اپنے بچوں کے لیے فکر مند نہ رہتے ہیں ورنہ بچے عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی محنت کا نتیجہ ہے کہ ان کے دونوں لڑکے اب پروفیشنل کالجز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ احمر امریکہ کے بروکلن ہسپتال میں نیویارک میں بڑے عہدے پر فائز ہے جبکہ اشعر سان فرانسسکو میں معروف سافٹ ویئر انجینئر ہے۔ سعیدہ بانو احمد نے اپنے دونوں بیٹوں کی پرورش خود کی۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ بھابی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بھی گود لے لیا۔ جس کی ذمہ داری سعیدہ بانو احمد کی بھانجی نے لی۔ ہجرت کے پر سوز حالات میں سعیدہ بانو احمد کشمکش کا شکار ضرور رہی مگر کچھ دنوں بعد فیصلہ کرتی ہیں۔ کہ جو کچھ مرضی ہو وہ اپنے بیٹے کو کسی کے پاس نہیں بھیج سکتی۔ وہ لکھتی ہیں: ”نہیں سعیدہ میرا بچہ کہیں نہیں جائے گا اگر مرنا ہے تو میرے کلیجے سے لگ کر ہی مریں گے ہم دونوں۔ خانم کی جان کی میں ذمہ دار ہوں اور رہوں گی آخری دم تک۔“[۳۵] ان کے مطابق بچوں کی تربیت ایک کٹھن مراحل ہوتا ہے لیکن باپ کی وفات کے بعد مزید مشکل ہو جاتی ہے۔ ان کے خیال میں میاں بیوی کے رشتے میں دراڑ بچوں پر بہت زیادہ منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس لیے وہ لکھتی ہیں: ”عورت ڈگر سے ہٹ جائے تو پہلے ہی معتوب ہو جاتی ہے، میں تو اپنی بچی قوتوں کو برقرار رکھنے میں لگ گئی تھی جس کے سہارے مجھے اپنی ناؤ پار لگانا تھی۔“[۳۶] جب نورالدین سعیدہ بانو احمد کے گھر آتا تھا تو سعیدہ بانو احمد کو لوگوں سے زیادہ اپنے بچوں کی پرواہ تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے اعتماد میں لیا۔ اور کہا اگر بہتر سمجھے تو بورڈنگ کو چھوڑ کر ماں کے پاس آکر رہے ورنہ جو فیصلہ کرے اسے منظور ہے۔ سعیدہ بانو احمد کا بیٹا کچھ دنوں بعد آکر رہنے لگا نورالدین اپنے معمول کے مطابق آتا رہا۔ نورالدین کے بچوں نے سعیدہ بانو احمد کو دل سے اپنی ماں قبول نہ کیا۔

ب۔ جدید عائلی تصورات:

ا۔ ماں، بہن، بیوی، بیٹی بحیثیت دوست:

وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے باہر خراب دوستیاں نبھانے سے بہتر ہے کہ اپنے قریبی رشتوں کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کیا جائے تاکہ ان رشتوں میں مضبوطی پیدا ہو اور یہ بدلتے وقت کا ساتھ دے سکیں۔

۲۔ بیوی بحیثیت دوست:

میاں بیوی کا رشتہ بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ یہ پتھر سے زیادہ مضبوط اور شیشے سے زیادہ نازک ہے۔ اس رشتے کی عمارت اعتماد پر کھڑی ہوتی ہے عارضی اور اصلاح پسندانہ اختلافات ایک فرد کی زندگی کو بامقصد بنادیتے ہیں۔ اس رشتے میں ڈر سے زیادہ دوستانہ معاملات زندگی کو ہموار بناتے ہیں۔ روشن خیال اور نئی عورت اپنے شوہر کی دوست اور ساتھی ہے نہ کہ صرف بچے پیدا کرنے والی مظلوم انسان۔ عصمت چغتائی نے پسند کی شادی کی۔ شادی کے بعد بھی ان کے آپس میں دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ وہ اپنے تمام افسانے اور ناول شائع کروانے سے پہلے نظر ثانی کرنے کے لیے دیتی تھی۔ شادی کے بعد شاہد لطیف نے عصمت چغتائی کو لکھنے سے منع کیا تو انہوں نے بڑی دلیری سے جواب دیا کل وہ ان کو کہیں گئے سانس بھی نہ لو۔ عصمت چغتائی کو لکھنے سے عشق تھا۔ اس کی شخصیت کی تکمیل لکھے بغیر نہیں ہوسکتی تھی اس لیے تو وہ کہتی ہیں: "میرا قلم میرا رزق بھی ہے اور ہمدم بھی، تنہائی کا بولتا چلتا دوست بھی۔"(۳۷) عصمت چغتائی کے مطابق مرد اور عورت ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں ایک نکال دیا جائے تو چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عابد حسین کی شادی نوعمری میں ان کی چچازاد شفاعت فاطمہ سے ہوئی تھی جو کامیاب نہ ہوئی۔ وہ اپنے والدین کے پاس رہتی تھیں۔ عابد حسین پہلی بیوی کو اس کا نان نفقہ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے سترہ سال تنہائی میں گزرے۔ پھر اپنے دیرینہ دوست کی بہن مصدق فاطمہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی جو ان سے دس سال چھوٹی تھی۔ جو بعد میں صالحہ عابد حسین کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس شادی میں صالحہ عابد حسین کی مرضی بھی شامل تھی۔ ان کے بھائی نے روشن خیالی کا اظہار کرتے ہوئے بہن کو خط لکھ کر اس رشتے کے بارے میں رائے لی۔ ان کی نظر میں صالحہ عابد حسین کے لیے دو اور بھی رشتے تھے۔ کافی سوچ وبچار کے بعد مصداق فاطمہ نے فیصلہ کیا کہ: "میری زندگی کا ساتھی ایسے ہی اخلاق وسیرت کا شخص ہو گا جیسے عابد ہیں۔"(۳۸) بچپن میں صالحہ عابد حسین نے والدہ افضل علی کا ناول "گوڈر کا لال" نہ صرف پڑھا بلکہ پورے خاندان کو سنایا۔ اس وقت انہیں ثریا کا کردار پسند آیا تھا

جس نے ناسازگار حالات میں بھی اعلی تعلیم حاصل کی۔ مہر جبیں کا کردار تب اس کے لیے اتنی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ وہ تو ثریا بننا چاہتی تھی مگر اس کی زندگی ماہ جبیں کی سی ہو گئی جس کا اسے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ وہ لاشعوری طور پر ماہ جبیں ہی اس کی آئیڈیل کردار تھی۔ کیوں کہ ماہ جبیں یوسف کی دوسری بیوی تھی جس نے اپنی پہلی بیوی سے خود اپنے تعلقات استوار کیے تھے اور اس سے محبت اور احترام سے پیش آتی تھی۔ ہندوستانی معاشرے میں سوت کا رشتہ ناقابل برداشت اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کا عام چلن ہے کہ سوت کی بجائے مرنا قبول کر لیا جاتا ہے مگر صالحہ عابد حسین نے انیس برس کی عمر میں اپنی سوت کے ساتھ دوستانہ روابط رکھے۔ اس کی دوستوں نے اس کی سوت کو مذاق میں اس کی ''ہم زلف'' کہا کرتی تھی۔ عابد حسین نے گھر کی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ان کے خرچے کی ذمہ داری بھی صالحہ عابد حسین کو سونپ دی۔ جس کو انہوں نے اپنی آمدنی اور وسائل سے بڑھ کر پورا کیا کیوں کہ وہ اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ چالیس برس کی تھی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے خود کو بوڑھا اور بے سہارا محسوس کرتی تھی۔ ایک دن چلنے میں مشکل ہو رہی تھی کہ صالحہ عابد حسین نے سہارا دیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر راستہ طے کیا۔ دوسری طرف عابد حسین کی بہن کی شادی اس کی پہلی بیوی کے بھائی سے ہوئی تھی۔ وہ اپنی سوت کے معاملات کے بارے میں لکھتی ہیں: ''شاید اس سے کسی ایسی عورت کو روشنی ملے جس کو میری طرح اس کٹھن وادی سے گزارنا پڑ جائے۔''[۳۹]

انہوں نے عابد حسین کے ساتھ زندگی کے خوب صورت لمحات گزارے۔ وہ ہر معاملے میں اپنے شوہر کی رائے کو مد نظر رکھتی تھی۔ اپنی شادی کے ایک دس ماہ بعد صالحہ عابد کو ماں بننے کی خوش خبری ملی۔ ان تمام خوشیوں کو نظر لگ گئی۔ صالحہ عابد حسین کو بہت سی بیماریوں نے گھیر لیا۔ ۱۹۴۳ء میں ان کے گردے میں ورم ہونے کی وجہ سے پہلا آپریشن ہوا۔ اس دور میں نہ پنسلین تھی نہ انٹی بائی ٹیکس، زخم کو فطری طور پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ انہوں نے ساڑھے تین سالوں میں سات چھوٹے بڑے آپریشن کروائے۔ ایک دفعہ تو بے ہوش کرنے والی سوئی زنگ آلودہ تھی۔ وہ اپنی بیماری کے بارے میں لکھتی ہیں: "علی گڑھ کے سول سرجن نے ابا جان سے کہا تھا اس لڑکی کی بلی کی طرح نو زندگیاں ہیں۔"[۴۰] بیماریوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی نمونیہ، گردے میں پھوڑا اور نہ جانے کیا کیا کچھ اکٹھا کر لیا تھا۔ ان کا شوہر اکثر بہلاتا کہ وہ جلد ٹھیک ہو جاؤ گی تو وہ سیر کرنے جائیں گے۔

وہ اتنی بہادر تھی کہ اپنی بیماریوں سے لڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے عزیزوں کی بیماریوں کو بھی برداشت کیا جن میں بھائی، بھابی، اور شوہر شامل ہیں۔ ان تمام مشکلات کے باوجود ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار رہی۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں لکھتی ہیں: ''میرا ان کا سب سے قریبی رشتہ تھا وہ میرے رہنما بھی تھے اور دوست بھی۔''

(۴۱)ہمارے معاشرے میں صدیوں سے میاں بیوی ایک دوسرے کو چاہتے آئے ہیں مگر ان میں دوستی بہت کم ہوتی تھی۔شوہر اپنی اہمیت کا احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر دھونس جما کر اور اپنے سے کم تر سمجھ کر کرواتا تھا۔بیوی کو چاہنا آسان ہے مگر عزت اور رفاقت دینا دشوار ہے۔

ادا جعفری کے شوہر نورالحسن نے خط کے ذریعے شادی کا پیغام دیا۔تو ادا جعفری کو غصہ آیا ان کے گھر میں ماں اور بہن کو پہلے ہی خبر تھی وہ چاہتی تھی جس سے ان کی شادی ہو وہ اس کے مزاج اور خیالات سے ممکن حد تک واقفیت کر لے۔نور الحسن دو سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی پھوپھی نے لی۔بہن کے ذریعے ادا جعفری کی ملاقات نورالحسن کی بہن طیبہ سے ہوئی۔نورالحسن کا رشتہ ان دونوں بہنوں کی رضا مندی سے طے ہوا۔نورالحسن اور ادا جعفری کے مزاج ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ادا جعفری نے خود کو بہترین بیوی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ان کے دکھ درد کو بانٹا۔نورالحسن بھی ادا جعفری کی زندگی میں بہار بن کر آئے۔وہ سرکاری افسر تھے وہ اعلی عہدوں پر فائز رہے۔شوہر کے ساتھ ادا جعفری کو بھی مختلف شہروں میں سیر و سیاحت کرنے کا موقع ملا۔اس لیے شادی کے بعد آپ بیتی ایک سفر نامے کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔وہ اپنے شوہر کے بارے میں لکھتی ہیں:"نور نے سائبان بن کر مجھے موسموں کی شدت سے محفوظ و مامون رکھا۔"(۴۲)

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی "ہم سفر" کا مرکزی موضوع ان کا شوہر اختر حسین رائے پوری ہیں، جن کے ساتھ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزارا۔وہ اپنے شوہر کو اپنا آئیڈیل تصور کرتے ہوئے لکھتی ہیں:"میرا شوہر، میرا ساتھی ایک عظیم انسان ہے اور میں بڑی خوش بخت ہوں۔"(۴۳)

پیرس میں قیام کے دوران جب ان کے بیٹے کامران کی طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے لندن کے ذریعے برصغیر واپس آنے کا ارادہ کیا۔تاکہ ان کے شوہر کی پڑھائی میں خلل پیدا نہ ہو۔وہ لکھتی ہیں:

> "اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ کامران کو لے کر لندن چلی جاتی ہوں اور اس کے بہتر ہونے پر ہندوستان واپس لوٹ جاؤں گی 'تاکہ اختر کے دماغ پر کوئی فکر و پریشانی نہ رہے اور وہ یکسوئی کے ساتھ ڈگری لے سکیں۔"(۴۴)

حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے خود کو ایک سلیقہ شعار بیوی ثابت کیا۔ہر طرح سے شوہر کے آرام و سکون کو اہمیت دی۔قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ان کی پسند ناپسند کا خیال رکھتی تھی۔پاس پورٹ کا مسئلہ ہو یا گھر بنوانے کی بات۔ہر معاملے میں پیش پیش رہی۔رسالے کی پروف ریڈنگ اور مضامین کی ترتیب میں شوہر کو مفید مشورے

دیتی۔وہ ان کاموں کو کرتے ہوئے خوش ہوتی کہ انہیں اس قابل تو جانا گیا۔ان پر یہ بات صدق آتی ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

عطیہ داؤد نے معاشرتی رسم ورواج اور پابندیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی زندگی کے جیون ساتھی کا فیصلہ خود کیا جس کا ارادہ انہوں نے بچپن سے ہی کر لیا تھا جب ان کے باپ کی وفات پر ماں کے ناک سے کیل زبردستی اتارئی گئی۔ غم وغصے کے عالم میں عطیہ داؤد نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسی کیل نہیں پہنے گئی جس پر اس کا اختیار نہ ہو۔ اور شادی کا فیصلہ اس وقت کیا جب وہ معاشی اور ذہنی طور پر خود مختار فیصلہ کر سکتی تھی۔وہ ان حالات کے بارے میں لکھتی ہیں:"جب میں اکیلے سفر کر کے اپنی زندگی میں فیصلے کرنے کا اختیار کرنا شروع کر دیا۔"(۴۵)

آبڑو نے عطیہ داؤد کو جینے کا ایک نیا قرینہ دیا۔جس میں وہ ایک خود مختار اور آزادانہ فیصلے رکھنے کا اختیار رکھتی تھی۔آبڑو کے ساتھ مل کر وہ اپنی زندگی زیادہ خوشی اور آزادی کے ساتھ اور مکمل طور پر گزار سکتی تھی۔اس ساتھ نے اسے کمزور نہیں بلکہ مضبوط بنا دیا۔اپنے شوہر کو اپنا ساتھی اور دوست مانتے ہوئے اپنی کتاب کا انتساب اپنے محبوب شوہر کے نام کیا اور لکھا۔"اپنے دوست، محبوب اور شریک حیات خدا بخش ابڑو کے نام۔"(۴۶)

حمیدہ سالم کے نزدیک لڑکیوں کی شادیوں سے بڑا کوئی انقلابی قدم نہیں ہو سکتا۔شادی سے پہلے اور بعد کی زندگی میں زمین آسمان کی طرح فرق ہے حمیدہ سالم کے دادا کی شادی غیر خاندان میں ہوئی جس کو بہت معیوب سمجھا گیا۔ان کے والد قصبے کے پہلے گریجویٹ تھے تعلیم کے ذریعہ روشن خیالی کسی حد تک ان کے گھر داخل ہو چکی تھی۔حمیدہ سالم نے پسند کی شادی کی۔حمیدہ اور سالم دونوں ایم اے کے دوران علی گڑھ یونی ورسٹی کے ہم جماعت تھے۔سالم کے گھر کے معاشی حالات زیادہ مناسب نہ تھے یہ چار بھائی اور پانچ بہنوں میں سب سے بڑے تھے گھر کی زیادہ تر ذمہ داریاں سالم پر ہی عائد ہوتی تھی کہ گاؤں میں تب بجلی بھی نہ تھی مگر یہ دونوں ایک دوسرے کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور شادی کر لی وہ شوہر کو اپنا مجازی خدا سمجھنے کی بجائے دوست تصور کرتی ہے۔سالم کو حمیدہ پر اعتماد تھا اور حمیدہ کو سالم اور ان کے دوستوں پر مکمل بھروسہ تھا۔ان کے خیال میں ہر شخص کی زندگی خوبیوں خامیوں کا مرکب ہوتی ہے اس لیے وہ لکھتی ہیں:"حقیقت میں کوئی بھی شخصیت خواہ مرد کی ہو یا عورت کی مکمل نہیں ہوتی،خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔"(۴۷)

اس لیے ان کی ازدواجی زندگی پر سکون رہی۔ان کے دونوں بچے اعلی تعلیم یافتہ تھے۔اس کے علاوہ ان کی بہن صفیہ کے دونوں بیٹوں نے بھی حمیدہ سالم کے پاس پرورش پائی وہ تعلیم کے سلسلے میں بھوپال اور بمبی گئے۔ سلیمان ماہر نفسیات بنا تو جاوید اداکار جیسے فلمی دنیا میں جاوید اختر کے نام سے پہچانا جاتا ہے ادب اور فلم میں اپنا

نام پیدا کیا۔یوں حمیدہ سالم نے دوہری ذمہ داریاں کندھوں پر اٹھائیں۔گھریلو ذمہ داریوں کو خوشی سے قبول کیا اور حمیدہ سالم نے اپنی دانش مندی اور سلیقہ شعاری سے جلد ہی سسرالیوں کے دل میں گھر کر لیا۔

۱۹۵۴ء میں نثار عزیز بٹ نے اصغر بٹ سے پسند کی شادی کی جبکہ ان کے خاندان میں اپنی برداری کا کاخیل میں ہی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی تھیں البتہ باہر سے لڑکیاں ضرور بیاہ کر لے آتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں لڑکیوں کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی تعلیم کی وجہ سے مصنفہ کی شہرت ہوئی تو رشتے آنے لگے۔وہ دو سال تک کراچی رہے اس دوران ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسل جاری رہا۔نثار عزیز بٹ کی ازدواجی زندگی بہت اچھی گزری کیوں کہ ان کے شوہر بہت خیال کرنے والے تھے یہاں تک کہ ان کا بھائی سرتاج عزیز بھی اتنا خیال نہ رکھ پایا۔وہ لکھتی ہیں:"میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے کہ خدا نے مجھے اس خوشی کے قابل سمجھا۔"(۴۸)

نثار عزیز بٹ کے شوہر اصغر کی توجہ اور محبت کی بات سسرال میں بھی پھیل گئی ایک دن ان کی بڑی بہن نے نصیحت کی کہ اصغر بیویوں سے زیادہ لاڈ پیار کرو تو بیویاں بگڑ جاتی ہیں۔اپنی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں بہتر طور پر نبھانے کے لیے کوئی مستقل ملازمت اختیار نہ کی۔شوہر کی تنخواہ میں ہی تمام اخراجات بڑی سلیقہ شعاری سے پورے کرتی رہیں۔اپنے شوہر کی رضامندی سے ہی اپنے بچوں کو چھوڑ کر بیرون ملک گئی۔زہرا داؤدی کا شوہر اور سسرال تعلیم یافتہ اور ترقی پسند فکر کا حامل تھا۔وہ کبھی بھی زہرا داؤدی کے تعلیمی اور سیاسی معاملات میں رکاوٹ نہ بنے۔انہوں نے ایف۔اے کے بعد باقی کی تعلیم سسرال میں مکمل کی۔ان کے شوہر روشن خیال تھے۔شادی کے بعد ان کے شوہر حبیب نے بھی زہرا داؤدی کے ساتھ کیمونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کر لی۔انھوں نے ہمیشہ زہرا داؤی کی حاصلہ افزائی کی اور قدم قدم پر ساتھ دیا۔پارٹی نے زہرا داؤدی کو کسی یونین کی ہڑتال کے سلسلے میں قیادت سپرد کر دی۔آدھی رات کے وقت پارٹی کے ساتھ جانا پڑا جلدی میں گھر کا دروازہ بھی کھلا رہ گیا۔تکیے کے نیچے رکھے گئے خط میں کسی ضروری کام کا ذکر کیا اور چلی گئی۔یونین کی قیادت کے نتیجے میں زہرا داؤدی کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ دو دن تک جیل میں قید رہی۔شوہر نے اخبار میں گرفتاری کا پڑھ کر بیوی کو رہا کروایا۔ہجرت کے دوران زہرا داؤدی پاکستان آگئی اور ان کے شوہر بھارت میں پھنس گئے اس دوران ان کی صحت تنہائی کی وجہ سے بہت خراب ہو گئی۔وہ مردوں کے بارے میں لکھتی ہیں:"مرد اپنے سارے دعووں کے باوجود بہت کمزور ہے جب ڈوبنے لگتا ہے تو ہمت ہار کر پتوار پھینک دیتا ہے،عورت تنکے کے سہارے بھی تیر سکتی ہے۔"(۴۹)جب شوہر واپس پاکستان آیا تو معائنہ کروانے پر علم ہوا کہ ان کو کینسر ہے زہرا داؤدی نے اس مرض کو شوہر کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیا اور پوچھنے

پر بتایا کہ نمونیا ہے۔ وہ اسی عارضے میں ۱۹۶۷ء میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ کچھ دنوں بعد ان کی والدہ بھی داغ مفارقت دے گئی۔ ان کے دو اہم ستون کی طرح کے مضبوط سہارے چھوٹ گئے۔ ان کے چار بچے تھے۔ بڑا بیٹا پشاور جب کہ باقی کے تین کراچی میں تعلیم مکمل کر رہے تھے۔

یوسف ظفر نے کشور ناہید کو ایک مشاعرے میں دیکھا تو دل میں سمالیا شادی سے پہلے دونوں مری ملنے گئے تو بھائی نے دیکھ لیا اور دونوں کا نکاح پڑھوا دیا اس میں لڑکے کے گھر والوں کو بھی نہیں بلایا۔ پسند کی شادی کرنے پر گھر میں واویلا مچ گیا۔ ماں نے مرضی کی شادی پر اعتراض ہی نہیں کیا بلکہ روایت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پسند کی شادی کر رہی ہے تو دودھ نہ بخشنے اور دوبارہ نہ ملنے کی دھمکی دی اور کافی عرصہ تک اس بات پر باضد رہی۔ بغیر منصوبہ بندی کے شادی ہونے کی وجہ سے دونوں کے پاس کوئی خاص رقم نہ تھی۔ شوہر کے پاس نکاح کے وقت صرف چار سو روپے تھے پہلی رات ہی گھر کے خرچے کا فکر لاگو ہو گیا۔ گھر کی ذمہ داریاں، تعلیم مکمل کرنے کا فکر، اور روزگار کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھانی پڑی۔ شوہر عیاش تھا پسند کی شادی کی وجہ سے کسی پر دوش بھی نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ایسی صورت حال میں گھر کے اندر ایک گھر بن گیا وہ لکھتی ہیں:

> ”گھر کے اندر ایک گھر بن گیا میرا اپنا گھر، میری ذات سے خود کلامی کا گھر، جس میں قلم میرے دوست بن کر میری دل جوئی کرتے اور مجھے مسکراہٹیں بھی دیتے ان کی دوستی پر میں اس قدر اعتماد کرنے لگی کہ جس دن پڑھا نہیں اس دن سمجھا کہ آج خالی خالی ہوں، بالکل اکیلی ہوں۔“(۵۰)

پسند کی شادی کرنے کی وجہ سے دوہرے استحصال کا شکار ہوئی۔ نوکری نہ ہونے کی وجہ سے ادھار کا ناشتا اور کھانا کھاتی سارا دن نوکری کی تلاش میں گزر جاتا شام کو سسرالی دھمکیاں دیتے کہ ہمارا لڑکا چھوڑ دو۔ صبح آٹھ بجے سے گھر کا کام شروع کرتی پھر یونی ورسٹی، وہاں سے دفتر پھر بیوی کی ذمہ داریاں پوری کرنی پڑتیں۔ بچوں کی پیدائش کے دوران چھٹی صرف اس دن کی لی جس دن بچہ پیدا ہوا اور اسقاط حمل کروایا تو دفتر چلی گئی۔

کشور ناہید کا شوہر عیاش تھا اس کو رقاص، طوائف اور مجرے سننے کا بہت شوق تھا رات ہوتی شراب سے لب لرز جام چھلکنے لگتے رات کے بڑھتے ہی مدہوشی کے عالم میں گالیوں کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ صحن میں ہر طرف الٹیاں پڑی ہوتیں۔ یہ عیاشیاں بڑھنے سے بچے بھی بے توجہی کا شکار ہو رہے تھے آخر کار اس کہانی کا اختتام یوں ہوا کہ ایک دن تھانے سے فون آیا ان کا شوہر غل غپاڑے اڑتے پکڑا گیا۔ اطلاع ملنے پر مصنفہ نے خود آ کر ضمانت دی اور ساتھ جرمانہ بھی دیا۔ زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے زندگی نے ساتھ نہ دیا اور گھر کی رہتی سہتی ذمہ داریاں بھی

ان پر پڑ گئیں۔ شوہر کی وفات سعودی عرب میں ہوئی پندرہ دن بعد سسرالی خاندان واپس اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مفتی نعیم سے فتوی لے کر دفتر روانہ ہو گی۔ چالیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔ گھر والوں نے دوسری شادی تو کیا کرنی تھی کبھی نام بھی نہ لیا۔

انیس ہارون کی ملاقات ہارون سے الیکشن میٹنگ کے دوران کمال ظفر کے گھر ہوئی۔ وہ ترقی پسند ماہر نفسیات تھے انتہائی ایماندار پر خلوص، کسی کی برائی نہ کرنے والے، بذلہ سنجی اور ادب کے شوقین تھے۔ انیس ہارون جتنا انہیں جانتی گئی اتنی ہی معترف ہوتی گئی مگر وہ ان سے دوستی کی حد تک رشتہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی ٹیم کا تفریحی دورہ زیارت جا رہا تھا جس میں ہارون بھی جا رہے تھے۔ ان کو گھر سے اجازت ملنا مشکل تھی۔ اس مقصد کے لیے مصنفہ نے اپنی دوست شیبن۔ فرخ کو ساتھ ملایا کہ اخبار مشرق کوئٹہ میں کوئی کام نکالا جائے۔ یہ تو ممکن نہ ہوا البتہ گھر والوں کے سامنے بہانے بنائے اور جھوٹ بھی بولے تاکہ وہ ان کو جانے دیں، تاہم گھر والوں نے اجازت دے دی وہ کوئٹہ سے زیارت پہنچے۔ ان کو چار پانچ دن اکٹھے گھومنے پھرنے کا موقع مل گیا جس دوران ہارون نے اظہار محبت کیا ان کے شوہر ہارون نے پوچھا: "تم میرا خیال رکھو گی؟ Will you take care of me اور میں نے بخوشی حامی بھر لی۔"(۵۱) واپس آکر سب کو بتایا اور سادگی سے شادی کر لی۔ ہارون کے گھر والے خوش تھے کہ انہوں نے دیر سے ہی سہی فیصلہ تو کیا۔ وہ ہنی مون منانے اسلام آباد آئے۔ سسرال اور اپنے گھر کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں جس سے کچھ رنجشیں بھی پیدا ہوئیں مگر دونوں کے تعاون سے حالات بہتر ہو گئے مثلاً ایک عرصے تک ہارون کو مصنفہ سے یہ شکایت رہی کہ ان کے جاتے ہی وہ کیوں اپنی والدہ کے گھر چلی جاتی ہے کیا یہ اس گھر کا اپنا گھر نہیں۔ شوہروں کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ والدین کا رشتہ اتنا کمزور نہیں ہوتا جو چار دنوں میں بھلایا جا سکے جو ہر وقت اپنی بیٹی کی راہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہارون کے والدین ضعیف تھے جن کو خود ایک آدمی کی ضرورت تھی جو ان کی دیکھ بھال کرے تاہم ان کی موجودگی میں تھوڑی دیر کے لیے انیس ہارون باہر جا سکتی تھی۔ نئی نسل کو بڑوں اور بچوں دونوں سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ ان کے شوہر گھر آنے کے بعد پوری توجہ مانگتے تھے کوئی اور کام نہیں کرنے دیتے تھے کسی رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے وقت اور توجہ دینے ضروری ہے ورنہ رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی نوکری یا تعلیمی کام میں ان کے شوہر نے ہر وقت ساتھ دیا اور حوصلہ بڑھایا کیوں کہ وہ بھی سیاسی سوچ کے حامل تھے۔ پاکستان میڈیکل ایسوسیشن کے ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے پاکستان میں سائیکاٹرک سوسائٹی بھی بنا رکھی تھی۔ ان کے تعاون سے ہی وہ زندگی میں آنے والی خوشیوں کا استقبال کر سکی۔ ہارون کے بارے میں فہمیدہ ریاض نے لکھا: "ہارون میں میری دوست کو زندگی کا ایک بہت اچھا ساتھی ملا۔"(۵۲)

۲۔ والدین بحیثیت دوست:

وقت کے ساتھ تیزی سے بدلتی اقدار کا ساتھ دینے کے لیے والدین اور بچوں کے درمیان حامل اقدار کی دیوار کمزور ہوتی گئی۔ کئی پڑھے لکھے اور صاحب فہم ودانش والدین نے بچوں کے ساتھ سختی کی بجائے پیار محبت کا رشتہ استوار کیا تاکہ بچے اپنے مسائل بیان کر سکیں۔ آپس میں پیار و محبت ہونے کی وجہ سے نورالحسن اور ادا جعفری بہترین والدین ثابت ہوئے۔ ادا جعفری نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ادا جعفری کو جن چیزوں کی مجھے خواہش تھی خاص طور پر یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی وہ ان کی بیٹی صبیحہ نے پوری کی۔ جب اس نے میری لینڈ یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی تو ادا جعفری کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پاکستان کی سیاست کے حالات کو دیکھتے ہوئے ادا جعفری نے اپنے سب بچوں کو ملک سے باہر بھیج دیا۔ وہاں پر وہ اچھی ملازمتیں کر رہے ہیں۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری اپنے بیٹے کو خرابی صحت کے باوجود تن تنہا ہندوستان لے کر آئی جبکہ راستے میں جہاز کا انجن بھی خراب ہو گیا تھا ایسی صورت میں ان کے والد کے واقف کار شفیع باعث رحمت ثابت ہوئے اور ممکن مصنفہ کی مدد کی اپنے بیٹوں کی اچھی تربیت کے ساتھ ساتھ عرفان اور سلمان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھی بھجوایا۔ ان کا بیٹا عرفان اکاونٹ آفیسر تھے حکومت پاکستان نے انہیں ان فارمیشن آفیسر کے طور پر منتخب کیا جس پر اختر حسین رائے پوری کو اعتراض تھا۔ عرفان اخبار میں کالم نگار بھی تھا۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری اور اختر حسین رائے پوری نے اپنے بیٹوں کو ملک سے باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا۔ اب وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور کامیاب زندگی گزر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی کسی بھی بہو سے مولوی عبدالحق کی تقلید کرتے ہوئے جہیز نہیں لیا۔ اس آپ بیتی میں ان کی بھانجی آمنہ ممتاز کا ذکر ہے جس نے ایک دور دراز علاقے میں بچیوں کا سکول بنایا۔ ان کی بڑی آپا حاجرہ نے اپنی پوری زندگی کمیونزم کے نام کر دی۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری کے بھائی کے دوست ذکاء اللہ خان تھے جو انگلستان سے تعلیم حاصل کرنے گئے۔ ذکاء اللہ خان کے والد نے زہرہ اور عذرا کو اودے شنکر کے ساتھ کام کرنے کی اجازت دی۔ انکی روشن خیالی کا یہ عالم تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈانس اور ایکٹنگ کی صلاحیت دی ہے تو ضرور استعمال کریں۔ اس سلسلے میں دوستوں اور رشتے داروں کی مخالفت کی بھی پروا نہ کی۔ ان کی بیٹیوں نے بھی ان شعبوں میں خوب نام پیدا کیا۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری بڑی حیرانی کے عالم میں لکھتی ہیں: ”جمیل بھائی سوچیے تو آج سے ساٹھ سال پہلے مسلمان لڑکیوں کے لیے سرعام اسٹیج پر آکر ناچنا، اور ایکٹ کرنا کیا معنی رکھتا ہوگا۔“[۵۳]

اسی آپ بیتی میں مصر کی مشہور فیمنسٹ خالدہ ادیب خانم کا ذکر بھی آتا ہے جو ترکی کی نامور مصنفہ، ناول نگار، افسانہ نگار، صحافی اور سیاسی و سماجی رہنما تھی۔ شروع میں انہوں نے پردے کے موضوع پر کتاب لکھی۔ وہ

حقوق نسواں کی بھی حامی تھی ان کی وجہ سے ہی ترکی مطالبات نسواں کا حامی ہوا۔ انہوں نے مصر کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ترکی میں خواتین کی فوج تشکیل دی۔ ترکی کے عوام کی قربانیوں کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا۔ یورپ اور امریکہ کے اخبارات میں مضامین لکھتی رہی۔ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان آئی تو ان کی ملاقات اختر حسین رائے پوری سے ہوئی۔ واپسی پر انہوں نے "ہندوستان کے اندر" کے نام سے اپنی یادداشتیں قلم بند کیں۔ جب وہ ہندوستان آئیں تو ان کی ملاقات اختر حسین رائے پوری سے ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے انگلستان میں اختر حسین رائے پوری کو مفید مشورے دے۔

حمیدہ سالم کی زندگی بحیثیت والدین بہت کامیاب رہی ان کے تین بچے تھے ایک بیٹی اور دو بیٹے جادو، اویس اور نعمیہ۔ تینوں اعلی تعلیم یافتہ تھے۔ عشو (جادو) نے ٹیکساس انسی ٹیوٹ میں مارکیٹنگ انسپکٹر کی حیثیت سے آیا۔ اس کے بعد امریکن نیشنل کمپنی کے وائس پریزیڈنٹ رہے۔ پھر یورپین کمپنی کے انچارج ہو کر انگلینڈ آ گئے۔ ان کی بیٹی مولانا آزاد یونی ورسٹی سے ہاؤس جاب مکمل کر کے ایم آر سی پی آ گئی وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ اویس نے بھی اپنے شعبے میں بام عروج حاصل کیا۔ عطیہ داؤد کا شوہر روشن خیال اور بچوں کا خیال رکھنے والا تھا۔ ابڑو بچیوں کی تربیت میں اپنی بیوی کا معاون رہا۔ ساجدہ زیدی نے اپنی والدہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے بچوں کی تربیت میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں کو فنون لطیفہ سے دل چسپی تھی۔ ان کی ایک بیٹی زویا کو مصوری اور صبا کو مجسمہ سازی سے لگاؤ تھا۔ ۱۹۷۱ء میں ان کے تمام بچے اعلی تعلیم کے لیے باہر کے ممالک میں چلے گئے۔

کشور ناہید نے اپنے بچوں کو نہ صرف اعلی تعلیم دلوائی بلکہ وہ ملک سے باہر اپنے اپنے پیشے کے ماہر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی مرضی سے شادیاں کیں۔ "بری عورت کی کتھا" حصہ اول کا انتساب بھی ان کے دونوں بیٹوں میزو اور فیصل کے نام ہے۔ اس کے باوجود ان کو شاعری سے لگاؤ ہے جو ان کا اظہار کا ذریعہ ہے وہ لکھتی ہیں کہ: "عورت بیوی اور ماں بن کر جینے سے زیادہ مزا مجھے شاعری میں مل جاتا ہے۔"[۵۴] شاعری نے بہت کچھ سیکھایا پورا ملک اور پوری دنیا ان کو اپنا میکہ لگتی ہے۔ انیس ہارون نے اپنے تینوں بچوں نادیہ، عدنان اور عرفان کی تعلیم و تربیت جدید دور کے مطابق کی۔ بچوں کے بعد عورت کی زندگی ان کے گرد گھومتی ہے ان کے کھانے پینے، سونے جاگنے کا وقت ہوتا ہے روز نئی نئی باتیں سیکھتے ہیں۔ چلنے لگیں تو گھر کی کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی۔ بڑھے ہوں تو ان کی پڑھائی کے مسائل شروع ہو جاتے ہیں۔ ماں کے پاس اپنے لیے تو وقت ہی نہیں بچتا۔ اور ملازمت پیشہ عورت تو اور بھی

مصروف ہو جاتی ہے انیس ہارون لکھتی ہیں: "آپ ورکنگ مدر ہوں تو اور بھی وقت کو مداری کی طرح اپنی انگلیوں پر نچانا پڑتا ہے۔"(۵۵)

انہوں نے اپنی بیٹی نادیہ کی بیماری کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی تا کہ ان کو بھرپور وقت دے سکے۔ ان کے تینوں بچوں کی عمروں کا فرق بھی کم تھا۔ نادیہ ڈاکٹر بنی۔ عرفان نے بھی میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ عدنان منی سوٹا چلا گیا۔ ایک بار بچے پڑھنے چلے جائیں تو پھر ان کے لیے آگے کی دنیا وسیع ہوتی چلی جاتی ہے۔ نادیہ نے گریجویشن کے بعد شادی کی جو خاندانی روایات پسند لوگ تھے ان کے ساتھ زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ والدین کے لیے بیٹی کا گھر آجانا قیامت سے کم نہیں ہم خواہ کتنے بھی ماڈرن ہو جائیں ہزار وسوسے دل میں آتے ہیں۔ یہ شکر ہے کہ نادیہ کے پاس تفویض طلاق کا حق تھا جو ہر لڑکی کے پاس ہونا چاہیے۔ اب نادیہ امریکہ میں اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر رہی ہے۔ عدنان نے کمپیوٹر سائنس پڑھا مگر اس کو لگاؤ ڈاکومنٹری اور فلم بننے میں تھا عدنان نے والدین کی پسند سے شادی کی اور عرفان ابھی نیویارک میں تھا۔ والدین کی وفات کے بعد اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی اولاد کی طرح پالا۔ ان کے دونوں بھائیوں نے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرون ملک چلے گئے۔ انیس ہارون کی آپ بیتی "کب مہکے گی فصل گل" کے کچھ حصے ان کی دوست فہمیدہ ریاض کی زندگی کے چند گوشوں پر بھی مشتمل تھے جس میں سب سے زیادہ تکلیف دے حصہ فہمیدہ ریاض کے بیٹے کبیر کی موت کا تھا جس کو فہمیدہ ریاض نے زیادہ سوال کرنے اور انتظامیہ کی طرف سے وارننگ ملنے پر اپنی بہن فرحت کے پاس امریکہ پانچ سالوں کے لیے بھیج دیا تھا اس کے بعد وہ مطمئن ہو گی تھی۔ ۲۰۰۷ء میں کبیر امریکہ کی ایک نہر کے بند کے پاس تیرتے ہوئے ڈوب گیا اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ فہمیدہ ریاض کے لیے جیسے زندگی ہی ختم ہو گئی ہو۔ ان کی دوست انیس ہارون نے لاکھ دلاسے دینے کی کوشش کی مگر ماں کی ممتا کو کہاں چین آتا ہے۔ انیس ہارون فہمیدہ ریاض کے دکھ کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "میں اسے کچھ لکھنے کا کہتی تو اس کا جواب ہوتا، وہ فہمیدہ ختم ہو گئی ہے اب میں کبھی قلم ہاتھ میں نہ پکڑوں گی۔"(۵۶) یوں انیس ہارون نے اپنی پیاری دوست کو غم کے اندھیروں میں کھو دیا۔

۳۔حیاکا معیار:

شرم وحیا کا معیار بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا گیا جس میں مذہب کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار اور آئے روز بدلنے والے فیشن نے بھی جگہ بنالی۔ شروع میں عورت اپنی پسند کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ گھر سے باہر اپنے والدین اور شوہر کی مرضی کے خلاف قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ ان کی پسند اور ناپسند کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کے فیصلے کرتی تھی۔ بیوی اپنے شوہر کو اس کے نام کی بجائے منے کے ابا کہہ کر پکارتی تھی کیوں کہ وہ اصل نام لیتے ہوئے شرماتی تھی۔ اس کے سامنے کچھ کھاتے ہوئے شرماتی تھی اٹھارویں صدی میں میر نے اپنے تذکرے "نکات میر" میں ۱۰۴ خواتین شاعرات کا ذکر کیا مگر اپنی بیٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے شرم محسوس کی اس وقت عورتوں کے ناموں کو معاشرے کے سامنے لانا بے حیائی کے زمرے میں آتا تھا ڈاکٹر طارق ہاشمی نے اپنے سوشل میڈیا لیکچر میں ریختی کے بدنام ہونے کی ایک وجہ خواتین کے احساسات، جذبات اور خیالات بیان کرنے کی اختراع ڈالنا بتائی ہے اس سے پہلے عورتوں کو ایک بے زبان مجسمہ سمجھا جاتا تھا جس کا خاموش رہنا ہی حیا کی علامت تھی جو اب بھی کچھ پس ماندہ علاقوں میں حیا کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ عورت اپنا حق وارثت بھی مانگتے ہوئے شرماتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اقدار میں تبدیلی آنے سے حیا کے معیار بھی بدل گئے۔ بہت سے روشن خیال گھرانوں نے لڑکی کو اپنی پسند کی شادی کا اختیار دے دیا، جدید تعلیم اور ملازمت کے نئے مواقعوں سے متعارف کروایا۔ فساد کی جڑ شرم وحیا کی عدم موجودگی کو سمجھا جاتا ہے جس سے فحاشی و عریانی کے بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ شرم وحیا یک دم ختم نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ بے شرمی بے حیائی کے دائرے سے باہر ہو جاتا ہے۔ آج کل ٹیلی ویژن، وی سی آر، یوٹیوب اور سوشل میڈیا کے ذریعہ ایک کلک سے بے حیائی اور بدکاری کے مناظر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان سے کوئی لطف اندوز ہونا چاہے تو کوئی روک ٹوک نہیں۔ یہ سب باتیں والدین کو پہلے سے زیادہ محتاط اور جدید طرز کی تربیت کا تقاضا کرتی ہیں جس میں کوئی صنفی فرق روانہ رکھا جائے۔ جن باتوں کو والدین حیا کے زمرے میں لاکر اپنے بچوں سے چھپاتے ہیں باہر کے لوگ ان ہی باتوں کو بتا کر بچوں کو بے راہ روی کا شکار کرتے ہیں۔ وقت آنے پر ضروری باتوں سے والدین کو ہی اپنے بچوں کا دوست بن کر آگاہ کرنا چاہیے تا کہ وہ معاشرتی گھٹن کا شکار افراد سے ہوشیار رہیں اور جنسی زیادتی اور ہم جنسیت پرستی سے محفوظ رہیں۔

ایک دفعہ ادا جعفری کو فلم دیکھنے کا بہت شوق پیدا ہوا وہ اپنی فیملی اور دوست زہرہ منصور کو بھی ساتھ لے گئی۔ فلم شروع ہوئی اس کے کچھ مناظر ایسے تھے جن کو دیکھ کر مصنفہ کو شرمندگی محسوس ہوئی اپنے چہرے کو ساڑھی کے پلو میں ڈھانپ لیا پھر سب سے نظریں چرا کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد شوہر وہاں سے اٹھے تو

سب واپسی کی طرف کمربستہ ہوئے۔سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے ماحول میں کھنچاؤ آگیا۔کھانے کی میز پر سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔اچانک زہرا نے ہنس کر ماحول کو خوش گوار بنا دیا۔حمیدہ اختر حسین رائے پوری اپنے شوہر کے متعلق بہت سی ضروری باتیں جاننا چاہتی تھیں مثلاً ان کے گھر جا کر کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟ مگر اب وہ انجانے بنے ہوئے تھے جیسے میرا وجود ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا ہو؟ ہمارے ہاں بہت قریبی رشتے کو بھی شرم وحیا کا لبادہ اوڑھا کر اجنبی بنا دینے کی روایت بہت پرانی ہے۔

سعیدہ بانو احمد کے دور میں شوہر بیوی کا نام لے کر نہیں پکار سکتا تھا بلکہ نام لے کر پکارنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ان کی ساس بیگم رضا بھی اپنے بیٹوں سے کہتی بیٹا تمہارے بابا کہتے ہیں رات گئے تک نہ جاگا کرو۔

ساجدہ زیدی کی بیٹی زویا نے ایک ہندو لڑکے سے اپنی پسند سے شادی کی۔ماں نے اس کی مخالفت کرنے کی بجائے اپنی بیٹی کی پسند کا خیر مقدم کیا اور اپنی استطاعت سے زیادہ شادی کے انتظامات کیے۔طبقاتی کشمش، مذہبی اور ذہنی اختلافات کی بناء پر یہ شادی ناکام ہو گی۔فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری میں عورت کے جنسی جذبات کا کھل کر اظہار کیا جس کی وجہ سے ادبی دنیا میں کھلبلی مچ گئی کہ یہ بے حیائی اور بے شرمی ہے کہ عورت جنسی طلب اور لذت کا اظہار کرے۔ایک دوست ہونے کے ناطے انیس ہارون ان باتوں کو سن کر فہمیدہ ریاض کے دفاع کے لیے لڑتی۔

ج۔نئی اخلاقیات:

اخلاقیات یونانی زبان کے لفظ اخلاق سے نکلا ہے جس کے معنی کردار اور رواج کے ہیں۔اسی طرح اخلاقیات سے مراد کسی معاشرے یا ادارے کے لیے اخلاقی اصولوں اور اخلاقی اقداروں کا مجموعی نظام ہے۔جس کو دوسرے معنوں میں انسان کے انسانوں کے ساتھ تعلقات طے پا جانے کے مجموعے کو بھی اخلاقیات کہتے ہیں۔ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق:"اخلاق ایک گروہ کے باہمی برتاؤ کے طور طریقے متعین کرتا ہے"[۵۷]

اخلاق کسی بھی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، مہذب یا غیر مہذب اخلاق دنیا کے ہر معاشرے کا مشترکہ باب ہے جس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان آزاد ہے مگر وہ کوئی بھی فیصلہ آزادی سے نہیں کرتا کیوں کہ وہ اپنے جذبات کا غلام ہے اس لیے اخلاق کا تعلق جذبات، خواہشات، عقل اور ادارے کی تربیت سے ہے اسلام میں اخلاقیات کا منبع قرآن پاک ہے۔اس کے رہنما اصول ہر معاشرے کے ہر دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔کوئی بھی انسان فطرتاً نیک ہوتا ہے معاشرہ اسے اچھا اور برا بناتا ہے۔وہ اپنے ماحول کے برے اثرات کی وجہ سے گناہ کرتا ہے۔اخلاقیات کی تشکیل تین چیزوں سے ہوتی ہے جن میں قانون، مذہب اور سماج شامل ہیں۔سماجی تنظیموں کی تشکیل حکومت کرتی ہے جس کے احکام قانون

کا درجہ رکھتے ہیں، اخلاقی طرز حیات کا سب سے بڑا سرچشمہ مذہب ہے اس سے بہت سے گناہوں کا سدباب ہوتا ہے اور نیکیوں کی ترغیب ملتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اخلاقیات بھی بدلتی ہے جیسے شمالی ہند میں عورت کا مردوں کی محفل میں جانا بے غیرتی سمجھا جاتا تھا مگر آج کل اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا۔ مہدی افادی نے اپنی بیوی کو خط لکھا تو بزرگوں نے اس کی لے دے کی جب کہ آج کل بیویاں بھی شوہروں کو نامہ شوق لکھتی ہیں کوئی برا نہیں مانتا۔ عربوں میں ایک دور میں بیٹیوں کو زندہ جلا دینے کا رواج تھا تو اسلام نے آکر اس عمل کو قابل نفرت قرار دیا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اختلاف مکان میں بھی اخلاقیات کے اصول بدلتے ہیں جیسے ہمارے ملک میں کوئی لڑکی ہاتھ نہیں ملا سکتی تو باہر کے ملک میں اسی لڑکی کو بوسہ دے کر خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مہذب دنیا میں بھائی کی بیوی پر بری نگاہ ڈالنا معتوب سمجھا جاتا ہے مگر پہاڑی علاقوں میں ایک بھائی کی بیوی سب کی بیوی ہے۔

اخلاق کا مفہوم مختلف قوموں اور زمانوں میں مختلف رہا ہے۔ اگر ایک بات کسی ایک قوم میں معیوب رہی تو دوسری قوم نے اس کو اچھا خیال کیا بلکہ ایک ہی قوم نے مختلف زمانوں میں مختلف معیارات قائم کر لیے۔ فریزر نے مذہبی اخلاق اور عمومی اخلاق میں فرق بیان کیا ہے اس کے خیال میں ہر مذہب کا بااخلاق ہونا اور ہر بااخلاق کا مذہبی ہونا ضروری نہیں۔ جبکہ لی بان نے مذہبی اخلاق کو کتابی اخلاق اور غیر مذہبی اخلاق کو عملی اخلاق کہا ہے۔ کتابی اور عملی اخلاق میں تھوڑی بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ جب کہ اقوام عالم کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اخلاق اور مذہب میں فرق ہے۔ مغربی اخلاقیات میں کانٹ اور ہیگل مشہور ہیں۔ کانٹ نے اپنے فلسفہ اخلاق کی بنیاد حقیقت پر رکھی، نیک انسان وہ ہے جس کا ارادہ نیک ہے مشہور مقولہ ہے کہ: "فرض کی انجام دہی فرض کی خاطر ہونی چاہیے۔" [۵۸] کانٹ کے نظریات غایتی نہیں بلکہ قانونی ہیں انہوں نے فرائض کی ایک لمبی فہرست پیش کی مگر وہ عورت کو ذہین کم اور حسین زیادہ دیکھنے کا متمنی ہے۔ ہیگل بھی اقبال کی طرح شخصیت کی تکمیل کا قائل تھا بس دونوں کا انداز بیان مختلف تھا۔ زیادہ تر مفکرین نے شخصیت کی تکمیل کو اخلاق کا نام دیا۔ سائنسی ایجادات نے انسان کے رہن سہن اور زندگی گزرنے کے طور طریقے ہی نہیں بدلے بلکہ اخلاقی نظریات کو بھی بدل کر رکھا دیا۔ جدید صنعتی دور ہی نئی اخلاقیات کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ کارل مارکس نے اخلاقیات کو سیاسات، معاشیات، نفسیات اور سماجیات کا عکس کہا ہے جو پیداواری رشتوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کی اخلاقیات ختم ہو چکی ہے اب خیر وشر کی فلسفیانہ بحث بہت قدیم ہو گئی ہے برٹرنڈرسل کی کتاب "مذہب اور سائنس" کے مطابق خیر وشر کا معیار بھی انسان نے اپنی خواہش کے مطابق ترتیب دیا ہوا تھا وہ جس چیز کی خواہش کرتا وہ خیر بن جاتی اور جس سے خوفزدہ ہوتا وہ شر کہلاتی تھی۔ نئی اخلاقیات برطانوی استعماریت کے ساتھ نمو پذیر ہوئی اس اخلاقیات کی بنیاد ذاتی

مفاد، انفرادی ملکیت اور استحصالی رشتوں پر استوار کی گئی۔ ہمارا معاشرہ طبقاتی معاشرہ ہے جہاں پر کسی ایک اخلاقی تصور کا اطلاق ممکن نہیں۔ فرد کی عملی اخلاقیات پر طبقاتی سماج اور اس کا جبر اثرانداز ہوتا ہے محکوم طبقے کے لیے قانونی اور سماجی اخلاقیات کی غیر انسانی بندشیں موجود ہیں جو اخلاقیات کو ایک شے میں بدل رہی ہیں۔ ہر فرد دوسرے کو بے جان شے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تمام اخلاقیات مذہب کے تابع کر دی گئی ہے مگر بدقسمتی سے عمل ہندوانہ رسم ورواج پر ہو رہا ہے۔ سارے مفکرین متفق ہیں کہ عورتوں کا پردہ جاگیردارانہ نظام کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ سرمایہ دارانہ اخلاقیات مشین کے بطن سے جنم لے رہی ہے۔ یورپی طرز کے ہوٹل اور دوسروں کی بیویوں کے ساتھ رقص وے کا دور اسی اخلاقیات کا حصہ ہے۔ نئی اخلاقیات طبقات کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تاہم حکمران طبقہ مذہبی اخلاقیات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ آج کل بھوک مٹانے کے لیے لڑکیاں اپنی عزت وعصمت قربان کر رہی ہیں کیا ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم ان کو بداخلاق کہیں۔ مختلف معاشروں اور وقتوں میں اخلاق کے اندر اقدار قدر مشترکہ اور مختلف رہی ہیں۔ علی عباس جلال پوری کے بقول عورتوں کا اخلاق پست کرنے میں خود مردوں کا ہاتھ ہے کیوں کہ عورت کو تمام مکروفریب مرد نے ہی سکھائے ہیں۔ عورت کے حوالے سے اخلاقیات کو دیکھا جائے تو اخلاقی اور مذہبی سطح پر عورت کو ایک شے ہی سمجھا گیا۔ پدرسری معاشرے میں عورت مردانہ معیار کے مطابق خود کو ڈھالتی ہے یہ عمل صدیوں سے جاری وساری ہے۔ مرد شرم وحیا کے معیار بناتا ہے اور عورت کے لیے فیشن ایجاد کرتا ہے اس کے لیے نصاب تعلیم مرتب کرتا ہے غرض کہ مہد سے لے کر لحد تک عورت شعوری اور غیر شعوری طور پر مرد کے احکام پر چلتی ہے۔ ایک زمانے میں عورت کو بھیڑ بکری سے زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی ان کو ذرا ذرا سی بات پر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ افریقہ میں شوہر باربرداری کا کام اپنی بیوی سے لے سکتا تھا۔ اس حوالے سے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> "عورت اپنے شوہر کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور مرد کو اختیار تھا کہ اس سے باربرداری کا کام لے۔ اسی طرح ہمالیہ کے حصوں میں آریہ ہندوؤں نے تبتی قوموں کی طرح اشتراک فی النسواں اختیار کر رکھا تھا اور بازار کی دوسری جنسوں کی طرح عورت کی بھی خرید وفروخت ان کے ہاں رائج تھی۔"(61)

یہ حال ان ہی قوموں کا نہیں بلکہ بہت سی مہذب وشائستہ قومیں یہ ہی انداز اپنائے ہوئے ہیں۔ خود انگریزی قانون میں بھی بیوی پر تشدد کی اجازت ہے۔ فرعونوں کے عہد میں بھی جنس اور مذہب لازم وملزوم

تھے۔ علی عباس جلال پوری مندروں میں عصمت فروشی کا حوالے دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ”آسس (نیل کا دیوتا) کے مندر میں ہر روز ہزاروں دیوداسیاں عصمت فروشی کرتی تھیں۔ ان سے ہم کنار ہونا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔“(62)

ماں، بیٹی، بہو یا اس طرح کے کسی بھی قریبی رشتے سے نکاح کرنا جائز تھا یونانیوں میں لڑکی دیوی کے پاس جا کر اپنی عفت و عصمت قربان کر دیتی۔ اخلاقیات ہر شعبے میں، مذہب کے زیر اثر قائم ہوئی۔ توریت کے مطابق مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق افزائش نسل کے لحاظ سے مرتب ہوا۔ ایک سے زیادہ بیویوں کا رواج اس وقت قائم تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنی سوتیلی ماں سائرہ سے نکاح کرنا شامل ہے توریت ہی کے مطابق حضرت داؤدؑ کا متعدد بیویاں رکھنا اور حضرت سلیمانؑ کا تین سو کنیزیں رکھنا ثابت ہے۔ عبرانی قانون میں بیوی شوہر کی ملکیت ہونے کے ناطے شوہر کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتی۔ انجیل مقدس کے مطابق عورت دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ طلاق کے لیے عصمت فروشی کو جائز سمجھا گیا۔ عیسائیت میں عورت کو ناپاک سمجھا جاتا تھا اور یہ ہی دنیا میں تباہی لانے کا باعث سمجھی جاتی تھی۔ ادارہ نکاح ایک بلند تعلیمات پر مبنی ہے مگر صحیح معنوں میں اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ نکاح کی جگہ جو چیز رائج ہے اسے فحاشی کا نام دے سکتے ہیں۔ فحاشی اور عصمت فروشی عورت کے ساتھ جڑے ہوئے لفظ ہیں۔ حاملہ عورتوں کے سینے کا ابھار اہر تہذیب کے آثار میں ملتا ہے۔ معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں نے معاشرتی اخلاق کا دائرہ کار بھی بدل دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار بھی گراوٹ کا شکار ہوئیں، مگر عورت کے بارے میں ہماری اخلاقیات جوں کی توں رہی مغربی مفکرین نے اختیار اور انتخاب پر زور دیا جبکہ ہندوستانی اخلاقیات میں فکر کا محور و مرکز فرد اور اجتماع کی بجائے معاشرتی ڈھانچہ ہے جس میں معاشرہ اپنی سماجی اور معاشرتی برائیوں کو دیکھ کر اخلاقی اصول طے کرتا ہے۔ دوسری طرف قبائلی علاقوں کی اخلاقیات مختلف ہے جس میں مرد جنگ میں بہادری کا مظاہرہ کر کے عزت حاصل کرتا تھا تو اس عورت کو اس نے دیوی کا درجہ دے دیا جو بچے کی پیدائش کے دوران موت کا شکار ہو جاتی تھی۔ طاقت ور حملہ آوروں اور توسیع پسندوں کو اخلاقیات کا موجد کہا جاتا ہے۔ اکثر مرد اپنی عورتوں کو قتل نہیں کرنا چاہتے مگر برداری کی رائے زنی، بدنامی اور سماجی دباؤ انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عورت کے بارے میں قائم خود ساختہ اخلاقیات کو بدلنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہر خواہش کو مار کر ہمیشہ قربانی عورت ہی دیتی ہے۔ قدیم اور جدید اخلاقیات میں صرف اتنا فرق ہے کہ عورت پہلے سے زیادہ با اختیار اور باشعور ہے جو نچلے درجے کی اخلاقیات کو ماننے سے عاری ہے کیوں کہ اخلاق عریانی اور جنسیت کے خلاف ہے ادب اور اخلاق کی بحث دراصل جنس کی بحث ہے جو دو متضاد چیزیں ہیں جنس اخلاق کی دشمن ہے۔ بے راہ روی اور بد اخلاقی ذہنی بگاڑ کا باعث بنتی ہیں۔ لوگ جنسی اعضاء اور جنسی تعلقات کے بارے میں صاف اور واضح خیالات رکھنے سے روکتے ہیں۔ اصل میں جنس کی معلومات نہ ہونا ہی بد اخلاقی کی سب سے بڑی وجہ ہے جنسوں کے احترام کی

عدم موجودگی ہی فحاشی کو تشکیل دیتی ہے۔ اخلاق سے مراد کسی شے کی تکمیل یا اس کی تکمیل میں معاون ثابت ہونا ہے جس کے لیے اس چیز نے جنم لیا ہے جنسی جذبے کا اعلیٰ مظاہرہ عشق ہے اور عشق کی تکمیل مرد اور عورت کا جذباتی، جسمانی اور روحانی ملاپ ہے۔ اس کا مقصد افزائش نسل ہی نہیں بلکہ شخصیت کی تکمیل بھی ہے۔ فحاشی جنس کو پوشیدہ طور پر پیش کرنے میں مظہر ہے حقارت پوشیدگی، خوف اور گناہ کو اس سے وابستہ کرتی ہے۔ فرسودہ رسم ورواج کی وجہ سے شادی جیسا اہم ادارہ برباد ہو گیا۔ متعلقہ جوڑے کی رائے کو اہمیت دینے کی بجائے غیر متعلقہ لوگ ان کی شادی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہر حکم کی پابندی صرف عورت پر ہی لاگو کی جاتی ہے۔ دولت مند مرد چار شادیاں کر سکتا ہے۔ بچوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں جو ان کی ہر بات پر اطاعت گزاری کریں۔ جدید ٹیکنالوجی نے جدید کلچر سے روشناس کروایا۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کی مدد سے لڑکا لڑکی کے تعلقات آسانی سے فراہم ہونے لگے۔ اس عمل کو باپ اور بھائیوں نے اپنے لیے حلال اور عورتوں کے لیے حرام قرار دیا۔ عزت وعصمت، شرم وحیا کا تعلق بھی صرف عورت کی حد تک محدود رہ گیا۔ بچوں کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری عورت کے سر پر ڈال دی جاتی ہے۔ مذہب کے نام پر عورت کے لیے شرافت کا معیار مقرر کیا گیا۔ عورت اور مرد کی سیکس کا تعلق فرد کی نفسیات اور اجتماعی اخلاقیات سے بہت گہرا ہے۔ ہم نے سیکس کو فحش گالی بنا دیا۔ بچوں عمر کے لحاظ سے خود فیصلہ کرنے کی تربیت دینے کی بجائے ان پر فیصلے تھوپ دیئے جاتے ہیں۔ مردوں کی جنسی خواہش کا قانون ہر طرف دکھائی دیتا ہے جبکہ عورتوں کے لیے کڑے ضابطے لاگو کیے جاتے ہیں۔ اور تو اور تعلیم کو بھی جنسی خانوں میں تقسیم کر کے معاشرتی گھٹن کو ہوا دی گئی۔ اس لیے سیمون دی بووا کے مطابق مردوں اور عورتوں کی صفات بھی متضاد متعین کی گئی ہیں مرد بہادر ہے تو عورت بزدل۔ اس لیے انہوں نے ان اخلاقیات کو غیر واضح قرار دی۔ اخلاقی اقدار بدلتی رہتی ہیں اور نئی اخلاقی اقدار کی مخالفت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اخلاقیات کے معاملے میں لبرل پالیسی پر عمل کرنے میں ہی ہماری نجات ہے۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں نئی اخلاقیات کے معیار کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

شہر بانو کی والدہ نے اپنی سمدھن نور محل کے بیمار ہونے پر اپنی بیٹی کو لودھیانہ بھیج دیا۔ آپ بیتی کے آخر میں شہر بانو اپنی زندگی سے گلہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "مجھ جیسے بدنصیب نے دیکھے کیا سنے بھی نہوں گے۔ اب آپ خیال کریں کہ روز پیدائش سے لوگوں کو مجھ سے حسد شروع ہوا۔ غدر میں کیسی مصیبت اٹھائی 'ساس کی کیسی کیسی سختیاں برداشت سہیں 'سسرال والوں نے کیا کیا بدسلوکیاں کیں 'خاوند نے یوں برباد کیا 'اولاد سے یہ پھل ملا کہ ایک بھی زندہ نہ بچا۔ ایک ماں تھی 'سو اس نے یہ کیا کہ خون کی پیاسی ہوگئی۔ اگر چھری کو پائیں تو مجھ کو نہ پائیں۔ سو بوا' میرے ساتھ تو کسی نے بھی بھلائی نہ کی۔"[۶۳]

مرزا ایوب بیگ نے پرانی رفاقت کا لحاظ کرتے ہوئے شہر بانو کا بہت ساتھ دیا اس نے شہر بانو کے شوہر کا مرنے کے بعد چار ہزار کے قرضے کو اترنے کا بندوبست کیا اگر ایسا نہ ہوتا تو شہر بانو کو بھیک مانگنی پڑتی۔ جس کے احسان کو شہر بانو خود بھی مانتی ہے اور عزت کے ساتھ گھر بیٹھنے کا سہرا اس شخص کو قرار دیتی ہے جس کی ایمانت داری کی وجہ شوہر کا کارخانہ اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہا۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کے والد ان کو مشنری سکول میں بھیجتے تھے جس پر لوگوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ ان کے والد کے خیال میں لوگ ہر نئی چیز پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کو جاہلوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی بات کو سچ ثابت کرتے ہوئے بیگم شائستہ اکرام اللہ لکھتی ہیں:

۱۹۲۷ء میں میرا اسکول جانا بری نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ۱۹۴۷ء میں ہر اچھے خاندان کی لڑکی اسکول جاری ہے۔"(۶۴)

قرۃ العین حیدر ماضی اور حال کی عورت کا موازنہ کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ایک وہ وقت تھا جب صرف ایک ہی زنانہ اسکول تھا۔ لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں ٹرافیاں جیتتی تھی سیاہ برقعے پہن کر یونی ورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ ماڈرن مصوری اور شاعری کرتی تھیں مگر آج کی لڑکیوں کے پاس افسانہ نگاری کے لیے وقت نہیں ہے وہ خود کو عدالت، کچہری اور ملازمت میں کھو بیٹھی ہیں۔ یہ دور طبقات اور انسانی رشتوں داریوں کے بدلتے ہوئے گراف کا دور ہے۔ عصمت چغتائی نے ہٹلر کے کارناموں کے بارے میں ایک فلم دیکھی لاکھوں گلی سڑی لاشیں دیکھ کر ان کا ضمیر کھٹکنے لگا۔ ویت میں بارہ سال سے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ سب کہاں ہیں کوئی روکتا کیوں نہیں؟ انکے مطابق مساوات کا فقدان امیر غریب کے مقابلے میں مرد عورت میں زیادہ ہے۔ وہ لکھتی ہیں میرے اردگرد ایک دھوکہ رچا ہوا تھا۔ بظاہر شرمیلی اور باعزت بیٹیاں چھپ کر غسل خانوں اور اندھیرے کونوں میں رشتے کے نوجوانوں سے ملتی ہیں۔

ادا جعفری عورت کی زندگی کے بارے میں کہتی ہے کہ وہ ایک ہی مہلت حیات میں کئی جیون برداشت جھیلتی ہے قلم ہاتھ میں پکڑلے تو یہ دکھ مزید بڑھ جاتے ہیں زندگی کے آداب اور خود سے متعارف ہونے کے راستے کہیں اور نکلتے ہیں۔ ایک ادبی محفل "سلسلہ" نے لفظ کو جیتا جاگتا دکھایا۔ اولڈ ہاؤس میں بوڑھے والدین کو دیکھ کر ادا جعفری نے کہا یہ اولڈ ہاؤس آنے والے چند سالوں میں پاکستان کے اندر بھی ماڈرن اخلاقیات کے روپ میں نمودار ہوں گئے جو تجارتی بنیادوں پر رشتوں کے فرائض سرانجام دیں گی۔ جس کی عملی صورت آج کل پاکستان کے ہر بڑے شہروں میں نظر آتی ہے۔ ساس کو سیدانی بی کی طرح اپنی بہو کی غلطیوں کو معاف کرنے کی اخلاقیات اپنانی ہوگی تاکہ کوٹھوں کی زینت میں کمی واقع ہو۔

سعیدہ بانو احمد کے دور میں مردوں کی الگ معاشرت تھی اس دور میں کنواری لڑکیاں نہ تو سرخ رنگ پہن سکتی تھیں نہ پیروں میں مہندی لگا سکتی تھیں اور نہ ہی ناک میں کیل پہنے کی اجازت تھی۔ پردہ عورت کی نظریاتی ،روحانی اور اخلاقی بقا کی علامت تھا دولہا دلہن کے لباس کو اس طرح سلائی کیا جاتا تھا کہ اس پر قینچی نہ لگے اس سے یہ شگون تھا کہ دونوں ہم سفر شیر و شکر بن کر رہیں اور قینچی کی کاٹ سے محفوظ رہیں۔

پہلے کوئی عورت اکیلی سفر نہیں کر سکتی تھی مگر ساجدہ زیدی نے اپنے شوہر کی اجازت سے مختلف ممالک کے اسفار کیے۔ ایم فل کرنے لندن گئی۔ جدید سائنسی ترقی میں موبائل فونز اور سوشل میڈیا کے ذریعہ فاصلے سمٹ گئے ہیں دنیا ایک عالمگیر گاؤں کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ جہاں پر کسی ملک میں بھی کوئی لڑکا لڑکے آپس میں دوستی اور شادی کر سکتے ہیں۔ بہت کم معاشرتی پابندیاں آڑے آتی ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک میں مرد اور عورت آپس میں دوستی کرتے ہیں لیکن ان کا معیار ہر جگہ مختلف ہے۔ باہر کے ممالک میں ہونے والی مرد اور عورت کی دوستی کو انہوں پسند کیا اور اسے وقت کا تقاضا کہا جو برصغیر جیسے تیسری دنیا کے ملک میں اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ یہاں کے مردوں کا خیال ہے کہ مرد عورت کی دوستی ہو نہیں سکتی۔ ان کا رومانوی جذبہ اور جنسی کشش مرد کی بالا دستی میں بدل جاتی ہے۔ ساجدہ زیدی اپنی آپ بیتی "نوائے زندگی" میں اپنے بارے میں لکھتی ہیں: "میرے بیشتر دوست یونی ورسٹی کے مرد رہے ہیں۔ لیکن وہ علی گڑھ کی رہائشی یونی ورسٹی ماحول کے آزاد خیال مردوں کا مخصوص طبقہ تھا۔"(۶۴)

صالحہ عابد حسین نے اپنے شوہر کی سابقہ بیوی سے بھی اپنا سلسلہ محبت استوار رکھا۔ وہ اپنے گھر میں خود مریضہ ہونے کے باوجود بیماروں کی تیمارداری کرتی اور بیسوں مہمانوں کی مہمان نوازی کرتی تھی۔ مصنفہ نے نہ صرف اپنے سسرال، میکے، دوستوں اور جامعہ کی عورتوں میں اپنے اخلاق، ملنساری اور ہمدردی کی وجہ اپنی وضع داری کا سکہ بٹھا دیا۔ وہ ضرورت مند لوگوں کی مدد بھی کرتی تھی۔ انیس قدوائی سے ان کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی ہم آہنگی تھی۔ صالحہ عابد حسین نے ایک جرمن ڈاکٹر کا ذکر کیا جو کینسر کی مریضہ ہونے کے باوجود خوش مزاج تھی۔

سوتیلے بھائی (شوکت بھائی) کے گھر حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی ملاقات اختر سے ہوئی اور انہوں نے چوری چھپے رسالہ "نگار" کی فرمائش کی جس میں اختر حسین رائے پوری کا افسانہ چھپا تھا اختر نے کہا: "آپ کی ہمت اور جسارت کی داد طلب تھی ورنہ ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی کسی غیر مرد سے بات کرے اور کوئی شے مانگے۔"(۶۵)

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی بہادری، نڈرپن جسارت اور دھن کی پکی ہونے کا اعتراف پروفیسر پرویز پروازی نے بھی اپنی کتاب "پس نوشت اور پس پس نوشت" کیا ہے۔ ان کے مطابق حمیدہ اختر حسین رائے پوری

غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھی پنڈت لال جواہر نہرو کے پاس اختر کے پاس پورٹ کے لیے گئی۔ پھر ایک فرم میں اپنے شوہر کی جگہ انٹرویو دینے چلی گئی۔ اختر حسین رائے پوری کے ماضی کا راز سروجنی نائیڈو سے سن کر بھی راز فاش نہ کیا جب کے عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ اس آپ بیتی میں حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے مشرقی لب ولہجہ اپنایا۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے ایک باوفا پتی ورتا کا تصور پیش کیا لندن میں سفر کے دوران ان کے بیٹے کامران کی طبیعت خراب ہوگئی تو انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ بیٹے کو واپس ہندوستان لے جائیں گی تا کہ ان کے شوہر کے دماغ پر کوئی فکر و پریشانی نہ رہے۔

حمیدہ سالم نے اپنی آپ بیتی میں مختلف اسفار کی روداد لکھی ہے جن میں خرطوم، امریکہ، لندن، افریقہ، بینک کاک، جاپان، پیرس، جنیوا، اٹلی، سپین، سوڈان، آئرلینڈ اور سعودی عرب شامل ہیں۔ دوران عمرہ ایک بوڑھی عورت غلطی سے مردوں کی صف میں جا کر کھڑی ہوگئی تو پولیس نے ڈنڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ سوڈان کی تہذیب و ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایک دور میں وہاں پر کم عمر لڑکیاں کے ختنوں کا رواج تھا جس کا وہ اب ذکر سننا بھی پسند نہ کریں۔ کم عمری میں ہی لڑکیوں کے عضو نہاں پر ٹانکے لگا دیئے جاتے تھے اور شادی کے بعد کھول دیئے جاتے تھے جو اس کی عصمت، پاک دامنی اور اعلیٰ خاندان سے تعلق ہونے کی دلیل سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں سوڈانی لڑکے شادی کے بعد گھر کے تمام انتظامات خود کرتے تھے برصغیر میں جہیز کی وجہ سے ہی لڑکیوں کے والدین ان کی پیدائش پر روتے ہیں جبکہ وہاں جہیز کا کوئی رواج نہیں۔ لڑکیوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے جنہوں نے اپنے مقدور والدین کی وجہ سے شادیاں نہیں کیں وہاں اخبار میں ایسے رضاکاروں کی ضرورت کا اشتہار دیا جاتا تھا کہ ان لڑکیوں کو چند گھنٹوں کی فرصت دینے کے لیے ہفتے میں ایک دن وقت دیں تا کہ وہ بھی کچھ وقت آرام کر سکیں۔ سوڈان میں دلہن سر سے پاؤں تک ٹوپ سے خود کو چھپا کر شادی والے دن شہوت انگیز رقص کرتی ہے ایک سوڈانی لڑکے نے پسند کی شادی کی اور باہر کے ملک چلا گیا واپس آیا تو کسی قبائلی جھگڑے میں مارا گیا۔ سوڈانی رسم و رواج کے مطابق اس کے بیوی بچوں کو دیوار کی ملکیت میں دے دیا گیا۔ اس میں لڑکی کی رضا کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ صدیوں کی رسمیں توڑنے کی سزا موت تھی اور ایسے معاملے کو قبیلے کی عزت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا۔

مشرقی اور مغربی جنسی اخلاقیات کی بات کرتے ہوئے حمیدہ سالم لکھتی ہیں کہ مغرب میں جنسی آزادی ہے یہ فطری تقاضا ہے جس پر روک ٹوک کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن وہاں پر لڑکے اور لڑکیوں کے الگ الگ معیار قائم نہیں کیے جاتے۔ یہ نہیں کہ لڑکا جو چاہے وہ کرے اور لڑکی کو اس کی نادانی کی سزا ملے۔ وہاں پر کنواری

مائیں اپنے بچوں کا گلہ گھونٹ کر نالیوں میں نہیں پھنکتیں بلکہ حکومت ان بچوں کی پرورش کے لیے مراعات دیتی ہے۔ مشرقی اور مغربی تہذیبی اخلاقیات کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہوئے ان کی اخلاقی اقدار میں فرق واضح کرتی ہیں۔ مشرق میں حمل گرانے کی ادویات صحت پر بڑے اثرات ڈالتی ہیں تو مغرب میں ایڈز کی بیماری عام ہو رہی ہے۔ ان کے ہاں بوائے فرینڈ گرل فرینڈ کا تصور عام ہے ایک عمر تک لڑکا لڑکی کے بوائے فرینڈ نہ ہوں تو نارمل نہیں سمجھا جاتا یہی خیال لڑکوں کے بارے میں عام ہے مگر وہاں پر لفنگے پن کے بھی معیار مقرر کیے گئے ہیں شراب پی کر ہوش و حواس کھو دینے والے کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مغربی عورت کی زندگی بہت مشقت طلب ہے وہ لکھتی ہیں: "اول سے لے کر آخر تک، اندر اور باہر کے سارے کام ان کی ذمہ داری ہوتے ہیں۔"(۲۲)

نوکر وہاں پر چوبیس گھنٹوں دستیاب نہیں ہوتے۔ شوہر خیال کرنے والا ہو تو گھر کے کام کاج میں بیوی کی مدد کر سکتا ہے۔ مصنفہ کے خیال میں خود پر قابو اور کردار کی تربیت نہایت ضروری ہے۔ شہری اور دیہاتی اخلاقیات کو بیان کرتے ہوئے نفیس بانو شمع لکھتی ہیں کہ گاؤں کے لوگ پہلی رات اپنی مردانگی کا رعب نہیں جماتے جبکہ شہروں میں اپنی مردانگی کو ظاہر کروانے کے لیے دلہن کی اگر جان کو خطرہ بھی ہو تو ان کو اس چیز کی کوئی پروا نہیں۔

اپنے علاقے کی اخلاقیات کو بیان کرتے ہوئے نثار عزیز بٹ لکھتی ہیں کہ قبائل اور پونده کی عورتیں نہ برقع پہنتی ہیں اور نہ ہی نقاب اوڑھتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور نثار عزیز بٹ کے قریبی مراسم تھے قرۃ العین حیدر نے نثار عزیز بٹ کو اپنا ناول "آگ کا دریا" کی ایک کاپی دی جس پر لکھا تھا To Nisar who will understand جب آگ کا دریا پر کڑی تنقیدی ہوئی تو نہایت غصے کے عالم میں قرۃ العین حیدر نے نثار عزیز بٹ سے وہ کاپی وزارت اطلاع میں بھجوانے کے لیے واپس لے لی۔ نثار کو اس بات کا بہت قلق ہوا اس نے قرۃ العین حیدر سے اس بات کا تذکرہ کیا تو اس نے بدلے میں "گردش رنگ چمن" کی ایک جلد نثار عزیز بٹ کے نام کر دی۔

افضل توصیف نے ایسی اخلاق اقدار کی بات کی جب بیوی اپنے شوہر سے بات کرتے ہوئے بھی پردہ کرتی تھی مگر وہ ان اخلاقی اقدار میں زندہ رہنا نہیں چاہتی جن میں صنفی اور جنسی تفریق کو مد نظر رکھا جائے۔ اس لیے وہ ایسے جنم کی آرزو مند ہے جس میں دائی کو بیٹی کی پیدائش پر اعتراض نہ ہو۔ مائی کاکی جیسی شفیق ماں پچیس سال کی عمر میں نہ مارے، جہاں پر کوئی کتابوں سے کھیلتی لڑکی سے یہ نہ کہے کہ اس کی شادی کب کرنی ہے؟

تہذیبی لحاظ سے گھریلو اور طوائف عورت نے بھی ارتقائی منزلیں طے کیں جن میں ابتدائی حرم سرا سے ہوئی جس میں جنگ کے اندر غلام بننے والی عورتوں کو محل سرا میں بند کر کے رکھا جاتا تھا اس کے بعد طوائف بنی کا دور تھا جب گھریلو عورت سے زیادہ طوائف کو اہمیت دی گئی جس کا آغاز یونان سے ہوتا ہوا برصغیر میں آتا ہے جہاں

پر معاشرے کے شریفاء اور تمام طبقات کے مرد اپنی جنسی ہوس کو پورا کرتے تھے مگر اس سے گھریلو عورتیں محرم رشتے اور نو عمر بچیاں محفوظ تھیں مگر طوائف بنی کے زوال کے بعد یہ کردار سوشل میڈیا اور موبائل فون کے ذریعہ ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ جس میں لبرل ازم کے فریب میں ہمارے خاندان کی باحیا عورتیں رکھیل کا کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں جن میں معاشرتی کالونیوں میں فلیٹ بنتے نظر آتے ہیں جن کا تعلق عارضی جنسی تعلقات کے رشتوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جن کا واضح اشارہ افضل توصیف نے انٹی فیمنسٹ ہونے کی صورت میں دیا ہے۔ ان کے خیال میں شہر کی ستر فی صد خواتین رکھیل کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ جن سے بچوں اور خاندانی نظام کا استحصال ہو رہا ہے۔ ایسی جدیدیت کی مد میں پیدا ہونے والی گھمبیر صورت الحال کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

"یہ نئی کالونی فلیٹوں کی ہے اور یہاں ۷۰٪ فلیٹوں میں معززین کی رکھلیں رہتی ہیں ان سیٹھوں کی بیویوں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے اور مجبوری بھی ہے کسی کو پتا نہیں ہوتا۔۔۔۔یا صرف ایک رات کی ہے کیوں کہ رکھیل رکھنے کا رواج عام ہے۔"(۶۷)

وہ اس کا بھی انکشاف کرتی ہیں کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں ماڈرن لوگ بیویاں بھی بدلتے ہیں۔ یا مستقل طور پر طلاق دے کر یا پھر اپنی من پسند عورت سے نکاح کر کے ایک رات بعد تعلق توڑ دیتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں فیشن کرنے اور چھوٹی شرٹ پہنے سے کوئی فیمنسٹ نہیں بن جاتا اس کے لیے فیمنزم کی سوچ کا حامل ہونا ضروری ہے۔

ش۔ فرخ نے ایک سانولے لڑکے سے دوستی کا ذکر کیا جو اپنے گھر اپنی فیملی سے ملوانے لے گیا جہاں پر دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ ایک دن فلم دیکھنے گئی تو وہاں پر ایک لڑکی کی طبیعت خراب ہوگئی سب کچھ چھوڑ کر اس لڑکی کو پانی پلایا۔ اس وقت تک لڑکی کی تیمارداری کی جب تک ڈاکٹر نہ آگیا اور اسے اسپتال نہیں پہنچا دیا گیا۔ اس لڑکی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ لائل پور کالج میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی دو لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ مذہبی خاندان مخلوط تعلیم کے خلاف تھا۔ ان لڑکیوں کے والدین نے یہ شرط رکھی اگر وہ ہوسٹل میں مصنفہ کے ساتھ رہیں اور ان کے ساتھ ہی کالج جائیں تب داخلہ لے کر دیں گئے۔ یہ ہی شرط کانویشن تک برقرار رہی۔ مصنفہ خود اپنڈیکس کے درد کے باوجود خود ڈرائیونگ کر کے اسپتال گئی اور ایک دوست کے مالی تعاون سے آپریشن کروایا۔ دفتر والوں نے ش۔ فرخ کو تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر دیا ان کے والد محترم نے نہ صرف ان کی تخلیقات کو سراہا بلکہ انہوں انٹر کلاس کا ٹکٹ بھی لے کر دیا۔ اعتراف جرم آپ کو بعض اوقات ملامت سے بچتا ہی نہیں بلکہ ضمیر کی عدالت میں بھی سرخرو بھی کرتا ہے۔ مصنفہ کے قارئین میں ایک پاک بحریہ کا نوجوان بھی تھا جس کے چہرے پر بے پناہ پریشانی تھی وہ خودکشی

کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہ سوتیلی ماں کو واش روم کے سوراخ سے دیکھتا تھا۔ بڑے ہو کر اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بری حرکت کرتا تھا۔ احساس ندامت نے اسے خودکشی نہیں کرنے دی ہو گی۔ جب مصنفہ نے استعفی دیا تو کشور ناہید نے ان کی ملازمت کو بحال کرنے کی پوری تگ و دو کی۔

صغرا مہدی کے دوستوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تھے جن میں احمد شکیل اور اقبال شامل ہیں۔ انہوں نے بہت سے اسفار تنہا کیے جن میں گنگا، جمنا اور بارنا ہیں یہاں پر ایک نئی اخلاقی قدر نظر آتی ہے وہ یہ کہ اب ہر لڑکی کا ایک بوائے فرینڈ ہے۔ آپ بیتی کے لحاظ سے ہمارے معاشرے کی اخلاقیات کو بیان کرتے ہوئے عطیہ داؤد لکھتی ہیں کہ معاشرتی اخلاقیات کی پابند عورت ہی ہے مرد ان پابندیوں سے آزاد ہے مرد کے لیے عشق کا تذکرہ ایک مصالحہ ہے جس سے قاری اور دوسری ادیب محظوظ ہوتے ہیں مگر عورت کے لیے یہ ہی تذکرہ بدنامی کا باعث بنتا ہے۔ اپنے علاقے میں لڑکیوں کے رشتے طے کرنے کی اخلاقیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ لڑکی کا رشتہ ادلے بدلے میں ہی ہوتا جس کے نتیجے میں بھائی کا رشتہ ہوتا اگر بھائی نہ ہو تو چچا یا ماموں وہاں سے ضرور شادی کرتا۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کے بدلے میں رقم وصول کی جاتی۔ لیکن رقم وصول کرنا اچھی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وٹے سٹے میں اگر ایک لڑکی کو اس کا شوہر یا ساس مارتی تو اس کے بدلے میں ان کی لڑکی کو بھی مارا جاتا تاکہ ان کو دوسروں کی بیٹی کے دکھ کا احساس ہو۔ عورتوں کے اکیلے سفر کرنے پر پابندی تھی ان کے ساتھ ایک مرد یا لڑکے کا ہونا ضروری تھا اگر چار پانچ عورتیں اکیلی جاتیں تو ایسے معیوب سمجھا جاتا۔ اس روایت نے عطیہ داؤد کے اندر نفرت پیدا کر دی کہ ایک لڑکا ساتھ اس لیے سفر کرے کہ وہ مرد ہونے کی وجہ سے برتر ہے چاہے وہ عقل اور عہدے میں ایک لڑکی سے کم تر ہی کیوں نہ ہو۔ عطیہ داؤد نے ایسی روایتی اخلاقیات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہتی ہے کہ وہ تنگ نظر اور نام نہاد اصولوں پر آنکھیں بند کر کے نہیں چل سکتی اس لیے وہ ان کے لیے بری بن گئی۔ گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلے۔ اگر جائے بھی تو ایک اس کا نگہبان ہو جو اس کی شرافت کا گواہ ہو اور اسے گناہ سے بچالے مگر اسے ایسے نگہبان کی ضرورت نہیں ہے کسی کو گواہ بنا کر اپنی شرافت کا ثابت نہیں دے سکتی۔ جب عطیہ داؤد کے دوست کا انتقال ہوا تو ان کے حمل ٹھہر جانے کی وجہ سے ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرنے کی اجازت دی جبکہ ان کے دوستوں نے ایسا کرنے منع کیا۔

کشور ناہید طنزیہ لہجہ اپناتے ہوئے کہتی ہیں کہ اخلاق کی ساری ضرورت صرف عورت کو ہے ٹی۔ وی پر عورت کام کرے تو بدکردار، مرد خواہ صدائیں لگائے آبرومند کہلائے، مرد بے اطلاع دعوتوں میں جائے اور عورت بتا کر دفتر کی دعوت میں بھی نہیں جاسکتی۔ مرد کا گھر سے باہر رہنا آزادی اور عورت کا باہر جانا عیاشی۔ مغرب میں

مردوں کے ان ہی رویوں کے باعث عورتیں لزوبین ہونا پسند کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے کتا بھی رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ہر مرد ان کی خفیہ عادت کا راز دار بننا چاہتا تھا۔ مصنفہ کو ان کے ساتھ رات گزرنے کا تجربہ ہوا۔ لڑکی کو دیکھ کر اس کے عشق میں گرفتار ہونا عام سی بات ہے بیوی جائے پہاڑ میں وہ تو اب کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مشرقی مرد ہر عشق میں شادی کا معاملہ ضرور رکھتا ہے، اور حق مہر تک طے کرلیتا ہے۔ حق مہر ناکافی ہونے کی صورت میں اسی عورت کو بہن کہا دیتا ہے۔ ایسے مرد ماؤں کے ہی ہوتے ہیں۔ محبوبوں اور بیوی میں اپنی ماں تلاش کرتے ہیں۔ متضاد ردعمل کی وجہ سے کشور ناہید نے نئی اخلاقیات مرتب دی۔ نیا گھر، مطالعہ کا روم، مصنفہ تنہائی پسند تھیں۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ناکام بھی رہی۔ پانچویں جماعت میں فیل ہوئی، یونی ورسٹی کے دو کورسز کی دوبارہ تیاری کی۔ دفتر میں ناکامی کا سامنا منہ سے کسی چمچہ گیری نہ کرنے کی وجہ سے کرنا پڑا۔ کچھ لوگوں نے عورت کے دفتر کی سربراہ بننے پر اعتراض کیا اور کہا اچھی بیویاں گھر سے باہر نہیں نکالتی ہیں۔ میاں بیوی میں دوستی تو ہوتی ہی نہیں۔ پھر یہ خیالات پائے تکمیل پاتے ہیں کہ عورت کو کہاں کہاں مارا جانا شریعت میں جائز ہے؟ اس کے بعد مصنفہ ہم جنسیت کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ عالمی موضوع ہے جس کی اسلامی ممالک میں زیادتی کے کیسز بنا کر سزا دی جاتی ہے تو مغربی ممالک میں یہ عمل باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ وہ طنزیہ انداز میں بیان کرتی ہیں کہ ہمارے معاشرے میں شرعی پردے کی طرح یہ گناہ بھی چھپ کر ہوتے ہیں۔ کشور ناہید کے مطابق بیوہ کی لاچاری اور بے بسی صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہے بیوہ کی دوسری شادی کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا جاتا ہے اس کو نئے کپڑے پہنے اور ہار سنگھار کرنے سے روکا جاتا ہے اور تو اور اس کو شوہر کی جائیداد سے محروم رکھا جاتا ہے۔ لوگوں کے اس رویے کو وہ عالمی اخلاقیات کے طور پر متعارف کرواتی ہیں کہ برصغیر میں پہلے بیوہ کو ستی کا نام دے کر جلا دیا جاتا تھا اب قانونی طور پر پابندی لگادی گئی ہے اس کے باوجود آج کل ان کو ایک الگ شہر میں رکھا جاتا ہے جہاں پر ان کے بال مونڈ دیئے جاتے ہیں۔

۱۹۷۱ء کی جنگ نے انیس ہارون کو ایک پاکستانی ہونے کے ناطے احساس شرمندگی، پشیمانی اور بے بسی میں مبتلا کر دیا۔ انیس ہارون کو ڈاکٹر سعید کے توسط سے ایک خاتون ملی جو لٹی پٹی بنگلہ دیش سے آئی تھی اس کا ایک دس بارہ سال کا بیٹا تھا اور شوہر لاپتہ تھا وہ قتل کر دیئے گئے تھے مگر اس کی بیوی اسماء یقین کرنے کو تیار نہ تھی کسی بزرگ نے بتایا کہ وہ زندہ ہیں سالوں نذرانہ لینے کے بعد کہا وہ وفات پا گئے ہیں۔ وہ خوب روئی اور ہاتھوں کی چوڑیاں توڑیں عدت کاٹی یہ پیر صاحبان بھی انسانی جذبات سے کس طرح کھیلتے ہیں۔ ایرانی وفد میں ایک صاحب ستائش تھے۔ وہ ہر وقت یہ جملہ دہراتے تھے کسی کو سیدھے راستے سے گم ہوتے نہیں دیکھا لیکن خود اس بات پر عمل نہیں کرتے۔ اس وفود

میں نوجوان اکیلی لڑکی انیس ہارون تھی۔ان پر زیادہ ہی نظر عنایت تھی۔ایک دوروز قیام کے بعد آدھی رات ان کے فون کی گھنٹی بجی فون اٹھایا تودوسری طرف ستائش صاحب تھے کہنے لگے کیا آپ کافی پیئیں گی ان کو نیند نہیں آرہی۔مصنفہ نے معذرت کرلی اگلے دن رات کو پھر فون آیااور سر درد کی دوامانگی مصنفہ نے دوائی بیل بوائے کے ہاتھ بھجوادی۔تیسرے دن فون کرکے کہاان کے دل میں بہت تکلیف ہورہی ہے کیاوہ آسکتی ہیں؟مصنفہ نے اثبات میں جواب دے کر فون بند کر دیااور ساتھ ہی ریسپشن پر فون کیا کہ فلاں کمرے میں مندوب کو دل کادورہ پڑاہے فورا ڈاکٹر کو بھیجوادیں اگلے دن وہ صاحب نظریں ملانے کے قابل نہ رہے۔ضیاالحق کے دور میں ہر لڑکالڑکی سے نکاح نامہ پوچھاجاتاتھااور نہ حوالات کی ہوا کھانی پڑتی تھی۔ایک رات مصنفہ اور ان کے شوہر کو بھی روک لیااور پوچھایہ خاتون کون ہے؟ان کے شوہر نے جواب دیامیری بیوی۔نکاح نامے کاپوچھاتوانہوں نے غصے میں کہاکیاہم ساتھ لیے پھررہے ہیں؟کہااچھاجایئے مگر نکاح نامہ ساتھ رکھیے شہر میں بہت بداخلاقی ہورہی ہے۔۔۔۔۔زیادہ سختی کاماحول معاشرتی گھٹن کوہوادیتاہے۔آج کی عورت کاتعلق گھر کی چاردیواری تک محدود نہیں بلکہ باہر کی دنیاسے بھی ہے کم عمری کی شادی کارجحان کسی حدتک کم ضرورہواہے مگر حقوق اداکرنے کی توقع اب بھی صرف عورت سے ہی کی جاتی ہے

حوالہ جات

۱۔ فریڈرک اینگلز، خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۳۲

۲۔ زبیر رانا، قتل کیوں ہوتے ہیں، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۶

۳۔ سبط حسن پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہء دانیال، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۴

۴۔ طاہر ایس خان، عزت کے نام پر، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹، ص ۶

۵۔ سیمون دی بووا، عورت، ترجمہ یاسر خالد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۵۳۷

۶۔ قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۸۹

۷۔ عطیہ داؤد، آئینے کے سامنے، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء، ص ۵۶

۸۔ افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴۲

۹۔ انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، پاکستان اسٹڈی سنٹیر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۵۲

۱۰۔ ایضا، ص ۱۹۲

۱۱۔ مولانا اشرف علی تھانوی مترجم، القران، سورہ اعراف، آیت نمبر ۲، ص ۲۴۲۔

۱۲۔ امام بخاری، بخاری شریف، جلد نمبر ۲، ص ۷۰۴، حدیث نمبر ۳۴۸۴

۱۳۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ القرآن، سورہ نور، آیت نمبر ۳۰، ص ۵۶۳۔

۱۴۔ مولانا اشرف علی تھانوی مترجم، سورہ نور، آیت نمبر ۳۱، ص ۵۶۴۔

۱۵۔ ایضا، ص ۵۶۴۔

۱۶۔ مولانا اشرف علی تھانوی مترجم، القرآن، سورہ النساء، آیت نمبر ۲۱، ص ۱۲۷، ۱۲۶۔

۱۷۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، فلسفہ عمرانیات، سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۲۶۷

۱۸۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۶۶

۱۹۔ Leela Mullati,The Bhakti Movement and status of women, Abhinr Publication 1989, Page2.

۲۰۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیر ہن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸

۲۱۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹

۲۲۔ صالحہ عابد حسین، سلسہ روز و شب، نئ کتاب پبلشرز، نئ دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷

۲۳۔ نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، ص ۳۴۱

۲۴۔ زاہدحنا، زندگی کا زنداں، تخلیق کار، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴
۲۵۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، قدسیہ اسلامک پریس، لاہور۔ ۲۰۰۶ء، ص ۵۸
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۰۳
۲۷۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، ص ۱۰۵
۲۸۔ ایضاً، ص ۴۶۱
۲۹۔ ایضاً، ص ۴۶۱
۳۰۔ نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، آبشار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۶
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۷
۳۲۔ ایضاً ص ۱۶۵
۳۳۔ قرۃ العین حیدر، کارجہاں دراز ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳۲
۳۴۔ ایضاً، ص ۹۷۷
۳۵۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ لے کر، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۸۱
۳۶۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، ص ۱۴۸
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۸۳
۳۸۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، ص ۳۵
۳۹۔ صالحہ عابد حسین، سلسلہ روز و شب، ص ۸۸
۴۰۔ ایضاً، ص ۱۵۸
۴۱۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۴۲۔ ایضاً، ص ۱۰۴
۴۳۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۱۲۱
۴۴۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہم سفر، ص ۲۳۳
۴۵۔ ایضاً، ص ۲۳۹
۴۶۔ عطیہ داؤد، آئینے کے سامنے، ص ۱۴۴
۴۷۔ ایضاً، ص انتساب
۴۸۔ حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص ۱۵۷
۴۹۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ لے کر، ص ۲۳۹

۵۰۔ زہرا دوٗدی، گرداب کی شناوری، جادواں لیزر کمپوزرسن، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۸

۵۱۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۸۱

۵۲۔ انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، ص ۴۷

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۴۔ ایضا، ص ۵۵

۵۵۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہم سفر، ص ۱۸

۵۶۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۸۱

۵۷۔ انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، ص ۸۴

۵۸۔ گیان چند جین ، ڈاکٹر ،ادب اور اخلاقیات، مشمولہ ماہ نو (چالیس سالہ مخزن)، جلد اول، ادارہ مطبوعات پاکستان ،لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۳۔

۵۹۔ شاہدہ ارشد، اخلاقیات کے پانچ نظریات، اکادمی آف لیٹر ،لاہور، س۔ن، ص ۱۱۱۔

۶۰۔ نیاز فتح پوری، ترجیحات جنسی، شہوانیات، آواز اشاعت گھر ،لاہور، س ن، ص ۳۰۱

۶۱۔ علی عباس جلال پوری، روایات تمدن قدیم، خرد افروز، جہلم ،۱۹۹۱ء، ص ۴۷

۶۲۔ شہر بانو، بیتی کہانی، ص ۱۲۸

۶۳۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ، پردے سے پارلیمنٹ تک، اوکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، س ن، ص ۲۵

۶۴۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، ص ۳۲۰

۶۵۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہم سفر، ص ۲۶

۶۶۔ حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص ۲۳۰

۶۷۔ افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، ص ۳۱۱

باب چہارم:

خواتین کی اردو آپ بیتیوں میں تانیثی شعور: سماجی کردار اور امکانات کے تناظر میں

الف۔ چادر اور چار دیواری کے روایتی تصورات:

عورت کی عزت کو محفوظ رکھنے کے لیے اسلام نے پردے کا حکم دیا جس کا پہلے حکم مردوں کو دیا گیا۔ مسلمان فرد اپنے جسم ڈھانپ کر جہاں چاہے جا سکتا ہے اسلامی ریاست میں غیر اسلامی عورتیں بھی ان قوانین کی پابندی کرتی تھیں تاکہ معاشرے میں انارکی نہ پھیلے۔ اسلام میں منھ اور ہاتھ چھوڑ کر باقی تمام چیزوں کا ستر ہے روحانی ثقافت بھی عورت سے پردے کا تقاضا کرتی ہے۔ عورت کے سر کے بال بھی نظر نہیں آنے چاہیں وہ گھر سے باہر محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ ہمارا مذہب تو سات سال کی عمر میں بہن بھائیوں کے بستر الگ کرنے کا حکم دیتا ہے اور ان کے کمرے بھی۔ ان میں والدین بھی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے یوں بچوں کو بھی اجازت کے بغیر کہیں بھی جانے کی عادت نہیں پڑتی حتی کہ والدین کے کمرے میں بھی بغیر اجازت نہیں جائیں گئے۔ پردہ اور شرم و حیا مرد و عورت دونوں کا زیور تھا مگر ہم نے اسے صرف عورتوں کی حد تک لاگو کر دیا یوں ہند اسلامی تہذیب میں پردے نے بھی مصنوعی ثقافتی انداز اپنا لیا۔ بے پردہ عورتوں کا سارا ملبہ نو آبادیاتی نظام کے تحت انگریزوں پر گرا دیا گیا ان کے مطابق انگریزی تعلیم عورتوں کو آزاد اور بے پردہ بنا رہی ہے۔ اس کی حامی خواتین شیطان کی ساتھی ہیں جن سے مسلمان خاندانوں اور گھریلو زندگی کو شاید خطرہ لاحق ہے جب کہ گھریلو زندگی کا دارومدار درجہ بندی اور خاندان کے افراد کے مقام و مرتبہ پر ہے۔ اس کو ذمہ داریوں کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ گھریلو امن و امان قائم رکھنا عورت کا کام ہے جب کہ مردوں کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اسی تقسیم کے تحت مردانگی اور نسوانیت کے خیالات جوڑ دیئے گئے مرد کا خون خار جانوروں کا شکار کرنا، جنگجو ہونا اور فتح پانا ضروری ہے اسی کے تحت شیر اور شاہین کا استعارہ استعمال کیا گیا جب کہ عورتیں یہ سب نہیں کر سکتیں لہذا سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، اکبر اور اقبال عورتوں کی نسوانیت کو قرار رکھنے کے لیے پردے اور دینی تعلیمات کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال / سوچ کو روبینہ سہگل اپنی کتاب "قوم پرستی عسکریت اور صنفی تقسیم" میں بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ”مسلمان اس قدر مہذب اور ترقی یافتہ نہ ہوں کہ ان کی تعلیم سے عورتوں کا پردہ ختم ہو جائے کیوں کہ ان کی تہذیب کا منفرد نشان یہ ہی پردہ ہے۔“[1]

یہاں تک کہ مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے پردے کو مرد کی غیرت اور مردانگی کا مسلہ بنا دیا اور بے پردگی کو مردوں کی کمزوری قرار دیا اس کا فقدان اس بات کا ثبوت ہے کہ شوہر مسلمان عورت کو پردے کے بغیر کنٹرول

نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنے گھر کو باہر کے اثرات سے بچا سکتا ہے اسی سوچ کے تحت مسلم ممالک میں زبردستی پردہ کروایا جانے لگا اور اس کو عورتوں کی عزت و عصمت کی علامت بنا دیا گیا۔ جنگ عظیم دوم اور ترکی کی ممکنہ شکست کے خاتمے نے مسلم حلقوں میں تشویش پیدا کر دی۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی خان کی والدہ نے اجلاس کے دوران برقع اتار دیا اعتراض پر کہا یہ سب مرد میرے بیٹیوں جیسے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد پہلی قانون ساز اسمبلی میں بیگم جہاں آرا اور بیگم شائستہ اکرام اللہ موجود تھیں۔ ۱۹۸۰ء میں علماء اکرام نے مذاکرات کی میز پر بیٹھنے سے انکار کر دیا کہ جب تک یہ برقع نہیں پہنتیں اور پچاس سال کی نہیں ہوتی جاتی ان سے گفتگو نہیں ہو سکتی۔ ایران ،افغانستان اور سعودی عرب جیسے انتہا پسند ملکوں کی پولیس زبردستی عورتوں کو حجاب پہنے پر مجبور کرتی ہے پردے کا زبردستی حکم لاگو کر عورت کو ایک جنسی پتلا بنا دینے اور اس کے جسم کو فحش قرار دینے کے مترادف ہے۔ اس فکر کے مطابق عورت کا نقاب کے بغیر گھر سے باہر آنا پاک باز معاشرے کے اخلاق کو خراب کر دینا ہے۔ اسے جسم کے ساتھ ساتھ چہرہ نہ چھپانے پر سزائیں دی جاتی تھیں۔ ماہر نفسیات کے مطابق پردے نے عورت کی نفسیاتی حالت کو مسخ کر دیا ہے۔ باپردہ عورت فرد سے زیادہ جنس کی نمائندگی کرتی ہے۔ ارشد محمود اپنی کتاب ”ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ“ میں پردے کے بارے میں لکھتے ہیں: ”پردے کا مطلب ہے عورت کی نکیل مرد کے ہاتھوں میں دینا تھا جیسے اونٹ کی نکیل عرب باشندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔“(۲)

شرافت ،حیا اور پردے کے خول نے ہمیں جنسی مریض بنا دیا۔ پردہ کرنے سے عورت کم اور چیز زیادہ بن جاتی ہے وہ اپنے عورت پن کو غائب کرتی ہے۔ پردے سے لڑکی دبی دبی اور احساس کم تری کا شکار زیادہ ہوتی ہے۔ جنسیضرورت کو پورا کرنے کے لیے پردہ مکار عورتیں بھی کرتی ہیں جسمانی کاروبار کرنے والی عورتیں اپنی شناخت چھپانے کے لیے پردے کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔ پرہیزگار معاشروں کی مدد سے ہی عورت کی کاروباری منڈیاں کامیاب ہو رہی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا میں پردہ ایک متنازعہ مسئلہ بن چکا ہے جس کی بنیاد پر بڑے بڑے جھگڑے جنم لیتے ہیں حقیقت میں امیر اور غریب لوگ پردہ کرتے نہیں اور متوسط طبقے کے لوگ اسے چھوڑتے نہیں یوں پردے کا تعلق مذہب سے زیادہ ثقافت اور سماج سے جوڑ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں گھروں کو بھی زنانہ اور مردانہ دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ پردے کی پابندی صرف عورتیں کرتی تھیں مرد اس سے بھی آزاد تھے مرد جہاں مرضی جو مرضی کرتے رہیں کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں۔ یہ ہی تفریق ایک فریق کو برتر اور دوسرے کو احساس کمتری کا شکار کرتی ہے۔

اس لیے بہت سے دور فہیم لوگوں نے پردے کی پابندی کو ترک کر دیا۔ پردے کی پابندی میں نرمی سے ہی ملازمت کے مواقع پیدا ہوئے۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں کیوں کہ تین نسلیں ایک ساتھ چل رہی ہیں جن میں پہلی نسل پردے کی زیادہ پابند تھی ان میں بھی کچھ روشن خیال گھرانے پردے کی پرواہ نہیں کرتے تھے، جیسے قرۃ العین حیدر، حمیدہ اختر حسین رائے پوری وغیرہ۔ پردے کے بارے میں خواتین آپ بیتی نگاروں کے ہاں متنوع نظریات پائے جاتے ہیں کہیں وہ شوق سے تو کہیں سماجی مجبوری کے تحت پردے کی پابندی کرتی دکھائی دیتی ہے کچھ ایسے گھرانے بھی ہیں جو پردے کو لازمی قرار نہیں دیتے بلکہ اسے عورتوں کی ترقی میں حائل رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔

شہر بانو اپنے دور میں عورتوں کے پردہ کرنے اور گھر میں رہنے کا متعدد جگہ پر اشارہ کر چکی ہیں۔ وہ خود بھی پردہ کرتی تھیں جس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا: ”میں عورت پردہ نشین اور ایک بچہ اور وہ بھی تین مہینے کی جان۔“(۳)

بیگم شائستہ اکرام اللہ کے دور میں پردے کی سخت پابندی کی جاتی تھی گھر میں گاڑی ہونے کے باوجود ڈولی میں سفر کرتی تھی۔ ڈولی میں شیشے کا رنگین ٹکڑا لگایا جاتا تھا جس میں نہ باہر کی دنیا نظر آتی تھی نہ اندر کی۔ ان پر پردے کی پابندی شادی تک عائد ہوئی بعد میں شوہر کے کہنے پر پردہ ترک کر دیا۔ اسی وجہ سے اپنی کتاب کا انتساب بھی اپنے شوہر کے نام لکھا۔ قرۃ العین حیدر کا تعلق ایک روشن خیال گھرانے سے تھا انہوں نے اپنے والدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے چادر اور چار دیواری کے قدیم روایتی تصور کو ماننے سے انکار کیا ہے اور پردے کی قید میں پڑی ہوتی تو مزے سے آزادانہ طور پر شوپنگ کرتی نہ پھرتی ہوتی، تنہا سفر کرنا ممکن نہ ہوتا، ٹھگ گلا گھونٹ کر مار دیتے۔ کنیز بنا کر بیچ دیتے، بادشاہ کے پاؤں میں کچلوا دیا جاتا۔ انہوں نے چادر اور چار دیواری کا تذکرہ متعدد بار کیا ہے۔ ان کی والدہ نذر سجاد حیدر کے اکثر مضامین پردے کے خلاف چھپاتے تو مولوی اور بے ہودلوگ اول فول مضامین شائع کرتے۔ وہ لکھتی ہیں کہ: ”یہ ہمارے مسلم سماج کا پرانا وطیرہ ہے اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا اردو اہل قلم کا محبوب مشغلہ ہے۔“(۴)

یہاں تک کہ اکبر الہ آبادی اور شاعر مشرق علامہ اقبال دونوں نذر سجاد کی آزاد خیالی سے نالاں تھے اقبال ان کی والدہ کو آقازادی کہتے تھے یعنی رسول اللہؐ کی اولاد۔ اسی وجہ سے ناراض تھے کہ آل رسولؐ ہو کر بے پردہ ہو گئی۔ ان کی چندہ ممانی اور ان کی چھوٹی بہن شاہجہاں، قلع محمود پور کے شدید پردے کی پابند لڑکیوں کو نذر سجاد نے فیشن ایبل بنا دیا۔ ان کی کزن عذرا نے عورتوں کی جہالت کی وجہ کم علمی اور پردہ قرار دیا ہے ایم۔ اے پاس خواتین کسی سے لڑائی جھگڑے نہیں کرتی تھیں۔ کوئٹہ کالج میں بے پردہ لڑکیاں بڑے اعتماد اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھ رہی

تھیں۔ تاہم مولوی ممتاز علی کے ایک خط کے مطابق نذر باقر کے گھر ہندوستانی پردہ تھا۔ سادات بارہہ کی بچیوں کا تصویریں اترانا معیوب سمجھا جاتا تھا تصویر دینا تو اور بھی بات تھی۔

عصمت چغتائی کے مطابق صرف ہندو عورتیں، شریف گھرانوں کی بیویاں چادر اوڑھتی تھیں۔ عصمت چغتائی کو جب برقع اوڑھنے کا حکم ہوا تو ان کو سخت کوفت ہوئی۔ ان کے بھائی عظیم نے قرآن وحدیث پر لکھ کر گھر میں ہنگامہ پہلے ہی کھڑا کر دیا تھا۔ پردے کی مخالفت اور موافقت میں زور وشور کی بحثیں چل رہی تھیں بمبی کانفرنس میں عورتوں کے آنے پر پابندی لگا دی گئی۔ سب خواتین نے برقع پہنے ہوئے تھے مگر پھر بھی مسلمانوں نے سخت مخالفت کی۔ یہ خواتین تعلیم یافتہ اور اعلی طبقے سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ ان خواتین کی وجہ سے پردے کا تصور جل کر راکھ ہو گیا۔ ہندوؤں میں پردہ ایک متضاد شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ عورتیں چادر اوڑھتیں، گھونگھٹ نکالتی تھیں اور خیال کرتی تھیں کہ چادر زمین میں نہ رلے دوسری طرف عورتیں تال پر جا کر کپڑے اتار کر دھوتی اور ریت پر پھیلا دیتی۔ مرد پلٹ کر بھی نہ دیکھتے نہ عورتوں کو رتی بھر پرواہ تھیں۔ اس دور میں عورت کا جسم عجوبہ نہ تھا سات آٹھ سال کی لڑکیاں لڑکے بے تکلف ننگے پھرتے تھے مگر آج کل اسی معاشرتی گھٹن کا نتیجہ ہے کہ چند سالوں کی بچی /بچے کے ساتھ جنسی زیادتی کی جاتی ہے۔ عصمت چغتائی نے بھی خود کو چادر اور چار دیواری کی حد تک محدود نہ رکھا۔ اسی لیے اس میں مقید عورتوں کو نئی راہ دکھائی کہ وہ چار دیواری میں گلنے سڑنے کی بجائے مزاحمت کا راستہ اختیار کریں اور فرسودہ رسم ورواج کو چھوڑ کر علم اور ہنر کا راستہ اپنائیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں روایتی گھریلو باتوں پر کان نہ دھریں۔ کیوں کہ روایتی گھریلو تعلیم بھی پدرسری نظام کی ایک شاخ ہے جس میں لڑکیوں کو سسرال اور آنے والے مستقبل سے ڈرایا جاتا ہے۔

ادا جعفری کے گھر کا ماحول بہت روایت پسندانہ تھا عام لڑکی گھر کی کھڑکی سے بھی باہر کی دنیا کا نظارہ نہیں کر سکتی تھی۔ کسی رشتے دار کے گھر میں بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ لڑکیاں لڑکیوں کے ناموں سے واقف تھیں غیر خاندان کی عورتوں سے کنواری لڑکیاں پردہ کرتی تھیں کنواریوں کی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو جاتی ان کا شمار لڑکیوں میں ہی ہوتا۔ صرف نو عمر بچیوں کو آزادی سے سانس لینا نصیب تھا۔ برقع اور چادر مسلمان بیویوں کی پہچان تھی۔ عورتیں نوکروں سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ان کی وفاداری مسلم تھی۔ یہاں طبقاتی کشمکش کی برتری بھی نظر آتی ہے۔ روایتی ماحول اور قدامت پسندانہ خاندانی پس منظر کی وجہ سے شعر وادب کی دنیا کا سفر کٹھن ہو گیا۔ کیوں کہ قدیم رسم ورواج کو توڑنے کی طاقت موجود نہیں تھی۔

ادا جعفری کے علاقے ٹونک والا پھاٹک میں روایتی پردے کی سخت پابندی کی جاتی تھی جس میں مرد ہر طرف دیکھ سکتا تھا عورت کو گھر سے باہر نہیں جھانک سکتی تھی۔ اگر گاؤں میں دوسرے گاؤں کی عورتیں آجائے تو

ان سے بھی پردہ کروایا جاتا تھا۔ عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے اسکول کالج میں بھیجنے کا رواج نہ تھامرد ہر طرح کی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ چادر اور چار دیواری کی پابندی کرنے والی خواتین اپنے شوہروں کی باندیاں تھیں۔ ان کے شوہروں کا ہر حکم ان کے لیے حکم خداوندی کا درجہ رکھتا تھا۔ماں بیٹے کے بڑے ہو جانے پر بات نہیں کر سکتی تھی۔ خود ادا جعفری کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ کبھی اس سڑک پر پیدل چلے۔ وہ لکھتی ہیں: ''بچپن میں میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کبھی خاندان کے لڑکوں کی طرح میں بھی اس سڑک پر پیدل چلوں اور تقدیر کا فیصلہ یہ تھا کہ میں پوری دنیا گھوم لوں میرے قدم اس سڑک کو کبھی نہ چھو سکیں۔''(۵) ساری دنیا گھوم لی مگر ٹونک والہ پھاٹک ویسے کا ویسا رہا وہاں پر آزادی سے اکیلے گھومنے کی خواہش مصنفہ کا ارمان بن گئی۔

صالحہ عابد حسین کے دور میں لڑکیوں کا گھر سے باہر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آٹھ سال کی لڑکی برقع پہنتی تھیں۔ کیوں کہ اس دور میں سات آٹھ سال کی لڑکی کو آدھی عورت کہا جاتا تھا۔ برقعے کے ساتھ ہی بہت سارے کام بھی کرتی تھیں جو برقع اترنے کے بعد بھی جاری رہے۔ ایک دن مصنفہ قاری صاحب کے گھر سے اکیلی گھر آئی تو ان کا وہاں سے پڑھنا بند کروایا گیا کیوں کہ اس زمانے میں اکیلی بچی کا گھر سے باہر نکلنا اور اکیلے آنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کالج میں بھی برقع اوڑھ کر تانگے میں جاتی تھیں۔ شادی کے پیام کے سلسلے میں کئی خاندانوں نے خواہش ظاہر کی۔ گھر والوں نے شرط رکھی کہ جو کوئی بھی پیام بھیجے وہ خاندان کو نہیں خود لڑکی کی خاطر بھیجے۔ مصنفہ کو بزرگوں کی اس بات پر بہت اعتراض تھا کہ وہ لڑکی جو سخت پردے میں رہتی ہو جس کی صورت سے کوئی واقف نہ ہو نہ سیرت سے، نہ کہیں سے اعلی تعلیم حاصل کی ہو اسے کوئی کیا جانے گا اور اس کے لیے کیوں کر پیام آئے گا۔ ہمارے ہاں تو شادی کے پیغامات بھی خاندانی رتبے کو دیکھ کر آتے ہیں۔ اصل لڑکی کی شخصیت تو گم نام ہی رہتی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کی ایک صورت ان کے گھرانے میں بھی نظر آتی ہے۔ گھر میں تمام مصنفین کی کتابیں موجود تھیں جن کو چھپا کر پڑھا جاتا تھا اور اس کا اظہار کسی کے آگے نہیں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے رسوا، شرر اور سرشار کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ مرزا ہادی رسوا کا "امراء جان ادا پڑھا مگر اس کی سمجھ نہیں آئی۔ خواتین مصنفین کی تخلیقات کم تھیں اگر تھیں بھی تو اپنے نام کی بجائے بنت یا ہمشیرہ لکھا کرتی تھیں۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کا تعلق ایک روشن خیال اور تہذیبی خاندان سے تھا جہاں پر روایتی قسم کا پردہ لڑکیاں نہیں کرتی تھیں۔ ان کے والد نے ان کی والدہ سے نہ پردہ کروایا اور نہ ہی اپنی بیٹیوں کو پردے کے لیے مجبور کیا۔ گھر میں کوئی بھی مہمان آتا تو ماں کے ساتھ بیٹیاں بھی ان کی خاطر مدارت کرتی اور ان سے بات چیت کرتی

تھیں۔ یہ سب ان کی تربیت کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس بات پر اعتراض کیا مگر ان کے والد نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

افضل توصیف اپنی آپ بیتی میں پردے کے بارے میں لکھتی ہے کہ ان کی دادی کے دور میں عورتیں پردہ کرنے تھملے کے پیچھے چلی جاتی تھیں۔ گھونگھٹ ہر ایک کے ماتھے پر رہتا تھا۔ ان کی دادی تو اپنے شوہر سے بھی پردہ کرتی تھیں اور بات کرتے ہوئے گھونگھٹ کی اوٹ کا سہارا لیتی تھی۔

ش۔ فرخ لکھتی ہیں کہ سڈنی کے ایک مفتی نے حجاب و نقاب کے حق میں بولتے ہوئے نقاب نہ اوڑھنے والی عورتوں کے خلاف نازیبا باتیں کہہ دیں تو وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا پھر مفتی صاحب پوپ کی طرح اپنی صفائی پیش کرنے لگے کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا بلکہ میرا مطلب یہ تھا۔۔۔۔وغیرہ۔ متحدہ عرب امارات میں عورتیں عورتوں سے پردہ کرتی تھیں۔ وہاں کی عورتیں چہرے پر چمڑے کی پٹی سے بنے کھوپے چڑھاتیں تھیں۔ ش۔ فرخ نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ابو ظہبی میں رواج ہے کہ عورتیں عورتوں سے پردہ کرتی ہیں، یوں پردے کے مسائل کا تعلق مذہب سے زیادہ روایت سے ہو گیا۔

سعیدہ بانو احمد نے اپنی آپ بیتی "ڈگر سے ہٹ کر" میں سلطان جہاں بیگم (بھوپال) کا ذکر کیا ہے جہاں چار پشتوں سے عورت حکومت کر رہی ہے۔ سلطان جہاں بیگم برقع اوڑھ کر تخت پر بیٹھتی تھی سارے وزیر، امیر زادے دربار میں باادب ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کے تحت زمانہ کروٹیں بدل رہا تھا پردہ غائب ہو رہا تھا اور مغربی تہذیب کا غلبہ تھا عورتیں انگریزوں سے بھی آگے نکل رہی تھیں۔ ریڈیو کا جب آغاز ہوا تو عورتوں کا دل چاہ رہا تھا وہاں کام کریں اور ان کی آواز سنی جائے مگر ریڈیو پر طوائفیں کام کرتی تھیں عام عورتیں ان سے پردہ کرتی تھیں۔ وہ لکھتی ہیں: "اس زمانے میں شریف گھرانوں کی عورتیں طوائفوں سے پردہ کرتی تھیں۔"[٦]

حمیدہ سالم کے دور میں چادر اور چار دیواری کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ عورت کو صنف نازک سمجھ کر اس کی ساری ذمہ داری مرد پر عائد کر دی گئی اس لیے وہ یونی ورسٹی برقع پہن کر جاتی تھی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی مگر کچھ بے زار بھی تھی۔ حمیدہ سالم نے ایسی صورت حال سے نجات پانے کے لیے دوغلے پن اور متضاد رویے کو اپنانے کا سوچا۔ وہ لکھتی ہیں: "میرے ساتھ ایک عورت ہو گی کالج کے پھاٹک پر میرا برقع اس کے تھیلے میں ہو گا اور واپسی پر میں پھر برقع پوش ہو جاؤں گی۔ بے پردگی کی لذت کالج کی چار دیواری کے اندر ہی حاصل کر سکوں گی۔"[٧] لڑکیوں کو سیمینار اور لائبریری میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لائبریری میں سے کتابیں اختر، علوی اور سالم کے ذریعے مل جاتی تھیں۔ عورت کی دنیا گھر کی چار دیواری کی حد تک محدود تھی۔

ساجدہ زیدی کے دور میں لڑکیاں ڈولی میں بیٹھ کر سکول جاتی تھیں۔ڈولی کا جھلنگا کھٹولا چھوٹا ہوتا تھا جس میں سب لڑکیاں سکڑ کر بیٹھتی تھیں۔ہلنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔بات نہیں کر سکتی تھیں اس سے آواز کی بے پردگی ہوتی تھی۔دوسری طرف ساجدہ زیدی علی گڑھ یونی ورسٹی کے ماحول کو دقیانوس قرار دیتی ہیں جہاں کا تعلیمی معیار تو اعلیٰ تھا مگر طالبات پردے کے پیچھے بیٹھ کر چہرے کو نقاب سے ڈھانپ کر پڑھتی تھیں۔

عطیہ داؤد نے آٹھویں جماعت میں برقع لینا شروع کیا برقعے کی دبیز جالی اور کالے نقاب کی مدد سے دنیا دیکھنا بہت مشکل کام تھا ہر چیز دھندلی نظر آتی تھی۔اس لیے عطیہ داؤد نے فیصلہ کیا کہ وہ برقعے کی جالیوں سے دنیا نہیں دیکھے گی۔آخر کار لوگ عورت کو اپنے اوپر بھروسہ کرنے اور سوچنے کی تربیت کیوں نہیں دی جاتی۔

کشور ناہید نے سات سال کی عمر میں برقعہ سر پر چڑھایا اور یونی ورسٹی تک لیتی رہیں۔پردے کا مفہوم ہمارے ذاتی مفاد کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے کشور ناہید کے مطابق ویسے تو سات سال کی عمر میں پردہ کرتی تھی مگر جب جہاز میں ٹکٹ لینے کی باری آئی تو ان کو وہی برقع اتر کر بچی ظاہر کیا گیا۔کالج یونی ورسٹی کے زمانوں میں لیڈیز روم میں برقع رکھ کر مباحثوں اور مشاعروں میں حصہ لیتی رہی۔ایک دفعہ ایک اخبار میں مصنفہ کی بڑی سی تصویر انعام لیتے ہوئے شائع ہوئی۔ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے کہنے لگیں:"جلادو۔۔۔۔۔چھپادو یہ اخبار۔۔۔مجھے بچاؤ۔"(۸) اس زمانے میں چند ہی تو اخبار نکلتے تھے۔قدامت پرستی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی آزادی کے نام پر تعریف کر کے اپنی طرف مائل کرنا مرد کی ایک چالاکی ہے اگر نہ مانیں تو بات کو پلٹا دیں گئے۔

نثار عزیز بٹ پر قدامت پرست ماحول کا اتنا اثر ہوا کہ خود برقع پہنے کی ضد کی،وہ برقع پہن کر کالج اور ریڈیو اسٹیشن جاتی تھی اس کی وجہ سے مصنفہ کی دنیا محدود ہوگئی۔وہ لکھتی ہیں کہ:"برقع پہننے سے میری دنیا سکول اور گھر تک محدود ہوگی اور سکول میری زندگی کا مرکز و محور بن گیا۔"(۹) حمیدہ سرتاج کی منگیتر تھی اس لیے سات سال کی عمر میں وہ پردہ کرنے لگی۔اسلامیہ کالج سے بیٹھ کر اکیلی نے سفر کیا۔صوبہ سرحد میں پردے کی پابندیوں کا ذکر کرتے ہوئے نثار عزیز بٹ لکھتی ہیں کالج میں لڑکیاں مباحثوں کے دوران سکرین کے پیچھے بولا کرتی تھیں۔مس ٹھاکر داس کہتی تھیں تم پردہ کرو یا نہ کرو ہمارا کالج پردہ ضرور کرتا ہے۔تلاوت کے مقابلوں کے دوران بھی سب لڑکیاں نقاب کرتی تھیں۔براڈ کاسٹینگ کے درمیان جب اصغر سے کوئی رشتہ نہ تھا اس سے بھی پردہ کرتی تھی۔ٹرین میں سفر کے دوران مرد بار بار آکر عورتوں کو پردے کی تنبیہ کرتے جس سے عورتیں خوف زدہ ہو جاتیں۔

چادر ہمارے معاشرے میں شرافت اور عزت کی علامت سمجھی جاتی ہے انیس ہارون کی پھوپھی ان کے گھر آئی تو انہوں نے انیس کو برقع پہن کر سکول جانے کو کہا ان کے والد محترم اپنی بڑی بہن کی بات نہیں ٹالتے

تھے۔ انہوں نے انیس ہارون کو کہا کچھ دن برقع پہن لو چلی جائیں گی تو اتار دینا ورنہ سکول نہ جاؤ۔ براؤن برقع سے نفرت کے باوجود سکول پہن کر جانا پڑا پھر خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہان کی دوست سلطانہ بھی تو برقع پہن کر آتی ہے اور وہ خوش رہتی ہے۔ ضیا الحق حکومت نے اسلام کے نام پر چادر اور چار دیواری کا تصور دیا۔ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں سر ڈھکنا لازمی قرار دیا گیا۔ اساتذہ اور طالبات کو اس پر عمل کرنا ہی پڑا۔ پھر یہ ہی احکامات ٹی وی تک بھی پہنچ گئے ساری اناؤنسرز نے اپنے سر ڈھانپ لیے۔ ان کی دوست مہتاب راشدی نے سر ڈھکنے سے انکار کرکے نوکری سے استعفی دے دیا۔ صغرا مہندی کے گھر میں پردے کی سخت پابندی تھی۔ لڑکیوں کو میلوں ٹھیلوں میں جانے کی اجازت نہ تھی اس گھٹن زدہ ماحول سے تنگ آکر ان کی بہن نور جہاں نے کہاعورتوں کو دفن کیوں نہیں کر دیتے؟ صغرا مہدی کے خاندان کی تمام عورتیں پردہ کرتی تھیں ان کی ممانی کی دوستیں ذکیہ انصاری، شبو تھیں جو پرائیویٹ ایم۔ اے کے امتحان دینے برقعہ اوڑھ کر جاتی تھیں۔ ذکیہ انصاری تو برقعہ اوڑھ کر بچوں کے پروگرام میں حصہ لیتی تھیں۔ صالحہ عابد خود بھی عورتوں کے پروگرام میں تقریریں کرتی تھی۔ صغرا مہدی جب قریبی علاقے میں لڑکیوں کا سکول نہ ہونے کی وجہ سے لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھیں تو ان کی ممانی سمجھتی تھی کہ کوئی ایسا فعل نہ کرنا جس سے خاندان کی عزت پر کوئی حرف آئے۔ ان کی یونی ورسٹی میں بھی لڑکیاں پردہ کرکے اور لڑکوں سے دور ہو کر بیٹھتی تھیں۔ نفیس بانو شمع لکھتی ہیں کہ گیارہ سال کی عمر میں ان کو گھر والوں نے گھر سے باہر جانے سے منع کر دیا۔ ان کی دنیا گھر کی چار دیواری کی حد تک محدود تھی۔ نفیس بانو شمع کو پردے کا حکم دیا۔ اب انھیں گھر سے باہر آزادانہ طور پر گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی وہ سکول بھی برقع پہن کر جاتی تھی۔ ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل کود بھی منع تھی۔ سید ہونے کی وجہ سے نفیس کے گھر والے دوسری ذات کی لڑکیوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ زہرا داؤدی بھوپال کے بارے میں بتاتی ہیں کہ وہاں پر سخت پردہ کروایا جاتا تھا لڑکیوں کا دروازے تک آنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ باپ اور بھائیوں کے سامنے کھلے سر پھیرنا بھی قابل اعتراض عمل تھا۔ عذرا عباس کو بڑا ہونے پر بھائیوں اور باپ نے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگا دیتا کہ اس کے اندر نسوانیت کی خوبیاں بیدار ہوں۔

ب۔ معاش کے جدید تصورات:

محنت کی سب سے پہلی تقسیم مردوں اور عورتوں میں بچے پالنے کی ہوئی۔ یونان کی عورت کو اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے پہلے طوائف بننا پڑا۔ جو عورتوں پر مردوں کے تسلط کا اظہار تھا۔ عورتوں نے کھیتی باڑی سے محنت کی ابتداء کی جس میں عورت کے کردار کو اہمیت نہیں دی گئی الٹا عورت کو مرد نے اپنی باندی بنا لیا۔ ہمارے معاشرے

میں خواتین کے ملازمت کرنے کی مخالفت کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اکثر مرد اپنی بیویوں کے کام کرنے کو ظاہر نہیں کرتے کیوں کہ ان کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ وہ عورت کی کمائی کھاتے ہیں۔مغلیہ دور حکومت میں خواتین کو رسمی تعلیم دینے کا رجحان نہ تھا۔اعلیٰ طبقے کے گھرانوں میں ایک استانی گھر میں پڑھانے کے لیے آتی تھی۔۱۸۶۴ء کے قریب انگریزوں نے خواتین کے سکول اور مدرسے بنائے۔اعلیٰ طبقے کے گھرانوں میں لڑکیوں کو سکول میں داخل کروانا اپنی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔پھر رسائل کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔اس کی وجہ مردوں اور عورتوں کی تعلیم کے بارے میں من گھڑت تصورات تھے عورت کو گھر، خاندان اور رشتوں کی حد تک محدود کر دیا گیا جو قدیم روایات اور رسم ورواج کو قائم ودائم رکھنے کی امین تھی اس لیے ان کے لیے مسلمانوں نے مخصوص قسم کا سلیبس تشکیل دیا جب کہ مرد انگریزی تعلیم حاصل کر کے ترقی کر سکتے تھے کیوں کہ ان کا تعلق باہر کی دنیا سے تھا۔ان علوم سے عورت کی نچلی حیثیت کا انداز کیا جا سکتا ہے اور کہا جاتا تھا کہ ان کا اولین فرض اچھی ماں، بہن اور بیوی بننا ہے اس صورت حال کو واضح کرتے ہوئے روبینہ سہگل لکھتی ہیں:

> ”عورتوں کی تعلیم کے فروغ کی پالیسیاں اور جس قسم کی تعلیم فراہم کی گئی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا ان کا مقصد عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کا فروغ نہیں بلکہ ان کا مقصد پدرسری اور طبقاتی نظام کو استحکام عطا کرنا تھا۔“(۱۰)

عورت کا تعلیم حاصل کرنا اور نوکری کرنا کیوں کہ معیوب سمجھا جاتا تھا اسی وجہ سے ان مشنری سکولوں میں پڑھانے والی زیادہ تر اساتذہ انگریز تھیں۔ان ہی سکولوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد خواتین میں معاشی خود مختاری کا شوق وجذبہ پیدا ہوا۔دوسری طرف تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عورت کا ملازمت کرنا لازمی قرار پایا۔سرمایہ دارانہ نظام کے تحت عورت اپنی گھریلو ضروریات کو پورا کرنے اور صلاحیتوں کو منوانے کے لیے گھر سے باہر دفاتروں اور دوسرے اداروں میں نوکری کی خاطر چکر لگاتی ہے جہاں پر عورتوں کی نسبت مردوں کو اولیت حاصل ہوئی۔اس لیے ملازمتوں پر مردوں کا غلبہ رہا مختلف اداروں میں خواتین تھی نہیں اگر تھیں بھی تو آٹے میں نمک کے برابر کیوں کہ خواتین کو رسمی تعلیم سے دور رکھا جاتا تھا۔اس طرح کام کرنا والی خواتین کے دو طبقات سامنے آئے پڑھی لکھی خواتین اور ان پڑھ مزدور خواتین۔ان پڑھ خواتین کھیتوں، گھروں، بھٹوں اور کارخانوں میں دس دس گھنٹے کام کرتی ہیں جن کو معمولی معاوضہ دیا جاتا ہے۔اس کے باوجود اسی فی صد خواتین بنگال میں چائے اور جنوبی پنجاب میں کپاس چن کر ملکی زرمبادلہ میں اضافہ کرتی ہیں۔مڈل

کلاس خواتین فن دست کاری کی ماہر ہیں جن کے ہاتھوں کی دست کاری کو پوری دنیا میں سراہا جاتا ہے مگر ان کے ساتھ بھی ثانوی سلوک کیا جاتا ہے جس کے بارے میں کشور ناہید لکھتی ہیں:

"زمین کی مالک عورتوں سے زیادہ خراب حالت ان عورتوں کی ہے جو زمین پر بطور مزدور یا مزارع کام کرتی ہیں۔ یہ عورتیں کھیتوں میں بھی اور زمین دار کے گھر پر بھی کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ وہ زمین دار کے گھر کا کھانا بھی پکاتی ہیں۔ کپڑے بھی دھوتی ہیں، بچے بھی سنبھالتی ہیں اور زمیندارنی کی ڈانٹ مار اور گھونسے بھی کھاتی ہیں۔"(۱۱)

پڑھی لکھی خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی تھیں۔ کچھ ملازمتوں میں جنسی ترجیحات کی بناء پر صرف مردوں کو رکھا جاتا ہے۔ خواتین کو ثانوی اہمیت دیتے ہوئے ان کی قابلیت کے باوجود چھوٹے عہدوں پر رکھا جاتا تھا کیوں کہ وہ گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے لیے گھر سے باہر نکالتی تھیں اور معاوضہ بھی ان کو مردوں کی نسبت کم دیا جاتا ہے کیوں کہ خواتین گھر سے دور دراز جگہوں پر ملازمت نہیں کر سکتی تھیں دوسری طرف ہمارے معاشرے میں خواتین کا ملازمت کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ ہمارا مذہب ملازمت کرنے سے عورت کو منع نہیں کرتا۔ شروع میں وہ زیادہ تر عورتیں شعبہ تدریس اور میڈیکل سائنس سے وابستہ ہوئیں بعد میں انہوں نے دوسرے شعبوں میں بھی حصہ لیا۔ بہت سی خواتین سول سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئیں۔ ان کی تعداد بہت کم تھی ۲۰۱۸ء کی ایک رپورٹ کے مطابق:

"پاکستان کے مختلف اداروں میں اکتیس ہزار دو سو اکیاسی خواتین افسران تعنیات ہیں جن میں پنجاب 73.68 فی صد، بلوچستان میں 19.3 فی صد، سندھ میں 12.76 فی صد، خیبر پختون خواہ میں 7.9 فی صد خواتین برسراہ روزگار ہیں۔ قبائلی علاقوں فاٹا میں 1.36 فی صد، اور گلگت بلتستان میں 8.56 فی صد خواتین مختص ہیں ملک میں متعدد خواتین افسران سولہواں اور سترواں سکیل کی افسران ہیں۔"(۱۲)

سرمایہ دارانہ نظام نے جہاں پر عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکالا کر دفاتر کی طرف لایا وہاں پر عورت کی مجبوری سے فائدہ بھی اٹھایا۔ لڑکیوں کے لیے سیلز گرل اور ماڈل کا پیشہ ایک فیشن کے طور پر متعارف کروایا۔ آج کے دور میں سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر چیز میں عورت کو ایک اشتہار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ پرائیویٹ فارم نے نئی ملازمتوں کے راستے ہموار کیے تو دوسری طرف کڑے قوانین بھی بنائے۔ کام کا دورانیہ تنخواہ کے لحاظ سے زیادہ کر دیا گیا۔ پاکستان میں ابھی تک کوئی ایسا باقاعدہ ادارہ نہیں جو خواتین کو پیشے کے انتخاب میں اس کے رجحان

کے مطابق رہنمائی کر سکے اور ان کے حقوق کے حصول کو یقینی بنائے۔ پیشہ وارانہ مشاورات کے لیے پوری دنیا میں غیر سرکاری طور پر ادارے بنائے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کے دور میں خواتین ہر شعبے میں کام کر رہی ہیں جن میں میڈیکل، تعلیم، صحافت، میڈیا، قانون اور دوسرے شعبے شامل ہیں۔ ان کے ملازمتوں میں آنے اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے نئی اقدار جنم لے رہی ہیں۔ خواتین آپ بیتی نگاروں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ شہر بانو کی طرح بہت سے خواتین تعلیم کے شعبے سے منسلک ہوئیں۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اپنے سیاسی مستقبل کا آغاز دہلی وویمنز لیگ کی ممبر بن کر کیا جو عورتوں کے معاشرتی کاموں کی ابتدا تھی اگرچہ یہ کانگریس کا ادارہ تھا۔ اپنے چچا کے انتقال پر یہ پارٹی اس کے کھوکھلے پن کی وجہ سے چھوڑ دی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد دوبارہ سیاست میں آئی۔ دہلی کالج سے ہی قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کے مشورے سے مسلم فیڈریشن کا آغاز کیا۔ اس کے بعد تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوئی۔ پورے پاکستان میں وویمنز ریلیف کمیٹیاں بنائیں۔ خواتین کے لیے ایک انگریز رسالہ پردے کے نام سے شائع کرتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد قومی اسمبلی میں دو ہی خواتین تھیں بیگم جہاں آراء اور بیگم شائستہ اکرام اللہ۔ انہوں نے پاکستان کی سفیر کے فرائض بھی سر انجام دیئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد خواتین زندگی کے تمام میدانوں میں پیش پیش رہیں۔ ڈاکٹر عقیلہ جاوید کے مطابق قرۃالعین حیدر کی آپ بیتی "کارجہاں دراز" میں عورت کا یہ روپ حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ عطیہ فیضی ،یاسمین، ممتاز شیریں، نور افشاں امام کے علاوہ بہت سی اہل قلم خواتین کا ذکر آتا ہے۔ انگریز نیوز کاسٹر اچھوبی بی کا ذکر بھی کیا ہے۔ عطیہ فیضی انگلستان سے اعلی تعلیم حاصل کر کے آئیں تھیں۔ بی بی سی میں ماہر فن براڈ کاسٹر تھیں۔ وہ لندن کی گم نام دعوتوں میں بھی گئی۔ اس کا بیٹا اور بیٹی دونوں فلم ساز تھے۔ ان کے بارے میں انگریز کہتے تھے کہ اگر آپ ہندوستان جائیں تو دو چیزیں نہ دیکھو تو تم نے کچھ نہیں دیکھا: تاج محل اور عطیہ فیضی۔ یاسمین نے کیمبرج یونی ورسٹی سے پڑھا تھا اور شوہر کے ساتھ مل کر ایک کتابوں کی دکان چلتی تھیں۔ ان کا شمار انگلستان کی مشہور بزنس ویمن میں ہوتا تھا۔ نقاد خواتین میں کوئی بھی ممتاز شیریں نہ بن سکیں۔ سحاب قزلباش جو آغا قزلباش کی بیٹی تھی بر صغیر میں مشہور بے بی اناونسر تھی۔ وہ آل انڈیا ریڈیو پروگراموں میں ملازم بھی رہی۔ مختلف انگریز اخباروں میں کالم بھی لکھتی تھی۔ بعد میں بی۔ بی۔ سی کے اردو پروگراموں میں براڈکاسٹنگ کرتی رہی۔ اس میں بے شمار خواتین جو اسٹیج کردار اور رقاصہ تھی۔ شیما کرمانی جو رقص کی ماہر تھی۔ پی۔ آئی۔ اے لڑکیوں کی ملازمت جو

صرف خواب تھی۔ قرۃ العین برصغیر کی خواتین کا ایک دبستان متعارف کرواتی ہیں جو مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کو منوارہی تھیں۔ بہت ساری خواتین نے دینی تعلیمات اور فارسی زبان کی تعلیم دینے کو بطور پیشہ اپنایا۔ ان میں شہر بانو بھی شامل تھی ۔ عصمت چغتائی نے مڈل کلاس کے بعد ٹرنینگ لی اور نوکری کی تو سارے خاندان نے مخالفت کی۔ گھر میں آگ تک لگانے کی دھمکیاں دیں۔ اس وجہ سے ان کے والد گھر دیر سے آتے اور خود زیادہ تر گھر سے باہر رہتی تھی ماں کے ساتھ جو بیتی وہ ہی جانتی ہوں گی۔ عصمت چغتائی نے لڑکیوں کے مسلم گرلز ہائی سکول میں بطور ہیڈ مسٹریس ملازمت کی۔ ملازمت کے دوران ان کے چال چلن اور رکھ رکھاؤ پر نظر رکھی جاتی۔ میرا ایک ٹیڑھا قدم پاؤں تلے سے فرش کھینچ لے۔ اسی لیے ہماری قوم کی عادات کو بدلنے میں وقت لگے گا۔ بغیر تنخواہ کے تین مہینوں کے لیے استانیاں مقرر کیں۔

ادا جعفری کے مطابق بینکاک شہر میں نہروں کی بہتات تھی ان میں سے کچھ نہروں اور کشتیوں پر بازار لگتے تھے جہاں پر زیادہ تر خواتین ہی دکان داری کرتی تھیں۔

صالحہ عابد حسین کو نوکری کرنے کا شوق تھا ابتداء میں بیماریوں نے موقع نہ دیا دوسری طرف عابد حسین کو ان کا گھر سے باہر جانا پسند نہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کے خلاف تھے بلکہ ان کی صحت، مزاج اور دماغی حالت کو دیکھ کر نوکری کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ تقسیم سے پہلے رسالہ " آج اور کل " کی ادارت کی پیش کش ہوئی۔ تنخواہ دوسو روپے تھی۔ ریڈیو اسٹیشن نے دو دفعہ ملازمت کی آفر کی ایک دفعہ اناؤنسر اور دوسری دفعہ اسکرپٹ رائٹر کی۔ اپنی نوکری کے بارے میں لکھتی ہیں: "میری تعلیم کی خامی، صحت کی خرابی کے علاوہ میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ میں نوکری کی پابندیاں اور غلط قسم کی باتیں برداشت نہیں کرسکتی۔"(۱۳)

نئی روشنی میں عابد حسین کے ساتھ مل کر نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس میں غلامی نہ تھی صرف کام تھا جو دل جمعی سے کیا۔ ڈراموں میں کام کرنے کا شوق تھا مگر خودداری کی وجہ سے کہتی نہیں تھی۔ برسوں بعد صالحہ عابد حسین کے ڈراموں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور جس کالج میں ڈرامے کروائے جاتے ان کو مدعو کیا جاتا۔ ریڈیو کی تقریریں لکھتی تھی اخبار میں فیچر کا معاوضہ تقریر سے زیادہ ملتا تھا۔ ان کے ناولوں پر رائلٹی بھی ملتی تھی۔ ناول ،افسانوں کے علاوہ مختلف رسائل میں مضامین بھی لکھتی تھی۔ عام طور پر ادیب مصنف اپنی بیوی کی تخلیقی صلاحیتوں کو شعوری اور لاشعوری طور پر کچلنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے بیوی احساس کمتری کا شکار ہوتی ہے، مگر عابد حسین نے ایسا کچھ نہ کیا۔ وہ دوسروں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صالحہ عابد حسین کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

سعیدہ بانو کا گھرانہ پڑھا لکھا اور روشن خیال تھا۔ نہ صرف سعیدہ بلکہ ان کی بڑی بہن بھی سوشل ویلفیئر بورڈ کے علاوہ دوسرے سماجی کاموں کے لیے روز دہلی آتی جاتی رہتی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنو میں ریڈیو اسٹیشن کا آغاز ہوا جس میں پڑھی لکھی خواتین کی ضرورت تھی جو بحث ومباحث میں حصہ لے سکے۔ اس زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ریڈیو میں کام کرنے والی خواتین طوائفیں تھیں جن سے شریف گھروں کی عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ سعیدہ بانو احمد کو بھی اسٹیشن کی طرف سے ملازمت کا خط موصول ہوا۔ سعیدہ نے اپنے شوہر کی اجازت سے ریڈیو پروگرام میں شرکت شروع کر دی۔ ہر طرف ان کی آواز کے چرچے تھے ہر ہفتے ان کو دعوت نامے موصول ہوئے۔ ان کی بہتر کارکردگی دیکھ کر ایک افسر نے ہفتے میں صرف ایک دن آنے کی پیش کش کر دی۔ جیسے سعیدہ بانو احمد نے منظور کر لیا۔ وہ بارہ بنکی سے لکھنو آتی تھی اور شام تک واپس آتی تھی وہ گاڑی خود چلاتی تھی۔ وہ بڑے فخر سے لکھتی ہیں :"میں پہلی عورت تھی جس کو دلی ریڈیو نے خبریں پڑھنے کے لائق سمجھا۔"(۱۴)

۱۹۴۷ء میں آل انڈیا ریڈیو اناونسر کی درخواست دی۔ اس وقت ریڈیو کا یہ دفتر دہلی میں تھا۔ ۱۹۶۷ء میں لندن میں ملازمت پیشہ خواتین کی ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی۔ بی۔ بی۔ سی میں دومرتبہ ہندوستان کے بارے میں انٹرویو دیا۔ سعیدہ بانو احمد نے آج سے ساٹھ ستر سال پہلے کی عورت کو اپنی صورت میں آزاد اور خود مختار ہونے کا تصور دیا۔ سعیدہ بانو احمد نے اپنے دونوں بیٹوں کو اعلی تعلیم دلوائی۔ اسد کی نوکری انڈین ائیر میں ہوگئی اور چھوٹے بیٹے سعید بی۔ کام کے بعد مغربی بنگال، میں انڈین آئل ملز میں سیلزمین کی نوکری مل گئی۔

حمیدہ سالم کے دور میں عورتوں سے ملازمت کروانا حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان کے خیال عورت کو گھر کی چاردیواری کے اندر رہنا چاہیے گھر کی ضروریات مرد پوری کرے۔ ملازمت پیشہ بہو کا تصور ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ ان کے شوہر سالم ایم۔ اے، بی۔ ٹی تھے جبکہ ان کی بیوی کے پاس ڈگریاں ہی ڈگریاں تھیں۔ عطیہ داؤد زندگی کے بارے میں یہ شعور بچپن ہی سے رکھتی تھی کہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے لیے اسے معاشی طور پر مستحکم ہونا پڑے گا۔ اس شعور نے پختگی اس صورت میں اختیار کی جب اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ شادی کی شکل میں میری تین بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان پوری کرکے میری زندگی کے فیصلے کا حق حاصل کرلے یہ سودا کسی صورت بھی منظور نہیں۔ عطیہ داؤد کی تعلیم نامکمل ہونے کی وجہ سے اسے ملازمت کے حصول میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف وہ اپنے بھائیوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے چھوٹی موٹی ملازمتیں ضرور کی مگر وہ مستقل حیثیت اختیار نہ کرسکیں۔ کیوں کہ پرائیویٹ سیکٹر میں سفر کرتے اور ملازمت کرتے ہوئے افسروں کی بہت سی جائز اور ناجائز باتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو وہ کسی صورت بھی نہیں کرسکتی تھی وہ لکھتی ہے:"ہم عورتیں

انسان نہیں ہیں۔ کیا یہ ہمارا حق نہیں کہ ہم اپنی بے عزتی نہیں ہونے دیں۔ ہمارے جسم کو کوئی چھوئے اور ہم اس کو کچھ نہ کہیں۔"(۱۵) ایف۔اے کرنے کے بعد تولیہ فیکٹری ،این۔جی۔اوز اور ایک سرکاری سکول میں عارضی طور پر ملازمت کی۔ بعد میں کافی تگ دود کے بعد ایک سرکاری محکمے میں اسٹینو گرافر کی نوکری ملی۔ جو ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ وہ لکھتی ہے:"میرے جذبات کو ٹھیس تو لگی کہ جس ملازمت یعنی سکول میں پڑھانے کے لیے میں موزوں تھی اور جس کی مجھے خواہش بھی تھی وہ مجھے نہیں ملی۔"(۱۶)

اس کے بعد ایک سندھی اخبار میں کمپیوٹر آپریٹر کے طور پر شام کو نوکری کی۔ نئے لڑکوں کو مہارت سیکھی وہی اس کی ملازمت کے دشمن بن گئے۔ وہ عطیہ داؤد کے عہدے پر کم تنخواہ میں بھی کام کرنے کو تیار ہو گئے جس کی وجہ سے پرانے اور تجربہ کار لوگوں کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا جن میں مصنفہ خود بھی شامل تھی۔ وہ اپنے اوپر ہونے والے استحصالی رویے کا منظر ان الفاظ میں قلم بند کرتی ہے:"ایک نئے آپریٹر نے بتایا کہ آپ اندر نہیں آسکتی آپ کی نوکری ختم کر دی گئی ہے۔ آنسو میری آنکھوں سے ٹپک کر گالوں تک آ گئے۔"(۱۷)

ریڈیو میں بھی چار سے آٹھ مہینے کام کیا۔ وہ ریڈیو پروگراموں کے لیے دن رات محنت کرتی۔ ہر پروگرام کے لیے ایک نیا موضوع دیا جاتا۔ جس کے لیے مواد اکٹھا کرتی۔ دردر کی خاک چھانتی یہاں تک کہ اکثر لوگ سوال کرتے کہ کیا وہ پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہے جو یوں اتنی عرق ریزی سے مواد اکٹھا کرتی ہے۔ بطور انشورنس ایجنٹ تین ماہ تین سو ماہانہ کام کیا۔ یوں عطیہ داؤد نے محنت کر کے خود کو معاشی طور پر مستحکم بنایا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مردوں کی تعداد کم رہ گئی تھی اس لیے خواتین سکولوں میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ سویت یونین کی معاشی ترقی اور تہذیبی تبدیلی خواتین کی روشن خیالی اور مساوات کا نتیجہ تھی۔ ایم۔اے انگلش کے بعد صابرہ زیدی کا علی گڑھ یونی ورسٹی میں بحیثیت سینئر لیکچرار کے طور پر تقرر ہو گیا جس سے ان کی والدہ کی مالی مشکلات میں کمی ہوئی۔ اسی طرح تعلیم مکمل کرنے کے بعد ساجدہ زیدی نے اپنی آپا صابرہ زیدی کی تقلید کرتے ہوئے وومن کالج میں ایجوکیشن کی ایک خالی سیٹ پر ملازمت کی درخواست دی۔ شروع میں شوہر نے ملازمت کی مخالفت کی مگر بعد میں مان گئے۔ آزاد زندگی گزارنے کا پہلا قدم معاشی طور پر مستحکم ہونے کی کوشش تھی۔ وہ اپنی پیشہ وارانہ ملازمت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:"اپنے سسرال کے خاندان میں پہلی عورت تھی جس نے یہ جرات کی تھی اس بغاوت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اگلی نسل کی لڑکیوں نے ہندوپاک میں پروفیشنل زندگی اختیار کی۔"(۱۸) مزید تعلیم کے لیے مصنفہ کو ڈگری ویریفیکیشن کے بعد ٹیچنگ

کا کام بھی مل گیا۔ڈگری مکمل کرنے کے بعد ساجدہ زیدی کی ملازمت میں ترقی ہوئی اس کی پروفیشنل، ادبی اور تخلیقی زندگی تھی۔اسے علمی اور ادبی دنیا میں اقتدار اور شہرت دونوں ملیں مگر ان کی صلاحیت سے کم تھیں۔

ش۔فرخ کی تعلیم ابھی مکمل ہوئی ہی تھی کہ گورنمنٹ کالج فاروویمن منٹگمری کی طرف سے عارضی ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ڈھائی سوماہانہ تنخواہ تھی جو اس وقت کے لحاظ سے معقول تھی۔یہاں پر رشتے داروں کے گھر قیام کیا۔ایک دوست سے ملنے کراچی گئی تو وہاں پر لیکچرر شپ کی آفر ہوئی جس کی تنخواہ پانچ سو روپے تھی۔یہاں آکر ش۔فرخ خود مختار زندگی سے شناس ہوئی۔وہ اپنے تمام اخراجات پورے کر کے اپنے چھوٹے بھائی کی کالج فیس اور دوسری ضروریات بھی پوری کر لیتی تھی۔دوماہ بعد اسی کالج میں پرنسپل بن گئی لیکن شادی کے بعد کالج مالکان نے ش۔فرخ کی جگہ کسی اور کو یہ سیٹ عنایت کر دی۔شادی کے بعد ملازمت کے لیے مختلف جگہوں پر ملازمت کے لیے درخواست دی۔باقی کی زندگی کو صحافت کے لیے وقف کر دیا۔اخبار اردو، مشرق اور اخبار خواتین میں بطور صحافی خدمات سر انجام دیتی رہی۔مشتاق احمد یوسفی کے مشورے پر عمل درآمد کرتے ہوئے بنیک سے قرض لے کر گھر مکمل کیا۔

افضل توصیف کو بھی تعلیم مکمل ہوتے ہی ملازمت مل گئی۔شروع میں کوئٹہ کالج میں ملازمت کی۔بعد میں پبلک سروس کمیشن پاس کر کے لاہور میں پڑھاتی رہی۔انہوں نے اپنی ملازمت کا بڑا حصہ لاہور میں گزرا۔ان کے نزدیک پڑھانا ایک خوب صورت عمل ہے جس سے انسان نئی نسل کے قریب رہتا ہے۔ملازمت نے ان کے اندر طاقت، حوصلہ اور عتماد پیدا کیا۔اس لیے وہ بڑے اعتماد سے لکھتی ہیں:"بیسویں صدی کی عورت ہوں، میں جو کہ پروفیسر، رائٹر اور جرنلسٹ ہوں۔"(۱۹) انہوں نے چھتیس سال سرکاری نوکری کی۔ان کی ایک دوست نے مذاق کرتے ہوئے کہا:"پیدا ہوتے ہی نوکری کر لی تھی کیا؟"(۲۰) پڑھائی کے دوران جب بھی موقع ملتا ملازمت کر لیتی تھی۔کالج کی نوکری بھی ایم۔اے کا رزلٹ آنے کے فورا بعد مل گئی تھی۔تین مرتبہ پرنسپل بننے کی پیشکش کو ٹھکرایا صرف استاد بن کر طالب علموں کو سچ پڑھایا اس لیے وہ ان کی عزت کرتے تھے۔حمیدہ سالم سے پہلے ان کی بہن صفیہ نے ملازمت شروع کی جسے سخت قسم کی معاشرتی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔لڑکیوں سے نوکری کروانے کا آرام ہی آرام ہے۔پھر حمیدہ سالم کے لیے ترقی کے راستے کھل گئے۔انہوں نے تقریبا دس سال تک کرامت حسین کالج میں پڑھاتی رہیں۔پھر پانچ سال تک علی گڑھ یونی ورسٹی میں تدریس فرائض سر انجام دیئے۔اس لیے وہ کہتی ہیں اب گھر تھا، ملازمت تھی، میاں کی ریڈر شپ تھی۔

نثار عزیز بٹ کے علاقے میں لڑکیوں پر بہت سی پابندیاں عائد ہوتی تھیں۔ ان کو پڑھانا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا ملازمت تو دور کی بات ہے۔ نثار عزیز بٹ نے شروع میں ایک کالج میں لیکچرر کی ملازمت کی مگر چھوڑ دی اس کے بعد ایک سکول میں ملازمت کی پیش کش ہوئی مگر خرابی صحت کی وجہ سے نہ پڑھا سکی۔ اس کے بعد پشاور میں ریڈیو سے منسلک رہی۔ وہ نقاب اوڑھ کر پروگرام کر کے سرکاری گاڑی میں واپس آجاتی۔ ایک دن کسی کام کے سلسلے میں یوسف بنگش کے کمرے میں گئی کمرہ خالی تھا مصنفہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگی تو بنگش صاحب نے کہا اصغر صاحب بیچلر ہیں اس لیے بہت ساری لڑکیاں پر امید انداز میں بیٹھی رہتی ہیں۔ یہ سنتے ہی مصنفہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں وہ پر امید لڑکیوں میں شمار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ جب ان کے والد صاحب بیمار ہوئے تو مصنفہ سے کہا کہ مجھے سے اب گھر کا خرچہ پورا نہیں ہوتا میں اب تھک چکا ہوں تو مصنفہ نے کہا آپ فکر نہ کریں میں سارا خرچہ اٹھاؤں گی۔ ریڈیو میں بیس پچیس روپے ایک پروگرام ملتے تھے۔ انگریزی اخبار میں انگریزی زبان میں ادبی کالم لکھتی رہیں۔ مختلف سیمینار میں شرکت کرتی رہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد زہرا داؤدی کے لیے ملازمت کرنا مجبوری بن گئی۔ وہ مغربی بار کونسل میں ایڈووکیٹ رہیں اور ای۔ سی۔ ایچ کالج میں بطور لیکچرر رہی۔ شوہر کی وفات پر ایک ہفتے کی چھٹی ملی اسی ہفتے پرنسپل نے وارننگ لیٹر بھیجا کہ کالج آؤ ورنہ نوکری سے فارغ ہو۔ اس وقت مصنفہ کے چار بچے زیر تعلیم تھے روزی روٹی کا کوئی اور انتظام نہ تھا وہ نوکری کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔ شوہر کے ایک ماہ بعد ان کے بڑے بھائی وفات پا گئے بھائی کے انتقال کے روز چھٹی کی تو پرنسپل آفس میں طلبی ہوگئی۔ پرنسپل نے کہا: ”آپ کے یہاں ہر روز لوگ مریں گئے تو کالج چھٹی نہیں دے سکتا۔“[۲۱]

ان کو پارٹی میں شمولیت اور مجیب الرحمن کے ساتھ حمایت کا پتا چل گیا تھا اسی لیے انھوں نے ۱۹۶۷ء میں بائیں باوز کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے بہانہ بنا کر برخاست کر دیا گیا۔ صغرا مہدی نے اپنی ملازمت کا آغاز اپنی ممانی کی خواہش پر ہولی فیملی ہسپتال میں نرسنگ سے کیا، پھر بی۔ ایڈ کرنے کے بعد ایک سکول میں ملازمت شروع کی۔ جہاں پر ان کو حساب پڑھانے کو کہا گیا جو کہ ان کا مضمون نہ تھا صغرا مہدی اپنا موقف محکمہ تعلیم کے افسر کے پاس لے گئیں پھر ان کے کہنے پر سماجیات پڑھاتی رہیں۔ ۱۹۶۲ء میں بلی ماران ہائی سکول میں تبادلہ بطور اردو لینگو یج استاد ہوا جو چشمہ ہائی سکول کہلاتا تھا یہاں کا ماحول دوستانہ تھا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد ریڈیو میں اسکرپٹ رائٹر کی نوکری ملی اس امید پر کہ یہاں پر مستقل ملازمت ہو جائے گی مگر اسے نہ ہوا اور ایک ہی سال بعد یہ نوکری چھوڑنی پڑی۔ صغرا مہدی نے دہلی کارپوریشن کا سکول چھوڑ کر اسلام اینڈ ماڈرن ازم سوسائٹی میں سات سال تراجم کا کام کرتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل کی۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پڑھاتی رہی۔ وہاں پر قرۃ العین حیدر نے بھی عارضی بنیاد پر پروفیسر کی ملازمت کی۔ وہ صالحہ عابد حسین کے گھر آتی رہتی تھی وہاں

پر مصنفہ کی بھی اس سے دوستی ہو گی۔ اسی یونی ورسٹی میں مظفر حنفی اور شمیم حنفی جیسی قابل شخصیات سے بھی دوستانہ تعلقات رہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات سیمیناروں میں ہو جاتی تھی۔ اسی ادارے میں انھوں نے بہت سی تخلیقی اور تحقیقی خدمات سر انجام دیں۔یوں صغرا مہدی نے اپنی ممانی کے خواب کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔ اسی لیے ڈاکٹر فوزیہ خانم لکھتی ہیں:"یہ خود نوشت گاؤں کی ایک عام سی لڑکی کی ہے جو اپنی جدوجہد اور بزرگوں کی سرپرستی سے اعلی مقام تک پہنچی اور اپنے خاندان کا سہارا بنی۔"(۲۲)

کشور ناہید نے شادی کے بعد بیس سال کی عمر میں تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کی۔نوکری کے آغاز میں ہی مارشل لگ گیا۔۱۹۸۰ء میں وہ پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹ کی ڈائریکٹر رہی بعد میں ان کو ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن لاہور میں لگا دیا گیا۔وفاقی وزیر انفارمیشن نے اپنے تعصب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:"کشور کے بغیر کون سا یہ منسٹری رک جائے گی بہتر ہے اسے گھر پر ٹھہرنے کا موقع دیا جائے۔"(۲۳)

روز نامہ جنگ میں کالم لکھتی تھی۔ماہ نور رسالے کی ادارت کے فرائض بھی سر انجام دیتی رہی۔ریڈیو اور ٹیلی وژن کے بہت سارے پروگرام کیے۔عورتوں کی تنظیم سے وابستہ رہی۔۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء کے درمیان شاہدہ شمیم حیدر نے برٹش اینڈ پروفیشنل وومن کلب کی ابتداء کی۔کشور ناہید اس کلب کی صدر رہی۔۱۹۸۸ء میں انھوں نے عورتوں کی فلاح کے لیے ایک ادارہ "حوا" کے نام سے بنایا جو لاہور اور اسلام آباد میں ہے۔اس تنظیم کے تحت گھریلو دست کاریوں کا سامان بیرون ممالک کی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا ہے۔کشور ناہید یونی سیف کے پروگرام "عورتوں کی بحالی" کے تحت پچاس سے زائد ممالک کے دورے کر چکی ہیں۔۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء تک ڈائریکٹر جنرل کے طور پر "اردو سائنس بورڈ لاہور" میں خدمات سر انجام دے چکی ہیں۔۱۹۹۴ء سے لے کر ۱۹۹۸ء تک نیشنل کونسل آف آرٹ کی ڈائریکٹر جنرل رہی۔۱۹۹۸ء میں ان کا زبردستی تبادلہ کروا دیا گیا تو انھوں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی۔ انیس ہارون نے شروع میں ایک پرائیویٹ سکول میں نویں دسویں جماعت کے بچوں کو پڑھایا۔صحافت میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھلائے۔"اخبار خواتین" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی پیش کش تین سو ماہوار پر ہوئی۔نوکری اور سیاست میں توازن کا برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔لیکن جہاں پر لگن اور جوش ہو وہاں سب ممکن ہے۔ان کے سٹاف ممبر میں شین فرخ، طلعت اشارت، شمیم اختر، نسیم شاد اور امداد نظامی شامل تھے۔ایڈیٹر نصیر صاحب تھے جو پڑھے لکھے اور دور اندیش انسان تھے۔

انیس ہارون کو والدین ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور وہ خود فارن سروس میں بطور آفیسر کام کرنا چاہتی تھی مگر ان دنوں فارن سروس میں لڑکیوں کو ملازمت کی اجازت نہیں تھی۔ آر۔سی۔ڈی کے اسکالر شپ پر ترکی جانے کی اجازت نہیں دی گئی اس طرح لڑکیوں کے ہاتھوں سے بہت سے مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ایل۔ایل۔بی میں پہلی

پوزیشن لینے پر والد صاحب تو بہت خوش ہوئے البتہ والدہ نے کہا اگر ڈاکٹر بنتی تو زیادہ اچھا تھا۔اس کے بعد انیس ہارون نے سیاست اور صحافت دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلی۔بچے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ نوکری چھوڑ دی بعد میں بیٹی کی رخصتی کے بعد ۲۰۰۰ء میں انیس ہارون نے عورت فاونڈیشن میں کام کرنا شروع کیا۔جس کی ریجنل ڈائریکٹر بن گئی۔عورتوں کے حقوق کا تعلق دفتری اوقات کار کی حد تک نہیں ہے بلکہ آس پاس جو کچھ عورتوں کے ساتھ ہو رہا ہے اسے دیکھنا بھی ضروری ہے۔عورت فاونڈیشن کی سیٹزن ایکشن کمیٹیاں صوبے کے تمام اضلاع میں موجود ہیں کہیں بھی زیادتی یا تشدد کا واقعہ ہو تو کمیٹی کے ممبر فوراً اطلاع دیتے تھے اور عملی کاروائی کرتے تھے۔کئی خواتین تشدد سے بچ گئی۔ملزم پکڑے گئے عورتوں کو قید سے رہائی دی گئی،پسند کی شادی کرنے پر سزا سے روکا گیا۔اسلام آباد کے ایک کمرے سے شروع ہونے والی عورت فاونڈیشن ۱۹۸۶ء نے بہت جلد قومی این جی اوز بن گئی۔عورت فاؤنڈیشن کی ڈائریکٹر کی حیثیت سے ان کا کام پورے سندھ میں پھیلا ہوا تھا جہاں بھی خواتین کے خلاف زیادتی کے واقعات ہوتے عورت فاونڈیشن فوری طور پر ایکشن لیتی۔کیوں کہ خواتین کے حقوق بھی انسانی حقوق سے تعلق رکھتے ہیں۔بعد میں نیشنل کمیشن کی چیئر پرسن بنی۔۲۰۱۳ء میں کابینہ کا حلف لیا جس کے تحت وزیر ترقی نسواں اور حقوق انسانی کے دو قلم دان ملے۔لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ پارٹی کے ساتھ گہرے مراسم ہونے کی وجہ سے ان کو عہدے ملے ہیں۔وہ اس بارے میں لکھتی ہیں کہ:

> "نہایت ہی کم عمری میں پیپلز پارٹی ویمنز ونگ کی جنرل سیکرٹیری بننا تھا یا لاء میں پہلی پوزیشن آنا یا اخبار خواتین کی نوکری ہو یا عورت فاونڈیشن کی یا کمیشن کی چیئر پرسن بننا ہو یا وزیر۔مجھے اعتراف ہے کہ یہ سب چیزیں مجھے ذاتی کوشش کے بغیر ملی ہیں۔"(۲۴)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی معاشرے کی ترقی نصف آبادی کے بغیر ادھوری ہے۔موجودہ دور میں خواتین کے اندر اپنے حقوق کا شعور بھی بڑھ رہا ہے۔وہ اپنے نامساعد حالات کے تحت اپنے کنبے کی کفالت کے لیے اپنے شوہر کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔بہت سے معاشروں میں خواتین شوہر کی اجازت کے بغیر ملازمت نہیں کر سکتیں بلکہ بہت سی خواتین شوہروں کے کہنے پر ملازمت کو چھوڑ دیتی ہیں۔نو آبادیاتی نظام کے تحت عورتوں کو مردوں کے برابر ملازمت کے حقوق ضرور دیئے گئے مگر ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔عورتوں کو ہمیشہ چھوٹے عہدوں پر کم تنخواہ میں رکھا جاتا ہے ۲۰۱۴ء کی ایک رپورٹ کے مطابق:"خواتین صرف ۲۴ فیصد سینئر سطح کے عہدے تک پہنچ سکیں۔"(۲۵)

ج۔جدید شہری منظر نامہ:

شہریت لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عوام کے ہیں۔ شہریت سے مراد ایسی حالت جو شہری کو دی جاتی ہے شہریت کا تصور قانون کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔خاص طور پر سیاسی حقوق کے حوالے سے، جس کے بغیر فرد ریاست کے امور میں مداخلت نہیں کر سکتا اس لیے ارسطو کے مطابق شہری وہ ہے جو ریاست کی سرگرمیوں میں شریک ہو، ارسطو نے ہی سیاست اور معاشرت کے باقاعدہ اصول وضع کیے۔ شہریت سے مراد وہ حقوق و فرائض ہیں جو کسی ریاست کے شہری کو لازمی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ روایتی اور تاریخی طور پر بچوں اور مزدوروں کی طرح خواتین کی بھی شہریت نہیں مانی جاتی تھی۔ ارسطو عورت کو مرد کے برابر کام کرتے ہوئے بھی دیکھنا چاہتا تھا اس کے باوجود عورت کو مکمل شہری حقوق دینے کا قائل نہیں تھا۔ وہ عورت کو غلاموں، مزدوروں کی فہرست میں شامل کرتا تھا اس لیے وہ ان کو تیرہ سال کی عمر میں امور خانہ داری کی طرف مائل کرنے کا حامی تھا۔ وہ ان کو تعلیم بھی اخلاقی کہانیوں کی حد تک تعلیم دینا چاہتا تھا، اس کے علاوہ وہ عورت کی حکمرانی کے خلاف تھا۔ وہ اپنی کتاب مثالی ریاست میں لکھتا ہے کہ: ”غیر یونانی عورت اور غلام کو ایک جیسا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے پلے وہ چیز نہیں ہے جو فطری طور پر حکمرانی کے قابل بناتی ہے۔“[۲۶] سترھویں صدی میں پڑھی لکھی عورتوں کی توہین کی جاتی تھی۔ فرانسیسی دربار میں تعلیم یافتہ عورتوں کو تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ علم حاصل کرنے اور سائنسی انکشافات کو منعکس کرنے والی عورتوں کو اپنے ڈراموں میں بدصورت اور قابل نفرت کردار دیئے جاتے تھے بہت سے ممالک میں عورت کو ووٹ دینے کا حق بہت دیر بعد دیا گیا۔ برصغیر میں جدید طرز کی قومی ریاست کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہوا اس سے پہلے بادشاہت کا دور تھا۔ شہری حقوق اور آزادی کی اقدار کا مسلہ جدید تقاضوں اور مادی وسائل کی پیداوار ہے کیوں کہ جاگیر دارانہ نظام میں شہری حقوق اور آزاد اقدار کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اسی لیے اٹھارویں صدی سے ہی نئی شہریت کا آغاز ہوتا ہے۔ کسی ایک سلطنت میں مختلف قومیں رہتی ہیں جن کی زبانیں اور مذاہب مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی ریاست کسی ملک کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ ریاست کا ہر شہری قوم کا باشندہ ہے ہر قوم کے تصورات میں صنفی بنیادوں پر تقسیم کی جاتی ہے جو نسوانیت اور مردانگی کے مخصوص تصورات کی تعمیر کرتی ہے۔ ریاست کی پالیسیوں میں بھی یہ تفریق نمایاں طور پر نظر آتی ہے جیسے عورت گھریلو کام کرے اور مرد باہر کے معاملات کو سرانجام دے۔ ترقی پذیر ممالک میں اس قسم کی سوچ کی حاوی رہتی ہے۔ اسی طرح نو آبادیاتی دور میں برصغیر کے لوگوں نے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اپنائی جس کے تحت انگریزی زبان اور سائنسی علوم

لازمی قرار پائے لہذا برصغیر میں مغربی تعلیم کو مغربی ثقافت کا ذریعہ سمجھتے ہوئے عورتوں کو اعلی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔اس دور میں تین طرح کی سوچ کے حامل افراد پائے جاتے تھے مغربی تعلیم کی مخالفت کرنے والے جیسے اکبر اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے افراد،دوسرے وہ لوگ تھے جو عورتوں کو معمولی دینی تعلیم دینے کے حق میں تھے جیسے سر سید احمد خان اور علامہ اقبال ،تیسرا طبقہ لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی تعلیم دینے کی حمایت کرتا تھا جس میں شیخ محمد عبداللہ ،سید امیر علی کے نام سرفہرست ہیں۔ان میں سے ہی سید امیر علی مرحوم بھی تھے انہوں نے تعلیم نسواں کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

"ایک کو تعلیم دینا اور دوسرے کو جاہل رکھنا ضرر رساں نتائج پیدا کرے گا اگر معاشرے کا ایک حصہ تعلیم یافتہ اور دوسرا جہالت میں غرق ہو گا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یا تو تعلیم یافتہ حصہ اپنی دل چسپی کے لیے بد اخلاق صحبتوں کا متلاشی ہو گا یا اپنی حالت کو نچلے درجے پر رکھے گا۔"(۲۷)

۱۹۰۲ء میں علی گڑھ کے شیخ عبداللہ نے مسلمان عورتوں کی تعلیم کا علم بلند کیا ان کی بیوی بھی حقوق نسواں کی حامی تھی انہوں نے ایک انگلش میڈیم اسکول کھولا جس کی مخالفت کے ساتھ ساتھ حمایت بھی کی گئی۔جس کے ذریعے ایک روشن خیال خواتین کی کھیپ تیار ہوئی جن میں سروجنی نائیڈو، بیگم عباس،لیڈی ہارون عبداللہ اور عطیہ فیضی شامل تھیں اسی دور میں خواتین کی کانفرنس بھی ہوئی۔۱۹۲۰ء تک متعدد خواتین اسکولوں ،کالجوں اور اہسپتالوں میں کام کرنے لگیں ۱۹۲۸ء میں عورتوں کو ووٹ کا حق ملا۔۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ میں نو قومی اسمبلی کی نشتیں خواتین کے لیے مخصوص کی گئیں۔تحریک آزادی میں بھی خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس دوران خواتین جلسے کرتی رہیں ان میں حصہ لیتی رہیں اور گرفتاریاں دیتی رہیں۔قیام پاکستان کے بعد جمہوری حکومتیں کم اور مارشل زیادہ لگے جس کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ہوا۔پاکستانی شہریت کا تقاضا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو ایک جیسے شہری حقوق دیئے جائیں۔جس میں جمہوریت اور مذہبی قومیت اہم کردار ادا کرتی ہیں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مذہبی قومیت گھریلو رشتوں میں عدم برابری کی حامی ہے جس کے تحت عورت مرد کے برابر نہیں جب کہ جمہوریت تمام شہریوں کے لیے برابر کے حقوق کا تقاضا کرتی ہے تا کہ سب لوگ آزادی سے رہ سکیں۔پاکستان میں مذہبی قومیت کا غلبہ ہے اور پاکستانی شہریت میں سب سے برادور ضیاء الحق حکومت کا تھا جس میں اسلائزیشن کا قانون نافذ کیا گیا۔عورتوں کے حقوق چادر اور چار دیواری کی صورت میں سلب کیے گئے۔اسی لیے ۱۹۸۰ء کی دہائی کو خواتین کی دہائی کا دور کہا جاتا ہے اس دوران بہت ساری تحریکوں نے اپنے حقوق کی بحالی کے لیے تانیثی تحریک میں شمولیت

اختیار کی۔ ہمارے معاشرے میں مردانہ نظام سختی سے لاگو کیا گیا ہے۔ بیوہ اور مطلقہ کے تحفظ کے لیے باپ اور بھائی کا ہونا ضروری قرار پایا۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو یہاں صحت کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں، اسی لیے عورتوں کی شرح اموات زیادہ ہے۔ حمل کی پیچیدگیوں اور زیادہ بچے پیدا کرنے کی وجہ سے مزید بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں عورت کو اس قدر اذیت دی جاتی ہے کہ قانون اس کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ یہاں پر خاندان اور ذات پات کی سیاست ہمیشہ سر فہرست رہی ہے۔ شمالی علاقہ جات اور صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں لڑکیوں کی شادی کے وقت قیمت وصول کی جاتی ہے۔ تحریک آزدی میں حصہ لینے والی خواتین بعد میں بھی متحرک رہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کا سیاست میں حصہ لینا اور نوکر شاہی نظام کے سامنے ناکام ہو کر بھی مقبول رہنا کسی اور سیاسی شخصیت کے حصے میں نہ آیا۔ اس کے بعد بیگم ولی خان، نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کا گراف بلند ہوا۔ پاکستان میں عورتوں کے ووٹ ڈالنے کا رجحان بہت کم ہے ووٹ ڈالنے کا عمل بھی خاندان اور شوہر کے نظریات کی تابعداری کرتا ہے۔ بیوی شوہر اور باپ کی تقلید کرتی ہے۔ غربت، جہالت اور فرسودگی کو ختم کرنے کے لیے بھی عورتوں نے آواز بلند کی۔

طوائفیت، نشہ آور اشیاء کے خلاف بھی عورتوں نے ہی احتجاج کیا کیوں کہ نشہ کر کے گھر آنے والا شوہر بیوی اور بچوں کو زدوکوب کرتا ہے اور ریاست جسمانی تشدد کو گھر کا مسلہ کہہ کر خواتین کو تحفظ فراہم نہیں کرتی۔ خواتین کی بنیادی حیثیت ہی سیاسی حیثیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ خواہ قانون شہادت کا کیس ہو یا دیت ہو یا قصاص کا کیس۔ عورتوں کی سیاسی بیداری ساری دنیا میں ملکی معاملات کو متاثر کر رہی ہے وہ اپنے نام کو معتبر حیثیت دے کر خود کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروا رہی ہیں تاہم سیاست میں آنے کے لیے عورت کو بڑے دل کا مالک ہونا پڑئے گا کیوں کہ اس میں بدنامی، بہتان اور بدکردار جیسے الفاظ کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں عورت کو شہریت اس کے باپ اور شوہر کی بناء پر ملتی ہے اگر کوئی عورت باہر کے ملک میں شادی کر لیتی ہے تو اس کی شہریت ختم ہو جائے گی اسے خاوند کے ملک کی شہریت حاصل ہو جائے گی۔ دوسرے ملک کی شہریت حاصل کرنے کے لیے پہلی شہریت کو منسوخ کروانا پڑتا ہے کسی بچے کی عرفان ذات میں نام، والدیت، سکونت، گلی محلے کے حوالے سے ہوتی ہے۔ میڈ نامی ماہر عمرانیات کے مطابق عرفان ذات کے تین مراحل ہوتے ہیں۔

۱۔ دوسروں کے افعال و حرکات کی نقالی کا مرحلہ

۲۔ غیر منظم اچھل کود

۳۔ منظم اچھل کود

دو سے تین سال کی عمر میں بچوں کو بڑوں کے کردار کی نقل کر کے خوشی ملتی ہے۔لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ کھیلتی ہیں تا کہ بڑی بوڑھی عورتوں کی نقل اتر سکیں۔چار سے پانچ سال کی عمر میں بچے کسی کھیل کے اصول کی پیروی نہیں کرتے اس کے بعد کی عمر میں وہ منظم کھیل کھیلتے ہیں۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی ہے عورتوں سے جو کام لیا جاتا اس کا معاوضہ بھی پورا نہیں دیا جاتا۔

انسانی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شہری منظر نامہ بھی تبدیل ہو گیا۔مادر سری نظام میں عورت قبیلے کا محور و مرکز تھی جس میں مرد کی حیثیت ضمنی تھی۔عورت کو غلام معاشی ضرورت کے تحت بنایا گیا اسی لیے جاگیر دارانہ نظام میں اس کو بھیڑ بکریوں کی طرح ملکیت میں رکھا گیا اور اس کو ایک غلام کا درجہ دیا گیا۔زرعی معاشرے میں اخلاقی اور عبرانی قدریں بر قرار نہیں رہ سکتیں۔صنعتی معاشرے میں اس کی حالت بدل گئی۔عورت کو اپنا کھویا ہوا مقام کسی حد تک حاصل ہو گیا۔جاگیر دارانہ نظام میں زمین،زر اور زن کی طرح عورت کو بھی بھیڑ بکریوں کی طرح سمجھا جانے لگا۔ان کے تحفظ کے لیے سخت قوانین بنائے گئے۔بغاوت،غداری،ڈاکہ اور زنا کی سزا تھی۔ان جرائم کے شخصی املاک خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

تنگ دستی کی وجہ سے آٹھ دس سال کے بچے اور حاملہ عورتیں بیس بیس گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے۔انہیں اس بات کا احساس نہ تھا کہ نئی وضع کردہ غلامی پہلے سے بھی کئی درجے زبوں تر اور بدتر ہے۔مذہبی پیشواؤں اور عصمت فروشوں نے عورتوں کا استحصال کیا۔

جمہوری ممالک میں سرمایہ دار عیاشی کرتے ہیں اور مزدور محنت کرتے ہیں۔جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں عوام کی آزادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔انسان آزاد پیدا ہے مگر اس کو قید کرنے والے عناصر میں تہذیب،تمدن اور جدید علوم ہیں جب کہ فطرت کے قریب رہ کر انسان قدر آزاد تھا۔اس سے دور ہو کر قید میں مبتلا ہوا جس میں علاقوں کی تقسیم کے لحاظ سے شہریت کو تسلیم کیا گیا۔کسی شخص کی ایک سے زیادہ شہریت بھی ہو سکتی ہے۔کچھ لوگوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔شہریت کے ساتھ دوسرا لفظ قومیت کا بولا جاتا ہے۔قومیت سے مراد وہ جگہ جہاں پر کوئی فرد پیدا ہوا ہے جبکہ شہریت کوئی اور بھی ہو سکتی ہے جیسے پاکستان کے شہری کی شہریت برطانیہ ہو سکتی ہے مگر قومیت پاکستانی ہی رہے گی اسطرح شہریت بدل سکتی ہے قومیت نہیں۔نو آبادیاتی نظام کے تحت مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی آگے بڑھنے کے مواقع میسر آئے جنس اور صنف کے تحت جدید شہری اصول مرتب کیے گئے عورتوں کو مردوں کے برابر ملازمت کے مواقع فراہم کیے گئے۔اس کے باوجود بھی کچھ معاملات میں ریاستی ادارے مذہبی احادیث اور آیات کا سہارا لے کر عورتوں کا استحصال کرتے رہے۔کسی ملک کی

ترقی کے لیے نچلے طبقے کو اہمیت دینا بہت ضروری ہے کیوں کہ اعلی شہری اقدار کے لیے اخلاقی اقدار کو فروغ دینا ہو گا تا کہ اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو ختم کیا جاسکے۔ اسی لیے روبینہ سہگل اعلی شہری اقدار کے لیے جدید سوچ کی حامی ہیں ان کے مطابق: "فرسودہ روایات اور قدیم رسم ورواج کو ترک کر کے جدید سوچ اور زمانے کے ساتھ روشن خیال انداز میں چلنا ضروری ہے۔" (۲۸)

بیگم شائستہ اکرام اللہ کے مطابق ۱۹۳۸ء میں بننے والی کمیٹیوں کے انتظامات ان کے سپرد کیے گئے قیام پاکستان کے وقت ٹرینیں روک دی گئیں۔ لوگ پیدل سفر کر رہے تھے۔ پشاور ایکسپریس میں تقریباً چھ ہزار افراد مارے گئے۔ ان کی مہاجرین کیمپ میں دوسری خواتین کے ساتھ ڈیوٹی لگی۔ وہ دوسری خواتین کے ساتھ مل کر زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی۔ اپنے ڈوپٹے پھاڑ پھاڑ کر زخموں پر باندھتی رہی۔ کیمپ میں دلخراش داستانیں چل رہی تھیں یہ بہادر خواتین ان داستانوں کے کرداروں کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر رہی تھیں۔

قرۃ العین کے جدید شہری منظر نامے میں عورت مرد کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر میدان میں سرگرم عمل ہے۔ عورت کی ذات اور اس کے کردار کو جدید شہری منظر نامے کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ جس میں اپنے ساتھ ساتھ دوسری ابھارتی ہوئی خواتین کا بھی ذکر کیا ہے۔ انیسویں صدی کا دور عورتوں کے لیے جدید شہری منظر نامے کا دور تھا جس میں خواتین نے چندہ اکٹھا کر کے ایک انجمن حامی نسواں قائم کی۔ وہ ماضی اور حال کی شہری اقدار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایک دور میں خواتین کو پی۔ آئی۔ اے میں ملازمت کی اجازت نہیں ملتی تھی مگر اب معاشرہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اچھے اچھے خاندانوں کی خواتین پی۔ آئی۔ اے میں ملازمت کے حصول کے لیے آرہی ہیں۔ ان کی بھانجی نور افشاں نے ائیر فورس کو جوائن کیا۔

نہٹور اور لانکڑی کی لڑکیاں فوج، ٹیکسٹائل ملز اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں قدم جما رہی تھیں۔ کوئی لندن یونی ورسٹی میں پڑھائی کے لیے جا رہی تھی۔ شائستہ اکرام اللہ ۱۹۴۰ء میں لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اردو میں ڈاکٹریٹ کیا۔ کراچی میں فارن سیکرٹری، باہر کے ممالک میں ہائی کمشنر اور سفیر رہیں۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کی مندوب کے فرائض پر تعینات رہیں۔ ضیاء محی الدین کی بیوی سرور جو بھوپال کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں وہ میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ شیما کرمانی پاکستان میں رقص کی کلاسسز لیتی تھی تقریباً چالیس لڑکیاں ان کی شاگرد تھیں۔ اس لیے قرۃ العین حیدر کے بارے میں ایم سلطانہ بخش نے لکھا کہ: "قرۃ العین حیدر کے ہاں آزادی نسواں کا ایسا تصور ملتا ہے جس میں لڑکیاں لڑکوں کے برابر ہیں، بلکہ بعض صورتوں میں لڑکوں کو کاٹتی ہوئی آگے نکل رہی ہیں۔" (۲۹)

ان کی آپ بیتی سے عصمت چغتائی کا جو کردار ابھرتا ہے وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے والی جدید عورت ہے جس پر گھر، خاندان، سماج اور پورے طبقہ نسواں کی ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر عائد ہوتی ہیں۔ جدید عورت کے شہری منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے ادا جعفری لکھتی ہیں کہ معاشرہ آج بھی مرد کا ہی ہے عورت ذاتی طور پر اب بھی بہت کچھ برداشت کر رہی ہے بہت سی ناانصافیاں اب بھی اس کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ ان زیادتیوں کے صرف انداز بدلے ہیں۔ پہلے وہ گھر کی چاردیواری میں مقید غلامانہ زندگی گزار رہی تھی مگر اب وہ معاشرتی مسائل کا ادراک رکھتے ہوئے بھی دکھوں کی گٹھری اٹھائے ہوئے ہے پھر بھی جینے کی سکت رکھتی ہے۔

نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے عورت اب گھر کی چاردیواری کی حد تک محدود نہ تھی ان میں پڑھنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا حمیدہ سالم کے مطابق اس دور میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں زیادہ تر لڑکیاں مقامی تھیں ٹھیلوں پر اسکول جاتی تھیں دور کی لڑکیاں بس کے ذریعے یونی ورسٹی جاتی تھیں۔ بورڈ کے امتحان میں دو ٹیچرز کو لڑکیوں کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔ اس دور میں زیادہ تر خواتین تدریس کے شعبے سے منسلک تھیں۔ کچھ خواتین پردے میں ہی سارا دن رہتی تھیں۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری اپنی آپ بیتی میں عورتوں کے حوالے سے جدید شہری منظر نامے کا نقشہ رشید جہاں اور اس کے شوہر محمود الظفر کی صورت میں پیش کرتی ہیں ان کے بھائی اور دو دوست باہر کے ملک اعلی تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان گئے۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں زہرہ اور عذرا کو تھیٹر میں کام کرنے کی اجازت دی۔ ان کا کہنا تھا جب قدرت نے انہوں ناچ اور ایکٹینگ کی اجازت دی ہے تو میں کیوں روکوں۔ بعد میں زہرہ کی شادی ایک ہندو سہگل سے ہوئی اور عذرا کی حمید بٹ سے ہوئی۔ وہ بمبی میں رہنے لگیں اور پھر پاکستان میں آکر ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے لگیں۔ اس خاندان کی چار نسلیں ایک ساتھ اداکاری کرتی رہیں۔

نثار عزیز بٹ اپنے اور موجودہ دور کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ہمارے وقت کے ہیرو لوگ مرنجان، شریف النفس اور حلیم طبع تھے جبکہ آج کل کے ہیرو شہروں کے شہر تباہ کر دیتے ہیں اسی وجہ سے ہماری امید نے مایوسی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ہمارا اقدار نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ پشاور اور کراچی کے کالج کا ماحول بھی بہت مختلف تھا پشاور کے فرنٹیر کالج کا ماحول گھٹا گھٹا تھا جب کہ کراچی کی چکاچوند اور چہل پہل سے معمور زندگی تھی۔ دوسری جنگ عظیم اور صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان کا تمدن بہت بدل چکا تھا۔ گھریلو نوکر عنقا تھا۔ صرف امراء ہی نوکر رکھ رہے تھے عام گھروں میں سب کام خود ہی کر لیے جاتے تھے مکان فلیٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ایک کانفرنس میں ایک باسٹھ سالہ خاتون سارے انتظامات سنبھال رہی تھی اس کا شوہر تین حادثات کا شکار

ہو کر ٹانگوں سے معذور تھا اسکے دو بیٹے جو شادی کے بناء ہی عورتوں کے ساتھ رہ رہے تھے یہ بات اس خاتون کو پسند نہ تھی۔ وقت نے انسان کے سوچنے کے انداز ہی بدل دیئے۔ ش۔ فرخ لکھتی ہیں کہ جدید سہولتوں کے نتیجے میں شرقی اور مغربی معاشرے میں کرپشن بڑھی گئی ہے جس کے نتیجے میں تشدد، خوف وہراس ہماری زندگی کا حصہ بن گئے ہیں۔

صالحہ عابد حسین نے علی گڑھ کی خوب صورت یادوں کو بڑی دلکشی سے بیان کیا جب نیا شہر، نئے لوگ، نئ بستیوں میں تعلیم کا انتظام تھا۔ ان کے خاندان میں زیادہ تر خواتین ادیب تھیں۔ ان کی پھوپی ظل سلطان مضمون لکھتی تھی۔ بڑی بہن فاطمہ زیدی شاعرہ تھی۔ منجھلی بہن سیدہ رسالوں میں مضمون لکھتی تھی اور فارسی کی ایک کتاب کا انہوں نے ترجمہ کیا۔

سعیدہ احمد کی آپ بیتی "ڈگر سے ہٹ کر" میں جدید عورت کا تصور پیش کی گیا ہے۔ اس میں تین تہذیبوں بھوپال، لکھنو اور دہلی کا منظر نامہ نظر آتا ہے جو اپنے نامساعد حالات میں بھی ہمت نہیں ہارتی۔ سلطان جہاں بیگم نے بھوپال پر حکومت کی۔ وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ عقل وفہم میں کسی طور پر بھی کم نہیں۔ عورت کو تاریکی کے اندھیرے سے نکالا جائے۔ اس لیے انہیں عورت کی تعلیم کی فکر تھی وہ ان کو چاردیواری میں بند نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انہوں نے خواتین کے اصل نام لکھنے کی اختراع ڈالی۔ عورتوں کے لیے گوٹ کے نام سے کلب بنایا۔ مصنفہ کی بہن نے ۱۹۱۷ء میں میٹرک کیا۔ اس زمانے میں کسی لڑکی کا اتنا پڑھ جانا بڑی انوکھی بات تھی۔ اس طرح تعلیم کے دروازے عورتوں پر کھل رہے تھے اسی وجہ سے مصنفہ کا داخلہ کالج میں ممکن ہوا۔

عطیہ داؤد کے بھائی نے اپنی روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں ایک جدید عورت کا تصور پیش کیا اور کہا لڑکیوں کا مقدر صرف شادی کر کے بچے پالنا ہی نہیں بلکہ شہروں میں تو لڑکیاں ڈاکٹر، انجینئر بنتی ہیں گاڑی خود چلاتی ہیں۔ اعلی تعلیم حاصل کرنے بیرون ملک جاتی ہیں۔ اب ان کے بھائی کی ان باتوں نے عطیہ داؤد کو مستقبل کی راہ ہموار کرنے میں مدد دی۔ جدیدیت کی آڑ میں آنے والے مثبت اور منفی رویوں کا تفصیلی منظر نامہ بھی پیش کیا۔ ایک لڑکی گاؤں سے جب شہر میں اعلی تعلیم کے حصول کے لیے آتی ہے تو اسے گاؤں کے لوگوں کی سخت مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کے لیے سخت محنت کرتی ہے اس کے عزم واستقلال کو دیکھ کر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کو شہر میں اعلی تعلیم کے حصول کے لیے بھیجتے ہیں۔ انقلابی جدیدیت کی آڑ میں اس کے ساتھ زنا کرتے ہیں تو وہ اکیلی لڑکی کیا کر سکتی ہے؟ زنا کا مقدمہ کیسے دائر کروائے؟ شہر میں کون اس کو جانتا ہے۔ مجبور ہو کر اور نفرت کے باوجود وہ اس انقلابی کی دوسری بیوی بننے پر راضی ہوتی ہے۔

عطیہ داؤد ایک صحافی خاتون کو انٹرویو دینے کے لیے اسے اپنے گاؤں کا سفر کرنا پڑا۔ گاؤں کا یہ سفر فتح اور کامیابی کا سفر تھا جس میں اس نے ایک نئی عورت کے شہری منظر نامے کا بدلتا ہوا تصور پیش کیا۔ وہ روایتی رسم ورواج سے انحراف کرتے ہوئے اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی سے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ: "ایک ایسی عورت بننے کے لیے جو آزادی سے اپنی زندگی آپ جینے کا حوصلہ رکھتی ہو اور اپنی بیٹیوں کو اچھا مستقبل دے سکتی ہو۔ تاکہ وہ بھی اپنی زندگی آزادی سے جینے کا لطف اٹھا سکیں۔"(۳۰)

افضل توصیف نے اپنے روشن خیال والد کو اپنے قبیلے کا جدید انسان کہا جو بیٹیوں کو کتاب پڑھاتے اور سوال حل کرنا سکھاتے تھے۔ افضل توصیف کے مطابق پاکستان میں پیدا ہونے والی خرابیوں میں ایک خرابی یہ ہے کہ ہم نے شہروں، سڑکوں، محلوں اور اداروں کے اصل اور تاریخی نام بدل کر الٹے سیدھے رکھ دیے۔ نئی کالونیاں فلیٹوں کی ہیں جہاں شہر کے ستر فی صد معززین کی رکھیلیں رہتی ہیں۔ ان سیٹھوں کی بیویوں نے بھی اس حقیقت کو مجبوراً تسلیم کر لیا ہے۔ جس عورت نے فلیٹ کا دروازہ کھول کر سیٹھ جی کو اندر بولا لیا وہ ہی اس کی اصل رکھیل ہے خواہ وہ ایک رات ہی کی کیوں نہ ہو۔ رکھیلیں بدلنے کا رواج بھی عام ہے۔ لوگ اب ایک ہی کھلونے سے بور نہیں ہوتے۔

ساجدہ زیدی کے مطابق طلبا اور طالبات کی مشترک نمائندگی پردے سے آزادی کی کوشش، فوک سونگ کے پروگراموں کی پیش کش بائیں باوز کے خیالات کا نتیجہ تھیں۔ یہ بھی روایت کی جکڑبندیوں سے بغاوت بھی تھی۔ پردے کی پابندی اور برقع کی قیود سے آزادی کی جنگ دنیا کے زیادہ تر حصوں میں آج بھی جاری ہے۔ اٹلی میں بھی روایت پرستی اور قدامت پرستی کا عام چلن تھا۔ زبان وادب کے سلسلے میں جدیدیت بعض اوقات مہمل گوئی ،لفظ وزبان کا قتل اور بدہیئتی کی صورت نمودار ہوتی ہے ایک مقام پر پہنچ کر اس کے حامی بھی خود خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ مرد اور عورت کی دوستی کے بارے میں ساجدہ زیدی ورجینا وولف کے موقف کی حامی ہے کیوں کہ مرد جنگ جو ہے اور عورت امن پسند۔ مرد اپنے صدیوں پرانے تعصبات پر قابو پا سکتا ہے مگر پدرسری نظام کے تحت وجود آنے والے سماج میں یہ ممکن نہیں۔

کشور ناہید نے جدید اور قدیم شہری منظر نامے کو یوں بیان کرتی ہیں کہ شہروں میں مکان سے فلیٹ بنا گئے جبکہ دیہاتوں میں ٹین کے دروازے اینٹوں والے فرش اور باتھ روم سرکار نے خود نہیں بنائے۔ جدید اور قدیم شہری منظر نامے کو وہ اپنی کتاب کے شروع میں ماضی اور حال کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ میری ایک بہو سپین میں شارٹس، دوسری امریکہ میں سکرٹ پہنتی ہے میری بھانجیاں امریکہ میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں میری ماں ڈولی میں بیٹھ کر سفر کرتی تھی کہاں ڈولی اور کہاں جہاز کا تصور۔ ۱۹۶۰ء کا زمانہ سماجیات اور جنسیات میں تبدیلی کا زمانہ قرار پایا ہے جس کا مطلب صرف جنس نہیں بلکہ امن اور انسانیت کے لیے زندہ رہنا کہا گیا ہے۔

اسلامی قانون نافذ کرنے کے شوق میں ضیاء الحق حکومت نے فحاشی کا نام دے کر کشورہ ناہید کی ترجمہ شدہ کتاب "سکینڈ سیکس" کو ضابطہ کر کے بین لگا دیا۔ وہ اس وقت بیرون ملک میں مقیم تھیں۔ اس کیس میں سزا صرف کشور کو ہی نہیں بلکہ شائع کرنے والے نجم سیٹھی کو بھی سنائی گئی وہ لکھتی ہیں:

"میں ان دنوں امریکہ میں تھی۔ میں نے وہاں اخبار میں پڑھا کہ پہلے صفحے پر بلاک میں میری کتاب بین ہونے کی خبر تھی۔ میں نے دل میں کہا۔۔ چلو یہ الزام بھی سیمون کے توسط کہ یہ کتاب فحش ہے۔ واپس آئی تو ایک طرف وارنٹ گرفتاری، دوسری طرف نجم پریشان۔"(۳۱)

لوگوں کی بدلتی طرز رہائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ شہروں میں لوگ مکانوں سے فلیٹوں تک آ گئے ہیں جب کہ دیہاتوں میں اب کچے مکانوں کی جگہ انیٹوں والے فرش اور خود سے بنائے باتھ روم نے لے لی ہے۔ کشور ناہید اپنے آپ بیتی میں مذہبی ٹھیکے داروں کو بھی بے نقاب کرتی ہیں اور کہتی ہیں پہلے فرعون عبرت ناک اذاتیں دیتے تھے اب وہی عدالتیں مذہبی ٹھیکے دار لگا رہے ہیں۔ پاکستان کی سیاست میں عورت کو مولویوں کے ذریعے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ عورت خواہ محترمہ فاطمہ جناح ہو یا بے نظیر بھٹو ہوں۔ عورت کو مذہب کے نام پر پوری دنیا میں ہر وقت پامال کیا جا رہا ہے۔ وہ خواتین صومالیہ، بوسنیا، فلسطین یا کشمیر ہی کی کیوں نہ ہوں۔ وہ اپنی کتاب کی پہلی جلد میں مشرقی عورت کے استحصال کو بیان کرتی ہیں تو دوسری جلد میں مغربی دنیا کی عورت پر ہونے والے ظلم کو آشکار کرتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل میں ایک بھی عورت کو شامل نہیں کیا گیا یہ ادارہ بغیر انجن کے چل رہا ہے اس میں صرف یہ بحثیں سر فہرست ہوتی ہیں کہ عورتیں کیسا لباس پہنیں اس کی وجہ طالبان کا بڑھتا ہوا تسلط ہے

جدید طرز زندگی میں صرف ہمارا معیار زندگی ہی نہیں بدلا بلکہ بول چال میں بھی ٹیکنیکل الفاظ کا استعمال عام ہو گیا ہے انیس ہارون کہتی ہیں کہ میں نے اپنی پانچ سالہ پوتے سے ڈاؤن لوڈ کی اصطلاح سیکھی ایک دن وہ اپنے پوتے ارژنگ کو کہانی سناتے ہوئے کچھ سوچنے لگی تو وہ اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا 'دادی آر یو ڈاؤن لوڈنگ' اور وہ ہنس پڑی۔ ہماری نئی نسل کی زبان بھی کمپیوٹر ائزڈ ہو گی ہے۔ ان کے شوہر نے بتایا کہ ایک نوجوان اپنے باپ کو ان کے پاس لایا اور شکایت کی کہ یہ بیٹھے بیٹھے ہینگ ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ان کی نسل کو ریڈیو اور ٹی۔ وی کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا۔

انیس ہارون بی۔ اے فائنل ائیر کے بعد میں کالج کی نائب صدر بن گئی فہمیدہ بھی ان کے ساتھ حصہ لینے لگی تھی وہ صرف حیدر آباد نہیں پاکستان بھر کے انٹر کالج تقریری مقابلوں کے لیے شہر شہر جاتی اور انعام جیت کر

لاتی۔ کوئٹہ اور پشاور کے وویمنز کالجز میں بیدار ہونے پر کھڑکی سے سائیکلوں کی قطاریں دیکھی تھیں۔ انیس ہارون نے حیران ہو کر پوچھا اتنی سائیکلیں گرلز کالجز میں کیا کر رہی ہیں؟ کیا کرایے پر ملتی ہیں؟ تو حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ کالج کی بیشتر لڑکیاں سائیکلوں پر آتی ہیں۔ یہ ۱۹۶۰ء کے درمیانی عشرے کی بات ہے کیا آج کوئی تصور کر سکتا ہے۔ لاہور، کراچی، اسلام آباد، حیدرآباد کون سے شہر میں اب یہ ممکن ہے کہ لڑکیاں سائیکلوں کی سواری کریں اب تو مائیں اپنی بیٹیوں کو قرآن اور دعاؤں کے سہارے رخصت کرتی ہیں کہ خیریت سے گھر واپس آئیں۔ صغرا مہدی کا تعلق بھوپال جیسی ریاست سے بھی تھا جہاں پر عورت نے تقریباً تین سو سال حکومت کی سلطان جہاں بیگم کے اصرار پر پکنک کی جگہ کو "گوٹ" کے نام سے متعارف کروایا گیا۔ جہاں پر شادیاں مسجد میں ہوتی تھیں۔ بھوپال کی ہی ایک لڑکی مینو سلطان کا تذکرہ کیا جو موٹر سائیکل پر سوشل ورک کرنے آتی تھی۔ اسی دور میں قدسیہ زیدی نے دہلی میں ہندوستانی تھیٹر قائم کیا۔ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں میں ملازمت کا رجحان بھی بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی طلاق ہونے کی رفتار میں اضافہ ہو رہا تھا اس کی وجہ شعور ذات تھی عورتوں نے اپنی تقدیر سمجھ کر ظلم سہنے سے انکار کر دیا تھا۔ غیر شادی شدہ ماؤں اور بنا شادی کے ایک ساتھ رہنے کے انسٹی ٹیوشن بنا گئے تھے۔ حمیدہ سالم کے مطابق نو آبادیاتی نظام کے تحت صرف تعلیم کا رجحان عام نہیں ہوا بلکہ ملازمت کے راستے بھی کھل گئے۔ تعلیم نے ان کو شعور ذات دیا خواتین نے اپنی تقدیر سمجھ کر ظلم سہنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف مردوں کے پاس زیادہ دولت آنے کی صورت میں پہلی بیوی کو طلاق دی جا رہی ہے اور دوسری سے شادی رچائی جاتی ہے۔ جدید معاشرت میں غیر شادی شدہ ماؤں اور بناء شادی کے ایک ساتھ رہنے کے انسٹی ٹیوٹ بن گئے۔ نفیس بانو شمع جدید شہری منظرنامے کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ پہلے دلہن کے لیے ڈولی لائی جاتی تھی اب کار میں لے جایا جاتا ہے ڈولی سے کار تک کے سفر نے عورتوں کی زبوں حالی کو کم بھی کیا ہے کیا یہ سوال توجہ طلب ہے؟

د۔ ملازمت کے حقوق و پیشگی کا جدید تصور:

پاکستانی معاشرے میں ملازمت پیشہ خواتین دوہرے استحصال کا شکار ہیں ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ عورتوں کی ملازمت کے خلاف ہیں اپنے شوق سے ملازمت کرنے والی خواتین کو عائلی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد ملازمت کے فرائض کی باری آتی ہے اس لیے وہ پیشہ وارانہ اور ذاتی زندگی میں توازن قائم نہیں رکھ سکتیں۔ ان کو ٹرانسپورٹ کے مسائل کے ساتھ ساتھ بس سٹاپ پر جنسی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ دفتر میں جاتے ہی مرد اپنی عینک کے شیشے میں خواتین کو اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دفاتر میں اعلی عہدوں پر فائز نہ ہونے کی بناء پر وہ اپنے افسر کی ماتحت ہوتی ہے جو جب دل آئے جنسی طور پر ہراساں کر سکتا ہے۔ پاکستان تو کیا پوری

دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام نے عورت کو ایک شے کے طور پر متعارف کروایا جس کی قدر و قیمت قابلیت پر کم اور ظاہری شکل و صورت پر زیادہ رکھی گئی۔ آج کل دفاتر میں زیادہ تر ملازمتوں کے لیے نوجوان اور حسین و جمیل لڑکیوں کو چنا جاتا ہے اور خاص طور پر ملٹی نیشنل کمپنیوں میں یہ معیار مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ان جگہوں پر کام کرنے والی خواتین خود کو دل کش بنانے کے لیے کئی کئی دن فاقے کرتی ہیں۔ اپنے جسم کو چست اور چاک و چوبند رکھنے کے لیے تکلیف دے ورزشیں اور ڈائیٹنگ کرتی ہیں۔ اگر وہ اپنے چہرے کی رعنائی اور جسم کی دل کشی کا خیال نہ رکھیں تو وہ ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ زاہد حنا ان خواتین کی ملازمت کو درپیش مسائل کو ان الفاظ میں لکھتی ہیں: ”بڑھتی ہوئی عمر اور گھٹتی ہوئی تنخواہ کے دل خراش معاملے“(۳۲)

وزن کم کرنے کی غیر متوازن ترکیبیں، بھوک کم لگنے اور صحت کے دوسرے مسائل کو ہوا دیتی ہے۔ کھانے پینے سے بے زاری کا یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے جو لمبے عرصے تک کم کیلوریز ملنے کی وجہ سے اعصابی افسردگی اور خود پر قابو نہ پانے والی بیماریوں کا گڑھ بنتا ہے جس سے شخصیت جذباتی اور غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آج کل کی عورتوں کا فیشن مردوں کی تجارت بن گیا ہے۔ مردوں نے اس کے متعلق غیر معمولی جوش و جذبے کو ابھارا اور اسے ایک صفت بنا دیا۔ ڈائیٹنگ اور میک اپ پر خرچ ہونے والے اخراجات کا تخمینہ لگاتے ہوئے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ”۳۳ارب ڈالر سالانہ ڈائٹ انڈسٹری، ۲۰ارب ڈالر سالانہ کاسمیٹک انڈسٹری۔ ۳۰۰ارب ڈالر سالانہ کاسمیٹک سرجری انڈسٹری اور ۷ارب سالانہ پورگرافی انڈسٹری بالکل سامنے کی صنعتیں ہیں۔“(۳۳)

یہ سب استعماراتی تشدد کی مثالیں ہیں جن کا اثر جسم پر پڑتا ہے اسی استعماراتی تشدد نے سگریٹ کو ایک فیشن کے طور پر متعارف کروایا جس نے مشرق اور مغرب کی عورت کو فیشن کی کینز بنا دیا۔ دوسری طرف اگر عورت مرد سے زیادہ کمائے تب بھی جذباتی طور پر احساس کمتری کا شکار ہو کر مرد عورت پر اکثر تشدد بھی کرتا ہے ایسی صورت میں طلاق کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں مرد اپنے افسر سے ڈانٹ کھانے کے بعد اپنی بیوی کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے اور بیوی بچوں پر وہ غصہ نکالتی ہے جبکہ یہ سماجی جبر ہے ظلم جس طرف سے آتا ہے وہاں پر ہی روکا جائے تو تشدد کی صورت بدل جائے گی۔ پاکستان میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں مگر کوئی عملی طور پر دیتا نہیں۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں خواتین کو مذہبی آزادی اور دیگر حقوق دیئے گئے۔ ۱۹۷۷ء کا دور خواتین کے حوالے سے بدترین دور تھا جس میں خواتین کو مخصوص مضامین اور چند اداروں میں ملازمت کرنے کی اجازت

تھی۔اس دور میں اعلی عہدوں پر فائز خواتین کے گرد زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا گیا۔اس کے بعد جنسی طور پر ہراساں کرنے والے افسراں کے لیے چھوٹی بڑی سزائیں تجویز کی گئیں۔خواتین کو ملازمت کے دوران مسائل کے ساتھ ساتھ اچھے مواقع بھی ملتے ہیں۔بہت ساری خواتین صلاحیتیں ہونے کے باوجود بھی اپنے گھریلو مسائل یا سسرال والوں کے کہنے پر اپنی پیشہ وارانہ زندگی کو خیر باد کہہ دیتی ہیں اور پوری زندگی خوش نہیں رہتی۔امریکن فیمنسٹ بیٹی فرائیڈن کے خیال میں ایسی خواتین اپنی ازدواجی زندگی سے ہوتی ان کو آگے بڑھنے کا موقع دینا چاہیے۔۱۸۶۰ء میں ایک زنانہ کالج بنانے کے لیے کمیٹی بنائی گئی اور امیر عورتوں سے چندہ مانگا گیا تو وہ بڑی مشکل سے تین ہزار پاونڈ جمع کر پائیں۔دولت ساری ان کے شوہروں کے پاس تھی۔ان کے پاس ذاتی سرمایہ رکھنا قانون جرم تھا۔۴۸سال بعد ایک قانونی ایکٹ کے زریعہ ان کو سرمایے کا مالک بنایا گیا۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ کی سیاست میں شمولیت کی وجہ سے برطانوی حکومت نے ان کے شوہر کو حکومت کا ملازم ہونے کی وجہ سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ان کے شوہر نے برطانوی سفیر ہونے کی وجہ سے تمام اعتراضات بڑی تسلی سے سنے اور جواب دیا ان کی بیوی سمجھ دار ہے اور ایک سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے میں نہ ان کو روک سکتا ہوں اور نہ روکنے کی کوشش کروں گا۔ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اگر حکومت برطانیہ کو اعتبار نہیں تو وہ ہر وقت استعفا دینے کو تیار ہیں۔۱۹۴۵ء میں انڈین ریاست کی پبلک کانفرنس میں شرکت کو قائداعظم کے مشورے سے ٹھکرا دیا۔ آپ بیتی کا ایک باب "تعلیم نسواں ایک وبال "میں عصمت چغتائی کی ملازمت پیشہ زندگی اور مصروفیات کا ذکر کیا گیا ہے۔وہ لڑکیوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیلوں کی طرف بھی راغب کر رہی تھیں۔ اس دوران ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ لڑکیوں کو لڑکوں والے کھیل سکھا رہی ہیں عصمت چغتائی نے غصے میں کہا سب کھیل بچوں کے ہوتے ہیں اس میں جنس کہاں سے آگئی ؟منیجر صاحب عصمت چغتائی کے اس عمل سے بہت خوف زدہ تھے۔وہ ہر وقت ان کو روکنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتے رہتے۔وہ اپنی بیٹیوں کو پڑھانا چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی ان پڑھ ہونے کی وجہ سے پڑھائی کے خلاف تھی۔انہوں نے عصمت چغتائی سے درخواست کی کہ وہ ان کی بچیوں کو اپنے پاس رکھ کر پڑھائیں۔ان کے ساتھ کچھ اور بچیاں بھی بورڈنگ میں آگئیں۔

سکول کے انتظامی امور کے علاوہ وہ تدریس سے بھی وابستہ تھی۔اس کے ساتھ ساتھ آنے والے ضروری خطوط کے جوابات بھی تحریر کرواتی تھی۔اس دور میں سکول کے نام آنے والی ڈاک کو چیک کیا جاتا تھا کہ کہیں شہر کے اوباش اور لفنگے لڑکے استانیوں اور لڑکیوں کو تنگ تو نہیں کرتے۔اسی باب میں عصمت ماضی اور حال میں بیک وقت سفر کرتی ہیں۔ایک طرف وہ شیخ عبداللہ اور بی اماں کے بورڈنگ سکول کے حالات اور کردار کو مدنظر رکھتی ہیں

دوسری طرف اپنے چھوٹے سے بورڈنگ سکول کو۔بی اماں کے سکول میں بہت سی مجبور لڑکیوں نے پناہ بھی لی ہوئی تھیں جن میں کچھ کی شادی بڑی عمر کے شوہر کے ساتھ ہوئی تھی، کچھ کے شوہروں نے دودو شادیاں کرنے کے باوجود تیسری شادی رچائی تھی پہلی بیویاں اس کو تنگ کرتی تھیں، ایک کاشوہر اور ساس دونوں جسم فروشی کے کاروبار میں دھکیل رہے تھے۔ عصمت چغتائی کے بورڈنگ اسکول کو بھی علی گڑھ کالج کی طرح بند کرنے کی دھمکیاں دی جارہی تھیں۔ عصمت چغتائی زمانے طالب علمی میں ان دھمکیوں سے نہ ڈری اب کیا ان کی پرواہ کرتی۔ڈاکٹر وارث علوی کے مطابق عصمت چغتائی میں جرات اور بے باکی تعلیم کی دین تھی وہ لکھتے ہیں:

"ہم سمجھتے ہیں کہ عصمت کے یہاں بغاوت جدید تعلیم کا عطیہ تھی۔ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بغاوت کی یہ چنگاریاں ظلم و جبر کی اس سنگ باری سے پھوٹی تھیں جس کا ہدف ہندوستانی عورت تھی۔"(۳۴)

عصمت چغتائی کا سکول بھی بی اماں کے سکول کی طرح چندے سے چلتا تھا جس میں بہت سی استانیاں بغیر معاوضے کے پڑھاتی تھیں۔سعیدہ بانو احمد اپنی آپ بیتی میں مرد اور عورتوں کے درمیان میں مساوی تنخواہ کا مطالبہ کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ قدیم دور سے عورتیں زیادہ کام کرتی ہیں مگر اس کو معاوضہ مردوں کی نسبت کم دیا جاتاہے۔وہ لکھتی ہیں:"عورت مرد کی تنخواہوں میں تفریق جب بھی تھی مرد نوکر کو ایک روپیہ مہینہ ملتا تھا۔زنانہ مکان میں سارے کام عورتیں بجالاتی تھیں ایک خادمہ کی تنخواہ آٹھ آنے مہینہ ہوتی تھی۔"(۳۵)

علی گڑھ یونی ورسٹی کے انقلاب کے بعد لوگوں میں عورتوں سے ملازمت کروانے کا رجحان عام ہوا۔ایک طرف لکھنو کا گریجویٹ پوسٹ گریجویٹ سٹاف تھا تو دوسری طرف چوک کی گلیوں میں رہنے والی معمر خواتین اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قرآن شریف، اردو، فارسی، اور سلائی جیسی مہارتیں سیکھنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئیں۔ متوسط طبقے کی خواتین میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی امنگ پیدا ہوئی جن کی مثالیں حمیدہ سالم سکینہ علی ظہیر جو انگریزی کی لیکچرار تھی، رضیہ سجاد ظہیر اردو کی لیکچرار تھی۔ان کی ہم عمر دوست شمیم تھی جن کی اپنے شوہر کے ساتھ نہ بن سکی شوہر کی بے قدری نے ماں کے پاس جانے پر مجبور کر دیا۔یہ ہی حال مسز قریشی کا تھاان کے شوہر اپنی بیوی کے رعب دبدبے اور سرپرستی کے رجحان کو برداشت نہ کرپائے اس لیے تعلقات خراب کر لیے۔پدرسری نظام کا اعتراف کرتے ہوئے حمیدہ سالم لکھتی ہیں:"مرد بھلا کیوں کر عورت کا رعب سہے خواہ اس کے پیچھے کتنی ہی خلوص و محبت کیوں نہ ہو۔"(۳۶)

کالج میں لیکچر رشپ سے فارغ کیے جانے کے بعد ش۔ فرخ نے اپنے بی۔ ایس کے طالب علموں کے لیے نوٹس کی شکل میں ایک کتاب لکھی جسے ان کی پرانی استاد نے اپنے نام سے شائع کروایا۔ ازدواجی زندگی میں دھوکے کے بعد ش فرخ نے صحافت کو بطور پیشہ اپنایا اور اپنی زندگی کے قیمتی تیس سال صحافت کی نظر کیے۔ ش۔ فرخ کا تعلق چونکہ صحافت سے تھا جس کو سب سے بڑا دھچکا ضیا الحق کے دور میں لگا۔ اخبار خواتین کو اسٹال لٹکنے کی اجازت واپس لے لی گئی۔ اصحاب اقتدار نے الزام لگایا کہ ش۔ فرخ نئی نسل کو خراب کر رہی ہے۔ ضیاء حکومت کے گیارہ سال بعد ش۔ فرخ کو اخبار خواتین کا ایڈیٹر بنا دیا گیا تب بے نظیر بھٹو وزیر اعظم تھی۔ اس اخبار کو معیاری بنانے کے لیے ش۔ فرخ کو بہت محنت کرنا پڑی کیوں کہ اس اخبار کی حالات بہت ناقص تھی وہ لکھتی ہیں: "اخبار خواتین ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں ماریں کھا کھا کر نیم مردہ چوہا بن چکا تھا۔"(۳۷)

اخبار خواتین کا بے نظیر نمبر بھی شائع ہوا جو پاکستان کی پہلی وزیر اعظم کو ان کی سال گرہ کے موقعے پر تحفے کے طور پر بھجوایا گیا۔ ہر صاحب اقتدار کے دور میں اخبار خواتین پلٹے کھاتا رہا۔ من پسند خبریں لگوانے والوں نے خاتون ایڈیٹر کے لیے مسائل کھڑے کر دیئے کبھی سزا کے طور پر رات کی ڈیوٹی لگائی گئی تو کبھی اس عہدے سے فارغ کر دیا گیا۔ بہادر خاتون نے یہ سب کچھ بڑی تحمل مزاجی سے برداشت کیا۔ وہ لکھتی ہیں: "ان کا خیال تھا، عورت ذات ہے نائٹ شفٹ میں کام نہیں کرے گی، یا تو خود استعفی دے دے گئی یا اس کے انکار پر میں سبکدوش کر دوں گا۔"(۳۸)

ایک کرائے کے قاتل نے ش۔ فرخ پر قاتلانہ حملہ کیا مگر گولی چلائے بنا چلا گیا۔ مگر وہ ڈر سے گر پڑی گرنے سے جسم پر چوٹیں آئیں۔ وہ سوچتی ہیں میرا کیا گناہ تھا جس کی سزا ملی پھر اسے ہزاروں بے گناہ عورتوں کی قبریں یاد آتی ہیں جن کو عزت و عصمت اور انا کی آڑ میں دفن کر دیا گیا۔ وہ لکھتی ہیں:

> "میرا کیا قصور تھا؟ اس وقت میرا ذہن پھر ان بے نشان قبروں کی طرف جاتا ہے
> جہاں معصوم عورتیں دفن ہیں۔ وہاں کی خاموشی سے ایک ویران سی آواز اٹھتی ہے کہ ہمارا
> بھی کوئی قصور نہیں تھا۔"(۳۹)

ان حالات سے تنگ آکر اپنے گھر کے باہر بھائی کے نام کی تختی لگوادی۔ صحافت کی ملازمت کے دوران کشور ناہید نے ش۔ فرخ کے لیے نواز شریف حکومت میں راہیں ہموار کیں اور انہیں اخبار مشرق کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ انہوں نے اخبار خواتین کے مسائل کی طرف نصرت بھٹو کی توجہ دلائی۔

افضل توصیف کو تین دفعہ پرنسپل بننے کی پیش کش ہوئی جس کو انہوں نے ٹھوکرا دیا۔ وہ صرف پڑھانا چاہتی تھی۔ اور ایسا کہ سب کچھ سچ ہو، سستی شہرت انہیں پسند نہ تھی۔ ان کے خیال میں آئیڈیل کے ہوتے ہوئے زندگی

ایک جنگ ہے۔ انہوں نے جی۔ آر۔ او فنڈز کے لیے اپلائی کیا تو اس پر یہ اعتراض لگایا گیا کہ آپ تو سنگل ہیں یہ فنڈز صرف فیملی والوں کو ہی ملتا ہے۔ لہذا مصنفہ نے بھی حکومتی اعتراض بڑی چالاکی سے پر کیا وہ لکھتی ہیں: "میں نے اپنے نام کے ساتھ مسز لکھ دیا اور نوید کے علاوہ کئی بچے پاس رکھ لیے۔"[(۴۰)] بعد میں حکومت کے جانے کے بعد کئی سنگل خواتین کو گھر الاٹ ہوئے۔ نفیس بانو شمع نے ملازمت کی سختیوں کو دیکھتے ہوئے پیشہ وارنہ مہارت کی طرف مبذول ہوئی اور انہوں نے فن تعمیرات کو اپنایا۔

ملازمت سے پہلے ساجدہ زیدی نے اپنے شوہر کو یقین دلایا کہ وہ پروفیشنل لائف کے ساتھ ساتھ بچوں کی بہتر طریقے سے تعلیم تربیت کر سکتی ہے۔ یہ اپنے سسرال میں پہلی خاتون تھی جس نے ملازمت کرنے کی جرات کی اس کے بعد خاندان کی دوسری لڑکیوں کا رجحان بھی ملازمت کی طرف ہوا اور انہوں نے مختلف شعبوں میں اپنی کارکردگی کا مظاہر کیا۔ ۱۹۶۳ء کے سیشن میں لندن یونی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں مصنفہ کا داخلہ ہو گیا۔ تعلیم کی غرض سے باہر کے ملک جانے کے لیے حکومت ہند کا اجازت نامہ ضروری ہے۔ حکومت نے قوانین بلا جواز بدل دیئے ارٹس اور ایجوکیشن کے طالب علم باہر جا کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اس سے ملک کا زرمبادلہ ضائع ہوتا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے پنڈت نہرو کے پی اے محمد یونس کے آفس کا رخ کیا جس سے یہ مسئلہ حل ہوا۔ دوسری طرف یونی ورسٹی نے اسٹڈی لیو آدھی تنخواہ پر منظور کی۔ شعبہ علم میں ان کی قدر دانی بھی ہوئی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ ان کی جنس ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنی بلکہ بعض جگہوں پر قدر دانی میں اضافہ بھی ہوا کیوں کہ ادبی شہرت میں جنس معیار کی کسوٹی نہیں ہوتا۔ ان کو یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن ریو سی جی کی پیش کش ہوئی۔ ایجوکیشنل پینل کی ممبر منتخب ہوئی جو ان کے لیے اعزاز کی بات تھی۔ اس سے پہلے علی گڑھ یونی ورسٹی کے کسی پروفیسر کو یہ عہدہ نصیب نہ ہوا۔ لندن میں قیام کے دوران مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کے گھر میں مقیم ہی نہیں رہی بلکہ بی بی سی اردو میں دونوں بہنوں کا انٹرویو بھی ہوا۔ جس میں کلام کی بلند خوانی کے ساتھ ساتھ اہم ادبی تحریکات اور رجحانات پر بھی سیر حاصل گفتگو بھی ہوئی۔ مختلف ممالک کی سیر کے دوران نہ صرف خواتین کی حالت زار کا مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کو اپنے قلم کی زینت بھی بنایا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کسی بڑے عہدے کی بجائے تخلیقی کام کی طرف توجہ مرکوز کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنی پیشہ وارانہ زندگی شفاف ہونے کے بارے ثبوت دیتی ہیں سازشیں تو مردوں کا حصہ تھیں۔ ان کی پروفیشنل زندگی میں بھی اور ادبی تخلیقی زندگی میں بھی۔ وہ تو ہمیشہ مناصب اور اقتدار کی دوڑ، پی۔ آر گروہ بندیاں اور مافیا کی سرگرمیوں سے بے نیاز ہی رہی۔ نہ ان کے ضمیر نے سب کچھ گوارہ کیا نہ ان کی تخلیقی انا نے۔ ملازمت پیشہ زندگی میں مرد اور عورت کی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ عورت گھر میں

نوکری کے بعد چائے بھی خود بناتی ہے۔ جبکہ مرد کو سب کو پیش کیا جاتا ہے۔یونی ورسٹی میں ملازمت کے دوران ساجدہ زیدی کی محنت رنگ لائی جس کے بارے میں پروفیسر نورالحسن نے کہا:"ساجدہ زیدی کی غیر معمولی ذہانت نے یونی ورسٹی کی تہذیبی زندگی میں نئے مفہوم کا اضافہ کیا۔"(۴۱)

کشور ناہید کے بقول ملازمت پیشہ عورت کو اپنے سسرال اور گھر والوں کے طعنے سننے کو ملتے ہیں مثلا" آگئیں آپ "آتے ہی باورچی خانہ سنبھالنا پڑتا ہے بچوں کی دیکھ بھال اور پھر گہری نیند سوجانا۔دوسری طرف ملازمت میں بوس کی ہاں میں ہاں نہ ملانے کی صورت میں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بیوی اگر ملازمت پیشہ ہوتو اس کو اپنے شوہر کے افسروں سے سلام دعا رکھنی پڑتی ہے۔دعوتوں سے لے کر خوشامد کے پیالوں میں قلقل مے کی طرح ڈھلنا بھی ضروری ہے۔نوکر افسروں کی ہاں میں ہاں نہ ملائے تو ملازم کی خیر نہیں کشور ناہید اس بارے میں لکھتی ہیں :"نوکری میں چمچہ گیری نہ کرنے کے باعث بے شمار دفعہ تنزلی ہوئی نہ میں نے وجہ پوچھی نہ بتائی گئی۔"(۴۲)نوکری کے دوران جس کا جو دل کیا وہ بکتا گیا۔کسی نے چپراسی سے افسر بننے کا طعنہ دیا تو کسی نے خودسر کہا۔کوئی کہتا یقینا اس کی کہیں بڑی پہنچ ہے۔اخباروں نے جو چاہا وہ لکھا اس لیے کہ نہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ہوٹلوں میں چھپ چھپا کر شامیں بسر کیں اور نہ ان کی کچی تحریروں کی تعریفیں کیں۔خراب تو ہونا ہی تھا۔انیس ہارون کو کمیونسٹ پارٹی نے بھی ممبر بلکہ فل ٹائم ورکر بننے کی دعوت دی تھی مگر کچھ عجیب شرائط بھی رکھی تھی کہ اپنے کٹے ہوئے بال بڑھالو۔یہ کیا بات ہوئی کیا انقلاب چٹیا سے آتا ہے۔؟بھلا ہو زہرا داؤدی کا جنہوں نے ان کا دفاع کیا اور ان کو اس جنجال سے بچالیا۔

انیس ہارون کو والدین ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور وہ خود فارن سروس میں بطور آفیسر کام کرنا چاہتی تھی مگر فارن سروس میں لڑکیوں کو ملازمت کی اجازت نہیں تھی۔آر۔سی۔ڈی کے اسکالر شپ پر ترکی جانے کی اجازت نہیں دی گئی اس طرح لڑکیوں کے ہاتھوں سے بہت سے مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ایل۔ایل۔بی میں پہلی پوزیشن لینے پر والد صاحب تو بہت خوش ہوئے البتہ والدہ نے کہا اگر ڈاکٹر بنتی تو زیادہ اچھا تھا۔انیس ہارون "اخبار خواتین"میں ملازمت کرتی تھی جہاں پر میٹر نٹی لیو کی کوئی روایت نہیں تھی۔زیادہ اصرار پر انہوں نے کہا کہ وہ تین ماہ کی رخصت لے لیں مگر پیسے نہیں ملیں گئے۔انیس ہارون دوسروں کے حق کے لیے لڑنے والی خاتون تھی تو اپنے لیے کیوں نہ بولتی۔پھر اس سے دوسروں کے لیے بھی راہ ہموار ہوتی۔بہت تگ ودو کے بعد چھ ہفتے کی تنخواہ دینے پر تیار ہوئے۔یو۔این۔او کے اسکالر شپ پر لندن گئیں۔جہاں پر انٹر نیشنل کانفرنس تھی جس میں ہندوستان اور مغرب کی مشہور فیمنسٹ سے ملاقات ہوئی۔پاکستان کے سرکاری وفد کی نمائندگی بیگم بھٹو کر رہی تھی۔انیس ہارون کی

ملاقات بیگم بھٹو سے بھی ہوئی جنہوں نے مصنفہ کی اکیلے سفر کرنے پر نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کے ساتھ لنچ بھی کیا۔ انیس ہارون کو شادی کے بعد خواتین کے کمیشن کی طرف سے چیئر پرسن بننے کی پیشکش ہوئی جو انہوں نے اپنے شوہر سے مشاورت کے بعد قبول کرلی۔ ان کو اس ملازمت کے لیے کراچی چھوڑ کر اسلام آباد آنا پڑا۔ کمیشن نے یہ ملازمت انیس ہارون کو تجربے اور اعتماد کی بناء پر دی۔ اس دور میں کمیشن نے حقوق نسواں کے لیے بہت سے کام ڈگر سے ہٹ کر کیے۔ انیس ہارون کمیشن کی کارکردگی کے بارے میں لکھتی ہیں: "ہم نے اس کو خواتین کا ترجمان بنایا سرکار کا نہیں"(۴۳)

صغرا مہدی نے نوکری کی تلاش کے موضوع پر ایک طنزیہ مضمون "نوکری صبر طلب اور تمنا بے تاب" کے عنوان سے لکھا جو علی گڑھ کے رسالے "دوست" میں شائع ہوا۔ مصنفہ خراب ماحول اور انتظامی کی بدسلوکی کی وجہ سے اکثر استعفی دے دیتی تھی جس کا مقصد خراب نظام تعلیم اور حکومتی پالیسیوں کے خلاف احتجاج تھا۔ صغرا مہدی نے تدریس سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا پھر دارالتراجم میں پانچ سال تک ملازمت کی بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ منسلک ہوگئی۔

حوالہ جات

۱۔ روبینہ سہگل، قوم پرستی عسکریت اور صنفی تقسیم، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء، لاہور، ص ۹۳

۲۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۴

۳۔ شہر بانو، بیتی کہانی، ص ۱۱۵

۴۔ قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے، ص ۶۸۹

۵۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۱۴

۶۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، ص ۹۹

۷۔ حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص ۶۳

۸۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۵۰

۹۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ لے کر، ص ۳۴

۱۰۔ روبینہ سہگل، قوم پرستی عسکریت اور صنفی تقسیم، ص ۲۷

۱۱۔ کشور ناہید، عورت خواب اور خاک کے درمیان، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۸۳

۱۲۔ وکی پیڈیا، ۱۲ جولائی ۲۰۲۲ء، بوقت صبح ۹:۲۳ منٹ

۱۳۔ صالحہ عابد حسین، سلسلہ روز و شب، ص ۳۰۶

۱۴۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، ص ۱۳۸

۱۵۔ عطیہ داؤد، آئینے کے سامنے، ص ۱۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۸۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، ص ۱۹۲

۱۹۔ افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، ص ۳۲۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۲۱۔ زہرا داؤدی، گرداب کی شناوری، ص ۴۸

۲۲۔ فوزیہ خانم، ڈاکٹر، آپ بیتیاں ٹیڑھی پسلیوں کی، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۳۴۹

۲۳۔ شاہین مفتی، کشور ناہید (شخصیت اور فن)، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱

۲۴۔ انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، ص ۱۹۸

۲۵۔ طاہرہ کوکب، عورت کی سماجی و معاشی زندگی، دارالنور، ملتان، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۸

۲۶۔ ارسطو، مثالی ریاست، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۲

۲۷۔ مظفر ملک، ڈاکٹر، تعلیمی عمرانیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۰، ص ۱۷۸

۲۸۔ روبینہ سہگل، قوم پرستی عسکریت اور صنفی تقسیم، ص ۱۶

۲۹۔ ایم سلطانہ بخش، پاکستانی ادب میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶، ص ۴۲۱

۳۰۔ عطیہ داؤد، آئینے کے سامنے، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۴

۳۱۔ کشور ناہید، دوسری عورت کی کتھا، ص ۲۹

۳۲۔ مترجم زاہد حنا، شہزاد مغرب میں از فاطمہ مرنیسی، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۰۲

۳۳۔ ایضا، ص ۲۰۲

۳۴۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، ص ۱۸

۳۵۔ سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، ص ۷۰

۳۶۔ حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص ۱۴۱

۳۷۔ ش۔ فرخ، جینے کا جرم، ص ۱۱۷

۳۸۔ ایضا، ص ۱۲۹

۳۹۔ ایضا، ص ۱۰۲

۴۰۔ افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، ص ۱۲۷

۴۱۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، ص ۳۴۵

۴۲۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۸۲

۴۳۔ انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، ص ۲۰۳

باب پنجم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ:

ہر دور کا ادب اخلاق اور سماج کا احاطہ کرتا ہے اور نئے رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ پہلے اردو ادب مشرقی علوم کے زیر اثر رہااب میڈیا کی مدد سے بدلتے ہوئے سماجی ،معاشرتی اور معاشی حالات بھی اس پر اثرانداز ہورہے ہیں۔ جس کے تحت مغربی نظریات بھی زیر بحث آرہے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی ہند اسلامی تہذیب ہماری خاندانی روایات ،ہندوستانی،یورپی اور مذہبی کلچر کے زیر اثر رہا۔یہ ہی عناصر ہماری فکر اور ثقافت کا حصہ ہیں۔اسی لیے ہماری روایات اوراقدار مردانہ سماج کے زیر بحث ہیں،جہاں پر صنفی امتیازات نمایاں ہیں۔عورت کو قابو کرنے کے لیے گھر کی چاردیواری میں بند کیا جاتا ہے۔جدید تعلیم کی مخالفت کی جاتی ہے کہ کہیں وہ کسی عشق میں مبتلا ہو کر کسی آدمی کو خط نہ لکھ دے۔کم عمری کی شادی کو ترجیح دی جاتی ہے،جائیداد کو بچانے کے لیے قرآن پاک سے حق بخشوائی کی رسم،کم عمر یا بڑی عمر کے شخص سے بے جوڑ شادیاں کردی جاتی ہیں۔ستی کی رسم کو روکنے کے لیے برصغیر میں اصلاح نسواں کی تحریک کا آغاز ہوا۔ہندوستان میں تانیثیت کا آغاز بھی اصلاح نسواں کی تحریک کے ساتھ ہی شروع ہوا جس میں ہندو / مسلم مرد خواتین شامل تھے۔اس تحریک نے شروع سے لے کر اب تین ادوار میں سفر طے کیا۔پہلا دور ۱۸۵۰ء سے ۱۹۱۵ء تک کا دور ہے یہ دور مغربی تقلید کا دور تھا جس میں اعلیٰ طبقے کے مرد وخواتین دونوں شامل تھے اسی دور میں ستی کی رسم کا خاتمہ ہوا۔دوسرا دور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ہے جس میں حقوق نسواں کی تحریک برطانوی نو آبادیاتی شکل اختیار کر چکی تھی۔برطانوی نو آبادیاتی دور میں حقوق نسواں نے اصلاح نسواں کی شکل اختیار کی۔جس میں خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔سرسید جیسے روشن خیال رہنما بھی لڑکوں سے پہلے تعلیم نسواں کے حامی نہ تھے۔یہاں پر سرسید،اکبر اور اقبال کے نظریاتی اختلافات کا ملا جلا ماحول تھا جس میں،جج کرامت حسین، شیخ عبد اللہ اور بی اماں نے علم کی شمع روشن کی اور گھر گھر جاکر تعلیم نسواں کا چراغ جلایا۔ تعلیم کی غرض سے بنائے جانے والے اداروں کی پرزور مخالفت کی گئی۔تاہم یہاں پر چند ایک علاقوں میں مدرسری نظام کی چند جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں جیسے ریاست بھوپال۔اسی دور میں چند امیر اور روشن خیال گھرانوں نے اصلاح نسواں کی تحریک کو کامیاب بنایا جن میں قرۃ العین حیدر اور عطیہ فیضی کا نام سرفہرست ہے۔اس کے بعد ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس کی روح رواں رشید جہاں اور عصمت چغتائی

تھیں۔ آزادی کے وقت تانیثی تحریک سیاسی شکل اختیار کر گئی اس آزادی کی تحریک میں سب سے زیادہ استحصال بھی عورتوں کا ہی ہوا۔ کسی کی عزت لوٹ لی گئی تو کسی کو عزت کی خاطر مار دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں جاگیر دارانہ ،سرمایہ دارانہ اور قبائلی نظام پایا گیا۔ جاگیر دارانہ نظام نے ملکیت پرستی کا تصور دیا جس کے تحت عورت کو سات پردوں میں قید کیا جاتا اور وہ اپنے گھر میں دنیا ومافیا سے بے خبر ہو جاتی ہے اس عمل کی وجہ سے ماں اور اس کی اولاد فرماں بردار رہتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام نے جذبات ،احساسات سے عاری رشتے تخلیق کیے اوران رشتوں کو کاروباری بنیادوں پر استوار کیا۔ لڑکیوں کو شوپیس اور لڑکوں کی مالیات کو اہمیت دی جانے لگی۔ عورت کے مسائل گھر کی چاردیواری سے لے کر (دفتروں،اسکولوں ،کالجوں اور بس سٹینڈوں) تک پھیل گئے مگر یہ نظام جاگیر دارانہ نظام کی ذہنی غلامی سے کچھ بہتر تھا۔ قبائلی نظام میں عورت جرگے کے فیصلوں کی نظر ہو گئی۔ مذاہب نے عورت کو جو حقوق دیئے تو غلط تفاسیر کرنے والوں نے تہذیبوں کے ساتھ مل کر عورت کو ثانوی حیثیت دی۔ بدقسمتی سے ہم شروع سے لے کر اب تک خاندان کا ایک ایسا ڈھانچہ نہیں بنا سکے جو ہماری ضروریات کو پورا کر سکے۔ ہم اکیسویں صدی میں بھی خاندانی رواجوں اور باندھنوں کی صورتحال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مارگن کے مطابق خاندان طویل وقفوں کے بعد ہی ترقی کرتے ہیں اور کوئی بڑی تبدیلی ہی ردوبدل کا باعث بن سکتی ہے۔

معاشرتی گھٹن کی وجہ سے گھر سے نکلنے والی عورت کا دور تک تعاقب کیا جاتا ہے گھر کے اندر اور گھر سے باہر جانے والی خواتین کو تربیت دینی چاہیئے کہ وہ کیسے اپنا تحفظ کر سکتی ہیں۔ بہت سے برے حادثات لاعلمی کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں عورت چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ خواتین کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہر ادب نسائی تجربات پر مشتمل تو ہو سکتا ہے مگر تانیثی فکر سے لبریز نہیں ہو سکتا کیوں کہ تانیثیت کے ہونے کے لیے تانیثی فکر کا حامی ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لیے اس مقالے میں منتخب کی گئی زیادہ تر ادباء کا تعلق تانیثی فکر سے ہے۔ تانیثیت کا پہلا تصور شعور ذات کے ساتھ منسلک ہے۔ آپ بیتی کی صنف نے انہیں شعور ذات کا وصف دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی آپ بیتیاں وقت کے بہتے ہوئے دھاروں کی عکاس بھی ہیں۔ بدلتے ہوئے معاشرتی ڈھانچے میں عورتوں کے ساتھ کیے جانے والے استحصالی رویوں نے بھی نیا روپ دھار لیا۔ ان آپ بیتیوں میں بہت سی باتیں مشترکہ ہیں اور کچھ منفرد بھی ہیں۔ شہر بانو کی آپ بیتی "بیتی کہانی" میں ایک نواب کی بیٹی اور دوسرے نواب کی بہو بنتی ہے یہ داستان بادشاہوں ،وزیروں اور نوابوں کی عورتوں کی حالت زار کو بیان کرتی ہے۔ کم عمری کی شادی نے اس کے بچپن کو کھا لیا۔ اس قدامت پرست دور میں عورتوں کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں کیا جاتا تھا اور تو اور بچوں کی پیدائش پر کوئی کنٹرول نہ تھا اس کے ساتھ ہی میڈیکل کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی ایک

بڑی تعداد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھی۔ شہر بانو کے بھی پانچ بچے پیدا ہوئے مگر ایک بھی نہ بچا۔ شہر بانو کے اندر انفرادی طور پر مزاحمت بھی نظر آتی ہے جب وہ اپنی ساس سے اپنے حقوق کی جنگ لڑتی ہے۔ شوہر کی لاپروائی اس کو ٹکے ٹکے کا محتاج کر دیتی ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ مس فلیچر کو اردو پڑھاتے ہوئے اس کو بھی پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ مصنفہ کو تاریخی شعور بھی تھا اس لیے وہ اپنی بات کو بیان کرتے ہوئے تاریخ اور سن کا حوالہ دیتی ہیں۔ اس آپ بیتی میں ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے اور بعد میں عورتوں کی حالات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کی آپ بیتی تحریک پاکستان میں خواتین کی شمولیت اور جدوجہد کو اجاگر کرتی ہے۔ اس دور میں لوگ اپنی روایات کے ساتھ جوڑے ہوئے تھے۔ قرۃ العین کی آپ بیتی "کارجہاں دراز" میں ناول کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ جس کا مرکزی کردار سجاد حیدر یلدرم کی شخصیت ہے۔ ان کی والدہ اور والد دونوں حقوق نسواں کے حامی تھے اس میں تاریخ خاندان کے ساتھ ساتھ اصلاح نسواں کے مختلف پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون تھی جو عورتوں کو کامیاب اور مضبوط کردار کی حامل دیکھنا چاہتی تھی۔ قرۃ العین حیدر کے خیال میں تانیثی تحریک سے پہلے اسلام عورتوں کو تمام حقوق دے چکا ہے مگر بدقسمتی سے ہم اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس لیے اس تحریک کا بنیاد ماخذ ہی اسلام ہے۔ عصمت چغتائی کی آپ بیتی "کاغذی ہے پیرہن میں" استحصالی اور مزاحمتی رویوں میں توازن پایا جاتا ہے یوں وہ حقوق نسواں کی حامی بھی قرار پاتی ہیں۔ بھائیوں کے ساتھ پرورش پانے کی وجہ سے وہ روایتی اور گھریلو علمی تعلیم کی روایات کو توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اعلی تعلیم کا خواب پورا کرنے کے لیے اپنے ماموں زاد کزن جگنو کی مدد لی۔ کالج بند کرنے کی دھمکی سن کر لڑکوں کو ساتھ ملا کر اس سازش کو ناکام بنایا۔ اپنے ناولوں اور افسانوں میں جنس کو موضوع بنایا اور جنس کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ہم جنس پرستی جیسے اہم موضوع کو استحصالی رویوں کے طور پر متعارف کروایا جس کی وجہ سے ان پر فحش ہونے کا الزام لگایا گیا وہ معاشرے میں بگڑتی ہوئی اخلاقیات کے بھی خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں صنفی بنیادوں پر متون کا مطالعہ کیا جاتا ہے قاری بھی مردوں کے جنسی متون کو چسکے لے کر بیان کرتے ہیں اور عورت کے متون میں جنس کے مسائل بھی پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ مرد اور عورت کے متون میں فرق صنفی ناہمواری کی دلیل ہے ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" میں جاگیردارانہ نظام کے تحت عورت پر لگائی جانے والی چادر اور چار دیواری کی پابندیاں کھل کر بیان کی گئی ہیں جہاں پر سانس لینے کے لیے بھی عورت کو اجازت کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان کے گھر کی خواتین اجازت کے بغیر دروازے سے باہر جھانک بھی نہیں سکتی تھیں اس گھٹن زدہ ماحول کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کی ماموں زاد بہن صائمہ اور نانا کی دوسری بیوی چھوڑ کر چلی گئی

ایک نے دنیا سے منہ موڑ لیا تو دوسری نے ازدواجی رشتے کے بندھن سے چھٹکارا حاصل کیا۔ خاندان سے باہر شادی نہ کرنے کی وجہ سے لڑکیاں خاندان سے باہر کی عورتوں سے بھی پردہ کرتی تھی۔ اسی آپ بیتی کا دوسرا حصہ جو شادی کے بعد کی زندگی پر مشتمل ہے جو ایک سفر نامے کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ ان کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ خوش گوار ازدواجی زندگی فریقین کے اندر اعتماد پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ اور نفیس بانو شمع کی آپ بیتی "جنت سے نکالی گئی حوا" جاگیر دارانہ نظام کی غلامانہ ذہنیت کی عکاس ہے جس میں ایک معصوم بچی کو گانا سننے کی پاداش میں شادی کی سزا سنائی گئی۔ شوہر عیاش پرست تھا اس کو بیوی سے کوئی دلی چسپی نہ تھی۔ شادی والے دن ہی بیوی کو بتا دیا کہ اسے نفیس بانو شمع سے کوئی دلچسپی نہیں گھر والوں نے زبردستی شوہر کے گھر واپس بھیج دیا کیوں کہ وہ ان کی بیٹی کی معاشی ضروریات تو پوری کر رہا تھا۔ زبردستی کا یہ بندھن ٹوٹ بنتے ہوئے طلاق پر ختم ہو گیا۔ اس آپ بیتی میں نفیس بانو نے اپنے اردگرد کی زندگی سے عورتوں کے بہت سے استحصالی کردار بیان کیے۔ اسی لیے ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کو دنیا کی ہر عورت مظلوم نظر آتی ہے۔ کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں عالم گیر تانیثی تصورات بیان کیے گئے ہیں جس میں حکومت اور فوج کی آمریت کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ ایک بری عورت کی کتھا کئی دوسری عورتوں کی بھی کتھاؤں کی وجہ بنی۔ ڈاکٹر نوشاد عالم نے عصمت چغتائی، ادا جعفری، کشور ناہید اور نفیس بانو کی آپ بیتی کو باغی عورتوں کی آپ بیتیاں کہا ہے۔ عذرا عباس کی آپ بیتی "میرا بچپن" میں شروع سے ہی اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزرنے کی رمق نظر آتی ہے جو پدر سری نظام کے تحت پروان چڑھنے والی ماں کے پدرانہ نظریات سے اختلافات کرتی ہے کبھی ناک اور کان چھدوانے پر بھائی کے ساتھ جھگڑا تو کبھی بھائیوں کو دودھ ملنے اور خود کو صرف چائے پر ٹرخا دینے پر مزاحمت۔ عذرا عباس میں عصمت چغتائی جیسی مزاحمتی رمق دکھائی دیتی ہے اس خودنوشت کا ہر حصہ دل چسپ ہے جس کی کئی پرتیں ہیں۔ عطیہ داؤد کی آپ بیتی "آئینے کے سامنے" میں سندھ کے دیہاتوں میں عورتوں کے اوپر ہونے والے استحصالی رویوں بیان کرتی ہے جس میں لڑکیوں کو کبھی کم عمری کی شادی تو کبھی وٹے سٹے کی شادی کی صورت میں قربانی کے بکرے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ گاؤں کی روایات کو توڑ کر شہر کے سکول میں تعلیم حاصل کرنا اور شہر سے گاؤں تک کا کامیاب سفر کرنا ایک دیہاتی لڑکی کے لیے یقیناً نئی اور معیوب بات تھی۔ سندھ کے دیہاتوں میں عورت کو بھیڑ بکریوں کی طرح سمجھا جاتا ہے ان کی پہلی نظم لکھنے پر بھائی کی مخالفت کا خط پڑھنا اور اس کا جواب دینا۔ عورت فاؤنڈیشن میں شرکت اور بڑی جرات سے نوکری کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے نبرد آزمامہ ہونا ہر لڑکی کے بس کی بات نہیں۔ نثار عزیز بٹ کی آپ بیتی "گئے دنوں کا سراغ کر" میں قبائلی اور صوبہ سرحد میں عورتوں

پر لگائی جانے والی پابندیاں، کم عمری کی شادی، عزت و عصمت کے مسائل، لڑکیوں کے لیے تعلیم کے دروازے بند ہونے کے واقعات درج تھے۔ نثار عزیز بٹ بڑی خوش قسمتی تھی جس نے نہ صرف تعلیم حاصل کی، پشاور کے ریڈیو اسٹیشن میں کام کیا بلکہ اصغر بٹ سے پسند کی شادی بھی کی۔ ش۔ فرخ اور افضل توصیف کی آپ بیتیاں دو صحافی خواتین کی ہیں جو صحافت کے شعبے میں خواتین کو درپیش مسائل کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ہندوستان میں لکھی جانے والی خواتین کی آپ بیتیوں میں صالحہ عابد حسین کے بعد خاندانی لڑکیوں کی درجہ بندی نظر آتی ہے جو مولانا الطاف حسین حالی کی تحریک نسواں کے تصورات کو زندہ کیے ہوئے ہیں ان میں پہلے نمبر پر نام صالحہ عابد حسین کا آتا ہے جو خاندان کی لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کی خاطر اپنے پاس لے کر آتی ہیں۔ ان کی مناسب جگہ پر شادیاں کرواتی ہیں ان کے لیے جہیز کا بندوبست کرتی ہیں مگر جہیز جیسی لعنت کے خلاف مزاحمت نہیں کرتی اپنے شوہر عابد حسین کی مدد سے "بزم خواتین" کا آغاز کرتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر خاندان کی دوسری خواتین بھی تحریک نسواں کی روایت کو برقرار رکھتی ہیں جن میں ساجدہ زیدی، سعیدہ بانو احمد اور صغرا مہدی مشہور ہیں۔ ساجدہ زیدی وجودیت تانیثیت کی حامی ہیں جن کے مطابق مرد اور عورت برابر ہیں۔ سعیدہ بانو احمد کی آپ بیتی "ڈگر سے ہٹ" کر ایک بیوہ کی داستان ہے جو پہلی نیوز کاسٹر بنی۔ صغرا مہندی نے صالحہ عابد حسین کو اپنی آئیڈیل قرار دیا اور تانیثی فکر کو عام کیا۔ ان کی آپ بیتی "حکایت ہستی" ایک بہادر اور تنہا لڑکی کی داستان ہے جو اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ایک معمولی سے اسکول سے کرتی ہوئی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بطور استاد خدمات سر انجام دیتی ہیں۔ ان کی دو کتابیں "اردو ناول میں عورت" اور ہندوستان میں عورت کی حیثیت" تانیثی فکر کی غماز ہیں۔ حمیدہ سالم کی آپ بیتی "شورش دوراں" علی گڑھ یونی ورسٹی کی پہلی ایم۔ اے اکنامکس خاتون کی داستان ہے۔ اس آپ بیتی میں جاگیر دارانہ نظام کے تحت عورت کی غلامانہ ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے جس میں صفیہ جان اختر نثار شامل تھی جو شوہر کی اطاعت گزاری کرتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ زہرداؤدی کی آپ بیتی "گرداب کی شناوری" ایک باغی خاتون کی آپ بیتی ہے جو ملازمت کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی اور آزادی نسواں کی تحریک میں بھی شامل ہوئیں۔ انیس ہارون کی آپ بیتی "کب مہکے گی فصل گل" ایک بہادر لڑکی کی داستان ہے جو شادی کے بعد اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ بہن بھائیوں کی بھی پرورش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت فاؤنڈیشن کی کارکن بن کر دوسری دکھی عورتوں کے مسائل بھی حل کرتی ہیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر ہارون ماہر نفسیات تھے عورت فاونڈیشن میں شرکت کے دوران انیس ہارون خواتین کا ذہنی اور نفسیاتی علاج ان سے کرواتی تھی۔ یہ آپ بیتی پاکستان میں تانیثی صورت حال پر مبنی ایک دستاویز کی اہمیت رکھتی ہے مصنفہ مشہور ادیبہ اور شاعرہ فہمیدہ ریاض کی ہم جماعت اور دوست تھیں۔ قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، صالحہ عابد

حسین، سعیدہ بانو احمد، ساجدہ زیدی کا تعلق روشن خیال اور ادبی گھرانہ سے تھا ان کے والدین کا شمار چند ادبی شخصیات میں ہوتا ہے اس لیے ان کو اپنی ادبی شناخت بننے میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ادا جعفری، عطیہ داؤد، صغرا مہدی، ش۔ فرخ، افضل توصیف، انیس ہارون، نفیس بانو شمع، زہرا داؤدی اور عذرا عباس کو اپنی شناخت کے لیے کافی تگ ودو کرنی پڑی۔ روایتی عائلی زندگی کی پابندیوں کو ان ادباء کی ماؤں نے ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی بیٹیوں کی زندگی میں جدید اور سماجی حیثیات کو متعارف کروایا۔ قدیم عائلی حیثیات میں کم عمری کی شادی، چادر اور چاردیواری کی حدبندیاں، تعلیم سے محرومی اور فرسودہ رسم ورواج کی درجہ بندیاں نظر آتی ہیں تعفن زدہ اس ماحول میں زندہ رہنا ناگزیر نظر آتا ہے۔ ان پابندیوں کی زنجیروں کو ماؤں نے کافی حد تک توڑنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں جدید عائلی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ جدید عائلی حیثیات میں خواتین کے مسائل گھر کی چاردیواری سے باہر کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ بازاروں میں جنسی طور پر ہراساں کرنا، دفاتر میں کم مراعات دینا، ادبی تخلیقات کو مردوں کے نام سے شائع کرنا شامل ہے۔ ان خواتین کی آپ بیتیوں میں ماحول اور مسائل کی ایک الگ دنیا نظر آتی ہے جس میں عورت کے احساسات، جذبات اور تجربات بیان کیے گئے ہیں۔ اصلاح نسواں کی تحریک کے ساتھ ہی آپ بیتیاں بھی لکھی گئیں جنہوں نے عورت کو گھر کی چاردیواری سے باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا۔ ایک طرف مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی گئی تو دوسری طرف فرسودہ روایات کے خلاف مہم بھی چلائی گئی۔ عورت نے شروع میں اپنی شناخت مرد کے حوالے سے کروائی مگر شعور پختہ ہونے پر اپنا نام لکھا جو اس کی شناخت کا باعث بنا۔ ان آپ بیتیوں کا مخاطب آنے والی نسل ہی ہوتی ہے جو بزرگوں کے تجربات سے فائدہ حاصل کرکے اپنی زندگی ایک نئے انداز سے گزرتی ہے۔

خواتین کی آپ بیتیوں میں زیادہ تر کا تعلق قیام پاکستان سے پہلے دور سے ہے جنہوں نے ہجرت کے مسائل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خواتین کو ہمارے مذہب نے شادی کا حق دیا ہے مگر اس کا استعمال عورتوں کے استحصال کی صورت میں کیا گیا کبھی قرآن پاک سے شادی کروا کر تو کبھی جائیداد کو بچانے کے لیے لڑکی سے بہت کم عمر یا عمر رسیدہ شخص سے کر دی جاتی۔ بے جوڑ شادیاں ازدواجی زندگی میں ہیجان پیدا کرتی ہیں۔ ارسطو کے مطابق لڑکے لڑکی کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیے جب ان میں جنسی لحاظ سے ایک قابل ہو اور دوسرا نہ ہو تو آپس میں کشمش اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ قدیم عائلی حیثیات کے تحت دیکھا جائے تو تمام خواتین کی شادیاں کم عمری میں والدین کی رضامندی سے ہوئیں جس میں شوہروں کی عمریں بیویوں سے زیادہ ہیں۔ اس نوعمری کے دور میں لڑکیوں کو فیصلہ کرنے کی اجازت دی بھی جائے تو وہ خود سے فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ان کے بچوں کی تعداد زیادہ تھی کم عمری اور حفظان

صحت کے اصولوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کے ہاں بچوں کی اموات کی زیادہ ہوتی تھیں اس کی دوسری وجہ طبی سہولتوں کا فقدان بھی ہو سکتی ہے۔ان کے بچوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور دوسرے چند ایک اداروں سے تعلیم حاصل کی۔ جس میں اصلاح نسواں کی تحریک کے روح رواں شیخ محمد عبداللہ،بی بی اماں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ جنھوں نے تعلیم کو خواتین کی خود مختاری کا ذریعہ بنایا مگر ان کو سخت قسم کے معاشرتی رویوں کا سامنا کرنا پڑا ان کو عورتوں کا اخلاق بگڑنے اور ان کے حامیوں کو کافرتک کہا گیا۔ان پڑھی لکھی خواتین نے نوکری حاصل کر کے خود کو خود مختار بنایا۔ان ہی خواتین کے طے کردہ سفر سے نئی نسل کی خواتین فائدہ حاصل کر سکتی ہیں۔ان آپ بیتیوں میں تین عوامل نمایاں نظر آتے ہیں۔استحصالی رویے،مزاحمت اور تشخص کی شناخت وغیرہ۔ یہ تانیثی فکر کے ہی اہم ترین تصورات ہیں۔ان میں میری وول سٹون کی طرح تعلیم نسواں کی حامی آپ بیتی نگار سلطان جہاں بیگم ہیں جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلر بنی اور عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی رہیں اس لیے ان کو عورتوں کی سرسید کہا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا خاندان ہو یا مولانا الطاف حسین حالی کی نواسی صالحہ عابد حسین کا کنبہ (ساجدہ زیدی،سعیدہ بانو احمد یا صغرا مہدی کی) اصلاح نسواں کی تحریک کا رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔ان ہی آپ بیتیوں میں ورجینا وولف،سائمن دی بوار اور کیٹ ملٹ کی طرح پدر سری نظام کے تحت عورتوں کے استحصالی رویوں کو بیان ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کی کھلم کھلا مخالفت بھی کی گئی۔ سمیون دی بووا کے سوال کا جواب بھی ان آپ بیتیوں میں ملتا ہے کہ خواتین ادیبوں کی تعداد کیوں کم ہے؟ کیوں کہ وہ اپنی تصانیف کو مغربی ادباء کی طرح پہلے باپ بھائی اور بیٹے کے نام سے لکھواتی رہیں تاکہ ان کے ناموں کا پردہ قائم رہے اور ان کی تخلیقات کو بھی مردوں کے برابر مقام ملے۔کافی عرصے تک خواتین کے خیالات،اور جذبات کو مرد ادیبوں نے اپنے انداز سے بیان کیا جس میں مردانہ احساسات کو نسائی رنگ میں بیان کیا گیا مگر ان آپ بیتیوں میں خاص نسائی لب ولہجہ اور تانیثی فکر کی جھلک نظر آتی ہے جنھوں نے ایلن شوایلٹر کا نظریہ سچ کر دکھایا کہ وہ خود اپنی ذات کا شعور رکھتی ہیں اور جانتی ہیں کہ کس طرح اپنے مسائل کو حل کر سکتی ہے فرسودہ رسم ورواج اور معاشرے کی نظر میں اچھا بننے کے لیے اکثر والدین اپنے بچوں کی خواہشات کا گلہ گھونٹ دیتے ہیں اور ان کی مرضی سے شادی کرنے کی بجائے ان پر اپنا فیصلہ تھوپ دیتے ہیں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان میں تانیثیت کے اثرات دوسرے ممالک کی نسبت بہت کم ہیں کیوں کہ یہاں پدر سری نظام کی تاریخ تقریبا چار ہزار سال پرانی ہے جس کی زنجیریں توڑنے میں وقت لگے گا مگر ادب کسی صنف کا محتاج نہیں ہمارے ادیبوں کے ہاں توانا تانیثی فکر کی گونج سنائی دیتی ہے پدر سری نظام کے تحت کیے جانے والے تشدد کے خلاف پریم چند،سعادت حسن منٹو اور دوسرے ادیبوں نے بھی آواز اٹھائی مگر کوئی بھی

ادیب عورت کے خاص جذبات احساسات کی سچی ترجمانی نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ عورت کے ساتھ گزرنے والے حادثات کو دیکھا ضرور جاسکتا ہے مگر ان کے درد کی گہرائی اور شدت کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ آج کی عورت باشعور ہے وہ کسی طور پر بھی کمتر نہیں وہ اپنی ذہنی اور فطری صلاحیتوں کو استعمال کر کے زندگی کو بامقصد بنانا چاہتی ہے۔ دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے جس میں ثقافتی رسم ورواج میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے جیسے عزت وعصمت کے مسائل اور تصورات وغیرہ۔

دنیا کے زیادہ تر حصوں میں عورتوں کے ساتھ ثانوی سلوک کیا جاتا ہے صرف ان کی نوعیت مختلف ہے دور جدید میں مسائل نے نئی صورت حال اختیار کر لی ہے جس میں موبائل فون پر ہراساں کیے جانے والے طور طریقے شامل ہیں جس کے لیے سائبر کرائم جیسے ادارے معرض وجود میں آئے۔ ان استحصالی رویوں کو روکنے کے لیے مزاحمت ضروری ہے اس کی شکل اسلامی تانیثی تحریک کے نام سے ہو یا آزادی نسواں کی فکر سے ہو۔ دراصل تانیثیت ایک سوشلسٹ نظریات رکھنے والی ایک مزدور تحریک ہے جس کا مقصد سرمایہ دارانہ استحصال کا خاتمہ ہی نہیں بلکہ جنسی جبر استحصال سے نجات حاصل کرنا بھی ہے جس میں مارکس، اینگلز اور لینن کے نظریات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اینگلز نے مزدور عورت کے حق میں آواز اٹھائی تو مارکس نے کہا عورت کی شمولیت کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا اور لینن سوشلسٹ ریاست کا معمار تھا جس کے مطابق انقلاب عورتوں کے بغیر آ ہی نہیں سکتا۔ اس تحریک کی بنیادیں انسانی حقوق اور مساوات کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں جس کے تحت مرد اور عورت مل کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں جو طبقاتی امتیازات اور استحصالی رویوں سے پاک ہو۔ جس میں ریاست کے ہر فرد کو اس کی محنت کا پھل ملے۔ سوشلسٹ نظریے کی وجہ سے یہ تحریک آگے بڑھی ہمارے ہمسایہ ملک چین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انقلاب چین کے بعد عورت نے آدھا آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا سوشلسٹ نظریات اور اشتراکی پابندیوں کی وجہ سے پورا آسمان اس پر گرا دیا گیا اور چین کی عورت نصف صدی سے حاصل ہونے والے حقوق سے محروم کر دی گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے امیر عورتوں کو سہولت اور مزدور عورتوں کا استحصال کیا گیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشرقی ممالک کی عورت مغربی ممالک کی نسبت کم استحصال کا شکار ہے مشرقی ممالک میں عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والے مغربی ممالک امریکہ، فرانس، جرمنی اور چین خود خود اپنی عورت کا استحصال کر رہے ہیں۔ شرم وحیا، عزت وعصمت اور اخلاقیات کے معیار مردوں کے طے کردہ ہیں جو جانب داری اور تعصب کا شکار ہیں اور اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ان معیارات کو تبدیل کیا جائے اور عورت کو انسان سمجھتے ہوئے اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کے لیے ان کا اعتماد بحال کیا جائے۔ پدرسری سوچ کی جگہ تانیثی فکر کی

راہیں ہموار کی جائیں تا کہ مرد اور عورت دونوں معاشرے میں مثبت کردار ادا کر سکیں اگر یہ دونوں ایک دوسرے کو برابر نہیں سمجھتے تو یہ جھگڑا یوں ہی جاری رہے گا۔ دور جدید کو اخلاقی اور جنسی لحاظ سے مردانہ عصمت فروشی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ دولت کا بڑا مصرف صرف جنس کی بے جا آزادی اور عورت کی عصمت ازرانی کو صفر کی حد تک لے آیا ہے۔ نیویارک کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے اس نے پندرہ سالوں میں نو سو ایسی لڑکیوں کو دیکھا ہے جن کی انتہائی کم سنی میں عصمت دری کی گئی یہاں تک کہ ان میں سے بعض نو ماہ کی تھیں غرباء کی حالت اس سے زیادہ خراب ہے بعض لوگوں نے اصلاح کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ ان تمام حالات کی ذمہ دار ابتدائی گھریلو تعلیم ہے۔ جس نے عورت کے درجے کو پست کر کے غلام کی حیثیت سے مرد کے سامنے پیش کیا دوسرا یہ اصول کہ ایک وقت میں ایک ہی شادی کرنی چاہیے پہلی عورت کے ہوتے ہوئے دوسری کے بارے میں سوچنا اور لانا ایک شخصی بد اخلاقی ہے جس میں فرد کے جذبات کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ عورت کی ذہنی اور علمی ترقی نے اس کے اخلاق کو بھی کافی حد تک بدل دیا ہے ماضی میں اس کا درجہ بہت پست تھا نہ اس کو سیاسی حقوق حاصل تھے نہ وہ تجارت کر سکتی تھی نہ قانون کی نگاہ میں مرد کے برابر تھی۔ اب حالات بدل چکے ہیں اب وہ مرد کے شانہ بشانہ علوم وفنون حاصل کرتی ہے۔ ہر قسم کا پیشہ اپنا سکتی ہے اور ہر طرح کی تجارت میں اپنی کامیابی کے پنجے گاڑھ سکتی ہے اس کو ملازمت میں مساوی حقوق حاصل ہیں۔ الغرض وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو ایک مرد کرتا ہے اگر اس کا اخلاقی معیار بدل جائے تو حیرت نہیں کرنی چاہیے۔ عورت کے خلاف تشدد سماجی ساخت کی دین ہے اور سماج کی مادی بنیادوں کو تبدیل کیے بغیر گلو خاصی ممکن نہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

ا۔ نسوانی شعور کا تعلق عورت کے حیاتیاتی وجود جنس یعنی (sex) سے ہے جنسی لحاظ سے اللہ نے مرد اور عورت کو فطری اصولوں پر تخلیق کیا ہے۔ اس کی بنیاد پر کسی کو طاقتور، کمتر یا کمزور نہیں کہہ سکتے۔

نسائی شعور کا تعلق عورت کے خالصتاً جذبات، احساسات اور تجربات سے ہے بد قسمتی سے نسائیت کو صنف کے ساتھ جوڑ دیا۔ صنف کا کردار معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس کی شروعات خاندان سے ہوتی ہے۔ بچپن ہی سے لڑکیوں پر بے جا پابندیاں لگا دی جاتی ہیں تانیثی شعور عورت کو ان پابندیوں سے نبرد آزما ہونے کا ہنر سکھاتا ہے۔

۲۔ خواتین آپ بیتی نگاروں نے بڑی تگ ودو کے بعد اپنی شناخت بنائی اور سماجی پابندیوں کے خلاف مزاحمت کی، عائلی حیثیت کے تحت جدید اور قدیم روایات سامنے آتی ہیں جدید عائلی حیثیت میں عورت بحیثیت دوست

، ماں، بہن، بیوی، بیٹی کے طور پر خود کو متعارف کرواتی ہے۔ جس میں پسند کی شادی کو ترجیح دی جاتی ہے، سماجی طور پر عورتوں کا خود مختار ہونا ضروری ہے تاکہ وہ بااعتماد زندگی گزار سکیں۔

3۔ ان آپ بیتیوں میں ہندوستان کی تقریباًپوری نسائی تاریخ پنہاں ہے جس میں مری وول سٹون کی طرح سلطان جہاں بیگم نے تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ قرۃ العین حیدر، ورجینیا وولف، عصمت چغتائی، کشور ناہید اور ساجدہ زیدی سیمون دی بووا اور کیٹ ملٹ کے نظریات سے کافی حد تک متاثر تھیں۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ، انیس ہارون، زہرا داؤدی، عطیہ داؤد نے عملی طور پر تانیثی تحریک کو اپنایا۔ اصلاح نسواں کی جس تحریک کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی نے کیا تھا اس کو ان کی نواسی صالحہ عابد حسین اور خاندان کی دوسری ادباء ساجدہ زیدی، صغرا مہدی، سیدہ بانو احمد نے آگے بڑھایا۔ مشرقی اور علاقائی تحریک کے تحت شہر بانو اور نفیس بانو شمع کی آپ بیتیاں عورت پر ڈھائے جانے والے استحصالی رویوں کی غماز ہیں۔ ادا جعفری نے اپنی آپ بیتی میں چادر اور چار دیواری کی پابندیوں کو تو زہرا داؤدی نے جہیز جیسی لعنت کی مخالفت کی ہے۔ نثار عزیز بٹ نے خیبر پختون خوا کے علاقے کی سماجی پابندیوں کو بیان کیا تو عطیہ داؤد نے سندھی رسم و رواج کے خلاف بغاوت کی۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے عورت کے حقِ وراثت کے لیے آواز اُٹھائی تو دوسری طرف حمیدہ سالم نے عورت کی شادی کو اس کی زندگی کی انقلابی تبدیلی قرار دیا ہے تو حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے خود کو ایک باوفا بیوی کے طور پر متعارف کروایا۔

ہمارے ہاں تانیثیت کی عملی طور پر دوسری لہر چل رہی ہے جس کا تعلق عورتوں کے بنیادی حقوق سے ہے، عورت کے حقوق کا تعلق خاندان سے ہے اور عورت کی آزادی کا تصور خاندان کے بغیر ادھورا ہے۔ ان کے بنیادی حقوق کے لیے عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی ساتھ چلنا ہوگا، تبھی معاشرہ ترقی کرے گا۔

ج۔ سفارشات:

ا آپ بیتیوں پر زیادہ تر تحقیق تجزیاتی مطالعہ پر کی گئی ہے اس کے بہت سے پہلوؤں پر کام ہونا ابھی باقی ہے:

1۔ مرد آپ بیتی نگاروں کے ہاں عورت کے تصور کو انٹی فیمنزم کی صورت میں تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ سفر نامہ بھی آپ بیتی کی ایک صورت ہے جس میں مارکسی تانیثیت کے رجحانات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

۳۔ آپ بیتیوں میں سماجی اور سیاسی پہلوؤں کو تلاش کرنے کے امکانات موجود ہیں۔

کتابیات

بنیادی ماخذات:

ادا جعفری، جو رہی سو بے خبر رہی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۳ء

افضل توصیف، دیکھی تیری دنیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۹ء

انیس ہارون، کب مہکے گی فصل گل، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۶ء

بیگم شائستہ اکرام اللہ، پردے سے پارلیمنٹ تک، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۲ء

حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہمسفر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۲ء

حمیدہ سالم، شورش دوراں، ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

زہرا داؤدی، گرداب کی شناوری، جاوداں پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۶ء

زہرا داؤدی، منزل گریزاں، البنور پریس جناح روڈ، کراچی، ۲۰۰۱ء

ساجدہ زیدی، نوائے زندگی، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۲ء

ش۔ فرخ، جینے کا جرم، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء

شہر بانو، بیتی کہانی، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۶ء

صالحہ عابد حسین، سلسلہ روز شب، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

صغرا مہدی، حکایت ہستی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

عذرا عباس، میرا بچپن، سٹی پریس بک، کراچی، ۲۰۰۹ء

عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیراہن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء

عطیہ داؤد، آئینے کے سامنے، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۹ء

قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء

کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء

کشور ناہید، بری عورت کی دوسری کتھا، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۱ء

نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ لے کر، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۰ء

نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، آبشار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

نفیس بانو شمع، وقت مجھے لکھ رہا ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۲۱ء

ثانوی ماخذات:

ابوالکلام آزاد، مسلمان عورت، فردوس پبلیکیشنز، دہلی، ۱۹۸۵ء
ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد کی نگاہ میں عورتوں کا مقام، انڈین کونسل فار کلچرل ریلشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
ارجمند آرا، تانیثی، مطالعات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء
ارسطو، مثالی ریاست، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۵ء
ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، سٹی پریس بک، کراچی، ۲۰۱۲ء
ایم سلطانہ بخش، پاکستانی ادب میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء
اسرار الحق مجاز، کلیات مجاز، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۲ء
اشرف علی تھانوی، بہشتی زیور، توصیف پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن
اشرف علی تھانوی مترجم، القران، تاج کمپنی لمیٹڈ پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء
مترجم، اعجاز باقر، نظریہ ادب کے رہنما اصول، رامن سیلڈن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
آمنہ تحسین، ڈاکٹر، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء
آمنہ تحسین، ڈاکٹر، حیدر آباد کا نسائی منظر نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
آمنہ تحسین، ڈاکٹر، سماج اور صنفی تصورات (ادب کے آئینے میں)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء
پرویز پروازی، پس نوشت، نیا زمانہ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء
جون ہانام، عورتوں کی تحریک، متراجم خالد یاسر / سعدیہ جواد، الفیصل، لاہور، ۲۰۲۱ء
خورشید انور، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور، انجمن ترقی ہند، دہلی، ۱۹۹۳ء
خالد سہیل، انفرادی اور معاشرتی نفسیات، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء
راجہ انور، مارکسی اخلاقیات، آغا کلاسک پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء
خالد سہیل، مغربی عورت ادب اور زندگی، ریپن پریس، لاہور، ۱۹۸۸ء
روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت، مشعل، لاہور، س ن۔
روبینہ سہگل، قومیت تعلیم اور شناخت، کتاب محل، لاہور، ۲۰۰۵ء
روبینہ سہگل، قوم پرستی، عسکریت اور صنفی تقسیم، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء
روش ندیم، ڈاکٹر، منٹو کی عورتیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
زبیر رانا، قتل کیوں ہوتے ہیں؟، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء
زبیر رانا، پاکستان تہذیب کا بحران، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء
زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور،

مترجم: زاہدہ حنا، شہزاد مغرب میں از فاطمہ مرنیسی، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۱۱ء
سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۹ء
سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۹ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، بنیاد پرستی، سنگِ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء
سمیرا اکبر، ڈاکٹر، اردو ادب کے تانیثی امتیازات، رفیق کتب، فیصل آباد، ۲۰۲۲ء
سعید ابراہیم، سماج اور سیکس، سانجھ، لاہور، ۲۰۲۰ء
شاد عظیم آبادی، کلیات شاد، مرتب کلیم الدین احمد، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۷۵ء
شاداب سعید، ڈاکٹر، اردو میں خواتین کی خود نوشتیں اور سماجی سروکار، بمبی، ۲۰۰۸ء
شاہد ارشد، اخلاقیات کے پانچ نظریات، ادکامی آف لیٹر، لاہور، س، ن
محمد شہزاد شمس، ڈاکٹر، عورت اور سماج، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۲۰۰۶ء
علی عباس جلال پوری، جنسیاتی مطالعے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۳ء
علی عباس جلال پوری، روایات تمدن قدیم، خرد افروز، جہلم، ۱۹۹۱ء
علی عباس جلال پوری، عام فکری مغالطے، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۹ء
عقیلہ جاوید، ڈاکٹر حماد رسول (مرتبین)، آدھی عورت پورا ادب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء
طاہرہ ایس خان، عزت کے نام پر، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۹ء
فاطمہ حسن، فیمنزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵ء
فاطمہ حسن، ڈاکٹر شاہ محمد مری، بلوچستان کا ادب، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء
فریڈرک اینگلز، خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۳ء
قاسم یعقوب، لفظ اور تنقید معنی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء
فہمیدہ ریاض، ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء
فوزیہ خانم، ڈاکٹر، آپ بیتیاں ٹیڑھی پسلیوں کی، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ء
قاضی عابد، ڈاکٹر، مرتبہ، اردو ادب اور تانیثیت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
کشور ناہید، عورت خواب اور خاک کے درمیان، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
کشور ناہید، عورت زبان خلق سے زبان حال تک، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء
کشور ناہید، عورت اور مرد کا رشتہ، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء
لیلیٰ احمد، عورت جنسی تفریق اور اسلام، مشعل پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء

مبارک علی،ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۰۵ء
مبارک علی،ڈاکٹر، تاریخ اور تحقیق، فکشن ہاؤس،لاہور،۱۹۹۳ء
مبارک علی،ڈاکٹر، تاریخ میں عورت کا مقام، فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۷ء
مالک رام،اسلام اور عورت، تخلیقات،لاہور،۱۹۹۹ء
مالک رام، حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، اپنا ادارہ،لاہور،۲۰۰۰ء
مرزا خلیل بیگ، ادبی تنقید کی لسانی مضمرات، ایجوکیشنل بک، دہلی،۲۰۱۳ء
وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، جمہوری پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶ء
وہاب اشرفی، عالمی تحریک نسائیت مضمرات و ممکنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۱۲ء
وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، تاب محل آلہ آباد، دہلی،۲۰۰۳ء
وحید عشرت، فلسفہ عمرانیات، سنگ میل پبلشرز،لاہور،۲۰۰۷ء
ناصر عباس نیر مرتبہ، مابعد جدیدیت نظری مباحث (اول)، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،لاہور،۲۰۰۶ء
نیاز فتح پوری، ترجیحات جنسی، شہوانیات، آواز اشاعت گھر،لاہور، س،ن،
نورالصباح بیگم، تحریک پاکستان اور خواتین، شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور، س،ن
نیلم نسیم، تانیثیت ایک تعارف، عکس پبلشرز،لاہور،۲۰۱۹ء
یاسر جواد مترجم، عورت، سائمن دی بووا، فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۸ء
یاسر جواد مترجم، پردے کے پیچھے، جبر الدین بروکس، ریختہ او۔ آر۔جی، ای بکس،۲۰۲۳ء

اردو لغات:

ابو اعجاز صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۱۹۸۵ء
سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، مشتاق بک کارنر،لاہور،۲۰۱۵ء
شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۱۹۹۵ء
عنبرین صلاح الدین،ڈاکٹر، فرہنگ صنفی مطالعات، اردو سائنس بورڈ،لاہور،۲۰۱۸ء
مولوی نورالحسن نیر، نورالغات، جلد دوم، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد،۲۰۰۶ء
مولوی فیروزالدین، فیروزالغات، فیروز سنز،لاہور، س،ن

رسائل و جرائد:

اعجاز عبید، سمت شمارہ نمبر ۸، اپریل تا جون ۲۰۰۸ء، نسائی ادب نمبر گوگل سرچ

ابن کنول، پروفیسر، اردو ریسرچ جرنل شمارہ نمبر ۱۸ اگست ۲۰۱۶ء

حسن ضیاء، آج اور کل جلد ۷۸، شمارہ نمبر ۸۰، پبلیکیشن ڈویژن، دہلی، ۲۰۲۰ء

حقانی القاسمی، انداز بیاں ا، کتابی سلسلہ، مئی ۲۰۱۶ء۔ جولائی ۲۰۱۶ء

کشور ناہید، ماہ نو (چالیس سالہ مخزن)، جلد اول، ادارہ مطبوعات پاکستان، لاہور، ۱۹۸۷ء

رشید امجد، ڈاکٹر، معیار شمارہ نمبر ۱۶۔۱۷، جلد ا، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

محمد حسن عصری، عصری ادب (خواتین خصوصی نمبر) شمارہ نمبر ۴۱ اپریل تا اگست، ادارہ تصنیف ڈی ماڈل ٹاؤن، دہلی، ۱۹۸۰ء

محمد طفیل، نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء

محمد طفیل، نقوش شخصیات نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء

مسعود حسن شہاب، الزبیر آپ بیتی نمبر، اردو اکادمی، بہاول پور، ۱۹۶۴ء

نگہت سلیم، ادبیات انتخاب خواتین کا عالمی ادب، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

یوسف خشک، ڈاکٹر، الماس، تحقیقی جرنل جلد ۸، ۱۰ اگست ۲۰۱۶ء، الخیر یونی ورسٹی، خیر پور

حقانی القاسمی، انداز بیاں ا، کتابی سلسلہ، مئی ۲۰۱۶ء۔ جولائی ۲۰۱۶ء

انگریزی لغات:

Oxford English dictionary
Long Man dictionary
www.iup.edu
www.britannica.com>topic
www.wekipidea
Eline Showalter, Towards Feminist Politic
Belse and Jane Moore, Gender and the politics of literary Criticism.
Toril Moi. Feminist, Female, Feminine .published by Palgrave Macmillan 1997.
J.Allan .Pakistan Movement Documents Convener
Leela Mullati, The Bhakti Movement and status of women, Abhinr publication 1989.